روٹھی کھاتی مُورتیاں

کالموں کا مجموعہ

روبینہ فیصل

روٹی کھاتی مورتیاں

کالموں کا مجموعہ

روبینہ فیصل

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : روٹی کھاتی مورتیاں

رائٹر : روبینہ فیصل

اہتمام : عمران رشید یاور

اشاعت : جون ۲۰۱۰

کمپیوٹر کمپوزنگ :

پرنٹرز :

قیمت (پاکستان میں) : 400 روپے

(یورپ) : 15 یورو ۔ 12 پونڈ

(کینیڈا) : 20 امریکی، کینیڈین ڈالر

انتساب

ان بچوں کے نام

جو کبھی کھلونوں سے نہیں کھیلتے

مگر

جو خود نہ جانے کتنے ہی

لوگوں کا کھلونا بنتے ہیں

فہرست

(1)	روبینہ فیصل کا قول فیصل	(صفدر ہمدانی)	(09)
(2)	روبینہ کا قلم کسی مصلحت کا شکار نہیں	(ڈاکٹر نگہت نسیم)	(13)
(3)	دلیر لڑکی	(ڈاکٹر عصمت حیات علوی)	(15)
(4)	ہماری روبینہ!!!!	(آصف شہزاد)	(18)
(5)	روبینہ فیصل ایک دل اور دماغ	(ڈاکٹر مقصود جعفری)	(22)
(6)	چند باتیں!	(روبینہ فیصل)	(25)
(7)	بابا لطیف پھر مر گیا		(31)
(8)	مری زمین کیلئے تھا مثال ابر کرم		(35)
(9)	یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں		(39)
(10)	چندہ مسجد اور دہشت گردی		(43)
(11)	اسی لئے تو انصاف کا حکم ہے!!!		(46)

(12) کیا مردہ بچی کا نوحہ زندہ سے فرق ہے (51)

(13) بین بین (57)

(14) موت سے زیادہ صدمے کی خبر (61)

(15) بڑے سے بڑا مہرا (63)

(16) میرا ہادی، میرا عبداللہ اور لبنانی بچے (66)

(17) جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے (71)

(18) سب کا ایک سا سورج کیوں نہیں؟ (76)

(19) طائف کے وقفے میں کالم بھی ہوگا (79)

(20) ایک سی شکلیں ایک سی آواز (82)

(21) کون انصاف کرے، حشر بپا کیسے ہو (85)

(22) وہی آسمان وہی پرندے (89)

(23) Every thing is under control (93)

(24) سوہنی دھرتی اللہ رکھے (97)

(25) اپنے حصے کا کام (100)

(26) یہاں بھونکتا کوئی اور ہے یہاں کاٹتا کوئی اور ہے (104)

(27) خود سے شرمندہ اور دوسروں پہ ناز (109)

(28) بارش روٹھ بھی جائے (113)

(29) محبت آزادی مانگتی ہے (116)

(30) سوشلزم کی الف لیلوی داستان (120)

(31) سلے ہوئے ہونٹ اور فکر پرسش (124)

(32) غربت، عادت، امارات (128)

(33) یہ ہمارے اندر کی لو ہے (132)

(34) یہ تو نہ ختم ہونے والا نوحہ ہے (136)

(35)	میں وہ بھائی بننا چاہتا ہوں	(139)
(36)	شاعروں کی آپس میں لڑائی	(142)
(37)	صحافت میں لیڈر	(146)
(38)	روٹی کھاتی مورتیاں	(150)
(39)	بلوچستان کی آزادی کس سے؟ پنجاب سے	(154)
(40)	امریکی ادارہ، بلیک واٹر	(160)
(41)	کینیڈا میں مختاراں مائی کی ضرورت	(165)
(42)	پاکستان نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے	(170)
(43)	کوئی آپ کے خلوص سے کیوں کھیلے	(175)
(44)	یہ نہ کرنا بچوں ۔۔ وہ بھی نہ کرنا ۔۔ ورنہ	(180)
(45)	کیا محبت کو لو کہا جاسکتا ہے، کیا محبت رسم ہے؟	(185)
(46)	ایک رسم جنازہ اور ایک وصیت	(190)
(47)	غدار تو نوازے جاتے ہیں	(194)
(48)	ہمارے محمود و ایاز کینیڈا میں رہتے ہیں	(199)
(49)	نہیں نہیں میں طالبان نہیں ہوں	(203)
(50)	ہمارے MADOFF تو جنت میں رہتے ہیں	(209)
(51)	حنوط کی ہوئی ایک فاختہ	(214)
(52)	بھوت	(219)
(53)	ماتھے کی گھوری	(225)
(54)	میں اور میری امی	(228)
(55)	اپریل 2009ء کی نسلی امتیاز کی کانفرنس	(232)
(56)	کیا لکھا جائے اور کیسے لکھا جائے	(237)
(57)	میرا اسلام ہی میرا جرم ٹھہرا؟	(241)

(58) بصیرتوں پہ جالوں کا خوف طاری ہے (247)

(59) وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی (253)

(60) آپ کو آزادی مبارک مگر ہم؟ (257)

(61) ہٹلر 2007 (261)

(62) جگہ جگہ موت بکھری ہوئی ہے (266)

(63) پاکستانی عوام کا اپنے سیاست دانوں کو خراج تحسین (270)

(64) عیدیوں بھی منائی جاتی ہے (274)

(65) ایک تھی شبانہ (278)

(66) عمران خان کو ملک بدر کیا جائے (282)

روبینہ فیصل کا قول فیصل

روبینہ فیصل کے بارے میں اور انکے کالموں کے اس مجموعے کے بارے کہ جو انکی تخلیقات کا پہلا مجموعہ ہے لکھنے کے لیئے روبینہ نے شاید کچھ عرصہ پہلے مجھے ای میل کی تھی لیکن شاید میں اپنے بیرونی ممالک کے اسفار کے دوران دیکھ نہیں سکا یا پھر ای میل خود بھی کسی وقت ''سپیم'' میں چلی جاتی ہے۔خیر چندروز پہلے روبینہ نے بڑے مہذب انداز میں شکوہ نما استفسار کیا کہ آپ نے میری کالموں کی کتاب پر شاید اس لیئے لکھنا قبول نہیں کیا کہ میں شاید وہ اچھی بچی نہیں جو آپ سے رابطہ بھی بہت زیادہ نہیں رکھتی اور عالمی اخبار میں بھی بہت کم وقت دیتی ہوں۔ ویسے یہ بہت کم کا لفظ بھی کسرنفسی ہے سچ تو یہ ہے روبینہ اس اخبار کو کہ جو انکا بھی اپنا اخبار ہے اور جسکی یہ ٹورنٹو کی بیورو چیف ہیں قطعی کوئی وقت نہیں دے پاتیں اور میں چونکہ انکی مصروفیات سے بخوبی آگاہ ہوں اس لیئے کبھی کوئی شکوہ بھی نہیں کرتا۔

مجھے تو بس یہی خوشی ہے کہ روبینہ کا نام عالمی اخبار میں شامل ہے اور انکا کالم بھی باقاعدگی سے اس اخبار میں شائع بھی ہوتا رہتا ہے اور انکے یہاں شائع ہونے والے پچاس فیصد سے زائد کالم پڑھتا بھی ہوں حالانکہ اس دور میں مطالعہ یا پڑھنا ایک بہت بڑی خامی سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اپنے کسی کالم میں لکھا تھا کہ یہ ایسا تکلیف دہ اور بے بصر دور ہے کہ اس دور میں جو

بات شرم سے کہنی چاہیے وہ فخر سے کہی جاتی ہے۔ جیسے آپ کسی سے یہ پوچھیں کہ مطالعہ کرتے ہو یا کوئی نئی کتاب پڑھی تو وہ فخر سے کہتا ہے کہ نہیں میں بھلا مطالعہ کیوں کروں اور کتاب پڑھنے کا وقت کس کے پاس ہے۔

روبینہ فیصل سے جتنا میں آگاہ ہوں اور جتنا میں نے انہیں پڑھا ہے اس تناظر میں بلا خوف وخطر کہہ سکتا ہوں کہ روبینہ مطالعہ بھی کرتی ہیں اور کتب بینی کا بھی شوق انہیں ہے اور اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود علمی اور ادبی کام بھی کرتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ مصروفیت کا بہانہ کرتے ہیں وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں کیونکہ مسئلہ فقط ترجیحات کا ہے۔ اگر آپ ترجیح کے ساتھ تین گھنٹے سینما میں فلم دیکھ سکتے ہیں، چینی ریستوران میں دو ڈھائی گھنٹے کھانا کھا سکتے ہیں، پورا دن ٹی وی پر ایک روزہ کرکٹ میچ دیکھ سکتے ہیں تو اگر ادبی وعلمی کام آپ کی ترجیح میں شامل ہے تو پھر مصروفیت کے باوجود کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام دراصل ''کمٹمنٹ'' ہے اور کسی بھی کمٹمنٹ کی راہ میں کسی قسم کی کوئی مصروفیت حائل نہیں ہو سکتی۔

روبینہ ایک وقت میں بہت سے کام کرتی ہیں اور انہیں دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے وہ لکھنے کا وقت بھی نکالتی ہیں اور مطالعے کا بھی۔ جو مطالعہ روبینہ فیصل کرتی ہیں اس مطالعے کے لیئے کتابی مطالعے سے زیادہ وقت اور زیادہ انہماک درکار ہے۔ وہ انسانوں کا، حالات کا، واقعات کا، ماحول کا، وجوہات کا، نتائج کا گویا ہمہ جہت مطالعہ کرتی ہیں اور پھر اس مطالعاتی تجربے کو اپنے کالموں کا موضوع بناتی ہیں اور یہی ایک وصف انہیں درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کالم نگاروں سے منفرد اور ممیز کرتا ہے۔

روبینہ فیصل کے کالموں کے اس اولیں مجموعے میں شامل کالم انکی اپنی ویب سائٹ اور عالمی اخبار میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کالموں میں ستر فیصد سے زائد کالم روایتی کالم نگاری کی تعریف پر پورے نہیں اترتے اس لیئے سدا بہار ہیں اور کسی وقت اور کسی جگہ بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ میں اگر اپنی پیدائشی سچ بولنے کی بیماری کو مدنظر رکھتے ہوں عرض کروں تو آپ کو اچنبھا نہیں

ہونا چاہیئے کہ اول تو مجھ طالب علم کو کوئی اپنی کسی تخلیق یا مجموعے پر لکھنے کو کہتا ہی نہیں اور جو اگر کسی بھی وجہ سے کہہ لے تو پھر اس لکھے کو شائع کرنے کے بارے میں سوچ میں پڑ جاتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ میں تبصرے معاملے میں اس فارمولے کا قطعی طور پر قائل نہیں کہ شاعر یا ادیب کی کتاب میں سے دس بارہ اقتباسات لکھکر کاغذ کا پیٹ بھر دیا جائے اور دوستی خراب ہونے کے خوف سے فقط تعریفی جملے لکھکر ''شاد باد منزل مراد'' کے سفر کو طے لیا جائے۔ بس یہی ایک فارمولا ہے جسکی کسوٹی ہے اس عقل سلیم کے ناطے درست کو درست اور غلط کو غلط لکھتا رہا ہوں، لکھتا ہوں اور لکھتا رہوں گا۔

اس بار بھی میں روبینہ کے کالموں سے اقتباسات لکھکر چوبیس صفحے کا کوئی مقالہ نہیں لکھنا چاہتا بلکہ یہ کام قاری کا ہے کہ وہ کم از کم اتنا تو کرے کہ قلم کار نے اپنی نظروں کی بینائی اور جسم کا خون جلا کر جو لکھا ہے اسے پڑھ تو لے اور جو آئینہ دکھایا ہے انمیں اپنی صورت بھی دیکھ لے۔ ورنہ تو کمرشل اور عادی مجرموں کی طرح عادی فلیپ نگاروں اور تبصرہ نگاروں نے تو اقتباسات کے سہارے تبصرے لکھکر ''ٹیک اوے'' کی صورت پیدا کر دی ہے کہ قاری انہیں پر اکتفا کر لیتا ہے اور خود کتاب کو پڑھنے کی زحمت بھی نہیں کرتا۔

سچی بات یہی ہے کہ اس دور میں جبکہ ہر کس و ناکس کالم لکھ رہا ہے اور کالم نگاروں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے اور ایسے ایسے کالم نگار موجود ہیں جو کالم کو بھی تالم لکھتے ہیں اور جنکی تحریروں میں محلے میں پیدا ہونے والے بکری کے بچوں، کتوں اور مرغوں کی لڑائیوں اور شادیوں کی تقریبات کا حال احوال شامل ہوتا ہے اور جنہیں رپورٹ اور کالم کے درمیان فرق محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور جن کے کالم جمعہ کو شائع ہوں تو ہفتے کے روز ردی والے کے رزق کا وسیلہ بن جاتے ہیں، ایسے کالم نگاروں کے ہوتے ہوئے سوچتا ہوں کہ اس دنیائے ادب میں کیا ایسی کمی رہ جاتی جو روبینہ فیصل کالم نہ لکھتی۔

اپنے اس سوال کا جواب میں پھر میں خود ہی دیتا ہوں کہ اگر روبینہ کالم نہ لکھتی اور پھر انہیں شائع نہیں کرتی تو کتنے ہی اہل علم اور اہل نظر اور کالم اور تالم کے درمیان اور رپورٹنگ اور کالم

کے درمیان اور زبردستی کے اور برجستہ کالم کے درمیان اور مطالعاتی اور غیر مطالعاتی کالم کے درمیان فرق ہی محسوس نہ ہوتا۔

روبینہ فیصل کے کالم تحریری تاریخ کا بھی حصہ ہیں۔وہ ایسے بہت سے موضوعات پر کالم لکھتی ہیں جن موضوعات کی جانب جگادری کالم نگاروں کا دھیان ہی نہیں جاتا یا پھر انکی نظر میں یہ موضوعات کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔کالموں کے اس مجموعے میں تریسٹھ کالم شامل ہیں اور ان تریسٹھ کالموں میں سے اسی فیصد کے عنوانات ہی مروجہ کالموں سے مختلف ہیں۔

پہلا کالم ہے"بابا لطیف مر گیا" دسواں کالم ہے"میرا ہادی،میرا عبداللہ اور لبنانی بچے" بیسواں کالم ہے"یہاں بھونکتا کوئی اور ہے یہاں کاٹتا کوئی اور ہے"چوبیسواں کالم ہے" کینیڈا میں مختاراں مائی کی ضرورت" اکتالیسواں کالم ہے"ہمارے محمود وایاز کینیڈا میں رہتے ہیں" اور آخری کالم ہے"ایک رسم جنازہ اور ایک وصیت"۔

ان تمام کالموں کے موضوعات ہی سنجیدہ قاری کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے متن بھی پڑھیں اور پڑھکر سوچیں کہ آج کے اس مفاد پرست اور انسان کش دور میں ہمارے درمیان روبینہ فیصل جیسے قلم کار موجود ہیں جو کسی لالچ اور طمع کے بغیر وہ لکھتے ہیں جو دیکھتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں۔ جنکا قلم نہ بکا ہے اور نہ بکے گا اور جنہیں اس صفدر بے نام کی طرح قربت دربار سے نفرت رہی ہے۔ میں روبینہ فیصل کو انکے کالموں کے اس پہلے مجموعے بلکہ کسی بھی صنف کے پہلے مجموعے کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ خالق لوح وقلم انکے قلم کو ایسی طرح توانا رکھے۔آمین

دعا گو

صفدر ہمدانی

(لندن،انگلینڈ)

روبینہ کا قلم کسی مصلحت کا شکار نہیں

روبینہ فیصل ہمارے ساتھ عالمی اخبار میں بھی ہماری ہم سفر ہیں اور ایسی ہم سفر جو نہایت خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہی ہیں اور ساتھ والے کو یہ احساس بھی نہیں ہونے دیتیں کہ وہ بھی موجود ہیں۔لیکن سچ یہ ہے کہ روبینہ کی موجودگی ہم سب کو خود محسوس ہوتی ہے اور ہمیں یہ احساس انکے ان تمام کالموں کو پڑھ کر ہوتا ہے کہ جو باقاعدگی سے ان کی اپنی ویب سائٹ کے علاوہ عالمی اخبار پر بھی شائع ہوتے ہیں اور جن میں سے اکثر شائع ہونے کے بعد میں اور (بابا) صفدر ھمدانی خوب نقد و نظر کرتے ہیں اور اکثر اختتام اس بات پر ہوتا ہے کہ روبینہ فیصل اس دور کے کالم نگاروں میں ایک قد آور نام ہے اور اس دراز قد ہونے کی وجہ انکے کالموں کا کسی مفاد یا مصلحت سے عاری ہونا ہے۔

روبینہ پچانوے فیصد کالم نگاروں کی طرح روزنامچہ نہیں لکھتی بلکہ کھلی آنکھوں سے جو دیکھتی اور بیدار ذہن کے ساتھ محسوس کرتی ہیں اسے قلمبند کر دیتی ہیں اور ایک لمحے کو ایسے لگتا ہے جیسے وہ رواں تاریخ کو کالم کی شکل میں قلم بند کر رہی ہیں۔انکا ایک کالم پاکستان کھپے۔۔۔یا۔۔۔کھپ جائے؟ کے عنوان سے ہے(شائد وہ اس کتاب میں شامل نہ ہو مگر ان کی ویب سائٹ پر پڑھا جا سکتا ہے)اس کالم کی ابتدا ہی سارے شاخسانے کو وا کر دیتی ہے اور شاید جب عشروں بعد قاری اس کالم کو اس کتاب میں پڑھے گا تو اسے وطن عزیز کی سیاسی تاریخ کے اس باب سے الگ انداز سے آگاہی ہوگی۔۔۔اس کالم کی ابتدا اس طرح ہے۔

''ڈاکٹر آصف زرداری کی ایک لیب ہے رپورٹ تیار کرنے کی، مجھے ایسا لگتا ہے۔وہ

بہت کامیاب ڈاکٹر ہے۔اس نے محترمہ بےنظیر کے بعد جتنے بھی تجربات کے سب بہت کامیاب ہیں اورسب سے کامیاب تجربہ ہےاپنے جیسی زبان بولنے والے روبورٹ تیار کرنا۔ آپ شیری رحمٰن کوسن لیں، بابر اعوان کو لے لیں، جہانگیر بدر انگریزی والوں کو لے لیں، اورایک جیسی زبان بولنے والی محترماؤں کو بولتا سن لیں، سب کو چھوڑیں اپنے وزیر اعظم کو دیکھ لیں، سب کو لگتا ہے زرداری صاحب نے اپنی لیب میں ایک رنگ والے ڈرم میں ڈالا، اچھی طرح جمو۔۔را (نمک کو جامن میں ملانا) کیا۔۔اور جب سب ایک رنگ میں رنگ گئے، جب سب کی زبان کا، دل کا، دماغ کا ایک ہی رنگ ہوگیا تو انہیں ٹی وی ٹاک شو میں چھوڑ دیا''۔

روبینہ فیصل کے اکثر کالموں میں قلم کی کاٹ اسی طرح کی ہے۔وہ قلم سے کیمرے کا کام بھی لیتی ہیں اورایک لمحے کومحسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کوئی فلم دکھارہی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر میرے پاس اتنا سرمایہ ہوتا تو میں روبینہ کے اس کالموں کو ڈرامائی شکل دے کرکوئی ٹی وی سیریل تیار کرتی۔ بہت کم لکھنے والوں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ انکے الفاظ تصویر بناتے ہیں۔

میں خود افسانہ نگار اور شاعرہ ہونے کے ناطے یہ بھی سوچتی ہوں کہ روبینہ کے نوے فیصد سے زائد کالم ایسے ہیں جنکو بہت آسانی سے ایک مکمل اور کامیاب افسانہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ انکے اکثر کالموں میں باقاعدہ افسانے کی کہانی اور ڈرامے کا پلاٹ موجود ہوتا ہے۔مجھے خوشی ہے کہ روبینہ فیصل کے کالموں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہےاوراب انتظار ہے کہ انکے افسانوں اور شاعری کا مجموعہ بھی سامنے آجائے۔اللہ پاک انکو اس قلمی جہاد میں ہمیشہ سرخرو رکھے اور کامیابی انکے قدموں سے قدم ملا کر چلے کہ انکی کامیابی ہم سب قلم کاروں کی کامیابی ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

ڈاکٹر نگہت نسیم

سڈنی۔آسٹریلیا

دلیر لڑکی

جب میں نے کئی اردو ویب سائٹس پر ایک لڑکی روبینہ فیصل کا نام پڑھا تھا۔ تب میں نے اس کا آرٹیکل یہ سوچ کر نہ پڑھا تھا کہ ہوگی یہ بھی خوابوں کی دنیا میں رہنے والی کوئی دوسری عام پاکستانی لڑکیوں جیسی لکھاری لڑکی جو کہ وہی پرانے اور گھسے پٹے قسم کے موضوعات پر اپنا قلم گھسٹی رہتی ہیں!!!

پھر ایک روز اتفاق سے میرے پاس وقت تھا اس لئے میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی روبینہ فیصل کے کسی آرٹیکل کو کلک کر دیا پھر جیسے جیسے میں مضمون پڑھتا گیا ویسے ویسے میرے پر یہ حقیقت وارد ہوتی چلی گئی کہ روبینہ فیصل تو ایک دلیر قسم کی لڑکی ہے۔ جس انداز میں اور جس بری طرح سے روبینہ فیصل نے کسی کالم نگار کے لتے لئے تھے۔ مجھے تو لطف ہی آ گیا تھا۔ اس روز کے بعد میں نے نہ صرف روبینہ کے آرٹیکل متواتر پڑھنے شروع کر دیے تھے بلکہ جو آرٹیکل مجھے بھاتا (اپیل کرتا) تھا اس آرٹیکل کو میں نے اپنے حلقے کے لوگوں کو فارورڈ کرنے کی عادت اپنائی تھی۔ ویسے تو میرے پرانے احباب میری اس عادت سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر میرے ذاتی دشمن نے بھی کوئی عقل مندی سمجھداری اور دور اندیشی کی بات کی ہو تو میں کسی تعصب کے بغیر اسے آگے پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ میں خود کہتا ہوتا ہوں کہ ایک جرمن کہاوت ہے کہ اگر عقل کی بات کسی دیوار پر بھی لکھی ہو تو اس کو پڑھ لو اور پلے سے باندھ لو شائد کبھی کام آ جائے۔ جب کہ چین کے قدیم باشندے یہ کہا کرتے تھے کہ یہ مت دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ سنو کہ کیا کہہ رہا ہے کیونکہ ایک عام شخص بھی عقل مندی کی بات کہہ سکتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ میک

پاکستان ہیرلڈ کی ویب پر میرے صفحے پر جماعت اسلامی کے موجودہ امیر سید منور حسن کا مضمون لگا ہوا ہے حالانکہ میں جماعت اسلامی کی سیاست سے ہمیشہ ہی بیزار رہا ہوں۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں لیا جانا چاہیے کہ میں روبینہ فیصل کی سیاست سے کوئی اختلاف رکھتا ہوں روبینہ بیچاری تو سیاست کر ہی نہیں سکتی ہے۔اس بیچاری کا ایک ہی چہرہ ہے جبکہ ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے میں تو سیاست دان کے دو چہرے ہونے چاہئیں جو کہ روبینہ فیصل کے پاس نہیں ہیں۔ جیسے روبینہ کا ایک چہرہ ہے ایسے ہی روبینہ کا ایک ہی دل ہے ان دلیر لوگوں میں ایک بہت بڑی خامی ہوا کرتی ہے۔ نہ تو ان کے چہرے دو ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے دل ہی دو ہوتے ہیں۔ ان دلیر لوگوں کا دل بھی ایک ہی ہوتا ہے جس میں سارے جہاں کا درد اور سارے جہاں کی محبت سمائی ہوتی ہے روبینہ فیصل کا دل بھی ایسا ہی بڑا سارا دل ہے جس میں سبھی جہاں والوں کی محبت اور سارے جہاں کا درد سمایا ہوا ہے۔

یہ دلیر لڑکی عجیب لڑکی ہے اس لڑکی نے کسی انسان سے نفرت کرنا سیکھا ہی نہیں ہے۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا تو روبینہ فیصل کا کوئی بھی کالم کوئی بھی مضمون کوئی بھی یادداشت کوئی بھی افسانہ کوئی بھی تحریر اور میں یہ گمان بھی کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے دل کی آنکھ سے دیکھا ہے کہ روبینہ فیصل کے ماہانہ اور سالانہ بجٹ کی چٹس اور چیک بکس میں بھی بکھرے ہوئے اور بچھڑے ہوئے انسانوں کے لئے محبت کا عملی ثبوت ہی ملے گا۔ درحقیقت یہ دلیر لڑکی دینا جانتی ہے مگر کچھ لینے کی تمنا نہیں رکھتی اور نہ ہی اس دلیر لڑکی کو کسی انسان یا مخلوق سے کچھ ملنے کی توقع ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب بھی میں اپنی قوم کی لڑکیوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ سوچ کر دل بہت ہی دکھتا ہے کہ لڑکیاں اور عورتیں ہمارے ملک کی نصف سے زائد آبادی ہیں مگر ان کا ادب اور صحافت میں حصہ نہ ہونے کے برابر ہے اور جو لڑکیاں لکھتی بھی ہیں تو اس کا قوم اور ملک کو فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ بیشتر لڑکیاں اور عورتیں ایک محدود سوچ اور محدود تجربہ رکھتی ہیں اور ان

کی تحریریں بھی ایک خاص دائرے میں ہی گھومتی رہتی ہیں مگر جب میں نے روبینہ فیصل کو پڑھنا شروع کیا تھا اور روبینہ کی جارحانہ طبیعت (اگریسیونیس-aggressivenes) سے متاثر ہوا تھا۔ تب میں نے اپنے دل میں یہی سوچا تھا کہ میں روبینہ فیصل کے دل سے کچھ ٹشو (Tissues) لوں اور ان کے ڈی این اے (DNA) کو الگ کر کے کئی ہزار کلون (Cloned-Rubina Faisal) روبینہ فیصل تخلیق کروں تا کہ ہمارے ملک اور معاشرے میں دلیر اور نڈر لڑکیوں اور عورتوں کی جو شدید کمی اور قلت ہے اس کمی کو پورا کیا جا سکے مگر میں اپنی اس خواہش کو اس لئے دبا گیا ہوں کہ یہ تو شارٹ کٹ (short cut) ہے اور شارٹ کٹ ہمیشہ ہی شاک کٹ (shock cut) ہوتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دلیر اور نڈر افراد ہی کسی قوم اور ملت کا سرمایہ ہوا کرتے ہیں۔ چاہے امن ہو یا چاہے جنگ ہو دلیر اور نڈر افراد ہی اپنی قوم اور ملت کو نہ صرف دشمنوں اور درندوں سے محفوظ و مامون رکھتے ہیں بلکہ آگے بڑھ کر حملہ آور دشمن پر ایسی کاری ضرب لگاتے ہیں کہ دشمن نیست و نابود ہو جایا کرتا ہے۔ اس وقت ہماری قوم اور ملت جس قسم کے برے حالات (کرائسس) سے گذر رہی ہے۔ ایسے حالات میں تو ہماری قوم کو روبینہ فیصل جیسی ان گنت دلیر اور نڈر لڑکیوں اور عورتوں کی اشد ضرورت ہے اس لئے میری دلی دعا یہی ہے کہ اللہ رحیم و کریم روبینہ فیصل کو ایسی ہی دلیرانہ اور بیباختہ قسم کی تحریریں لکھنے کی توفیق عطا کئے رکھیں اور یہ دعا بھی ہے کہ اللہ خالق و مالک میری قوم اور ملت کو کثرت سے روبینہ فیصل جیسی دلیر اور نڈر لڑکیاں عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین!!!

ڈاکٹر عصمت حیات علوی

ہانگ کانگ۔ چین

۰۴۔ مارچ۔ ۲۰۱۰ء

ہماری روبینہ!!!!

ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں کتاب اور قلم کی جگہ کمپیوٹر اور موبائل فون نے لے لی ہے۔ جہاں معیاری شاعری کی جگہ فحش گیتوں پر سر دھنے جاتے ہیں اور جہاں سنجیدہ پیغامات کی جگہ لطیفے زیادہ پر اثر ہو گئے ہیں۔ ایسے اندھیرے جنگل میں ایک کونے میں اپنی چھوٹی سی دنیا میں بیٹھی ہماری روبینہ کے ہاتھ میں قلم کا اور سنجیدگی کا ایک دیا ہے۔ وہ اسے جلائے بیٹھی ہیں کچھ اس طرح کے اس کی روشنی بڑے دھیرے دھیرے اپنا ہالہ بڑھا رہی ہے۔ اور ہم جیسے نوجوان اپنی ثقافت سے دور، اپنے ملک سے دور دبئی جیسے ملک میں بیٹھے، اس روشنی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اور روبینہ کے کالم ہمارے اندر یوں گھل مل گئے کہ یاد ہی نہیں رہا کے زمانے کے حساب سے روبینہ فیصل کو جانتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے، یوں لگتا ہے روبینہ کو ہم نہ جانے کب سے جانتے ہیں۔۔ اور وہ وہی لکھ رہی ہیں جو ہمارے دلوں میں ہے۔ ہم جو سوچ رہے تھے انہوں نے کہہ بھی دیا ۔۔ اور یوں ہمارا روبینہ سے رشتہ کئی جنموں تک پھیل گیا۔

میں نے روبینہ کو فطرت پسند اور حساس پایا۔ سادہ اور راست گو پایا۔ نہ ان کی تحریر میں بناوٹ ہے اور نہ ہی ان کی شخصیت میں۔ آج جب ہم نفسا نفسی کی اس دنیا میں ہر طرف لوگوں کو مکر اور فریب کے جال بنتے دیکھتے ہیں، مادیت پرستی کے بھنور میں گھرے دیکھتے ہیں، وہاں روبینہ اپنی سادہ دلی اور درویش طبیعت کے ساتھ ہماری آنکھوں کو عجب حیرانی بخشتی ہے۔ اور ان کے اندر کی اسی بے لوثی نے ان کی تحریروں کو وہ اثر دیا ہے جو لوگوں کی آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے۔ میں نے جب ان کا کالم ۔۔ میں اور میری امی پڑھا۔۔ تو کئی دن تک میرے اردگرد پاٹھوں

کی خوشبو پھیلی رہی۔ اور میں اس وقت میں پہنچ گیا جہاں میری ماں بیٹھی ہے، ہمیں قرآن پاک کا درس دیتی ہے اور اس کے بعد اپنی محبتوں میں گوندھے آٹے سے پراٹھے بنا بنا ہم سب بہن بھائیوں کا پیٹ بھرتی ہے۔ اور یقین جانئے اس کے بعد سے آج تک پیٹ تو بھرتے ہی آرہے ہیں مگر اس طرح کا پیٹ آج تک نہیں بھرا۔۔۔ وہ بھوک وہیں کھڑی ہے۔ (اللہ میری امی جان کو جوار رحمت میں جگہ عطا کرے)۔ روبینہ کے کالموں میں انسانیت ہے، انصاف کی پکار ہے، محبت کا درس ہے، ایک جیسے بنیادی حقوق کا مطالبہ ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو ہے۔ ایک شاعر ہونے کے ناطے میں حیران ہوتا ہوں کہ کوئی کالم نگار بھی محبت اور انسانیت کی بات ایسے کر سکتا ہے کہ بڑے بڑے شاعروں کو پیچھے چھوڑ دے۔ روبینہ کا کالم ۔۔ امید کب دم توڑتی ہے۔۔ ان سب خوابوں کو آنکھوں میں جگاتا ہے جو آج کے مشینی دور میں ہم سے چھن رہے ہیں۔ پیار کیا ہے؟ یہ کالم پڑھنے کے بعد سمجھ آتا ہے کہ پیار کیا ہے۔۔؟ میں ایک شاعر ہوں مگر فطرت سے محبت میں نے روبینہ کے کالموں سے سیکھی۔

روبینہ کے ذہن پر روزمرہ کے معلومات گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ اور وہ انہیں بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے کالموں میں اتار دیتی ہیں۔ ان کی نظر حالات حاضرہ پر بہت گہری ہے۔ پاکستان کی سیاست ہے یا کینیڈا میں پاکستانیوں کے مسائل، صدر صدام ہے یا ہوگوشیویز۔۔ احمد نژادی ہے یا امریکی صدارت، لبنان، فلسطین اور اسرائیل کی جنگیں ہیں یا کشمیر بلوچستان کے مسائل، اسلام کو درپیش مسائل ہیں یا کرکٹ میں سیاست، عید شبرات کے مسائل ہیں یا ہیلووین اور ویلنٹائنس ڈے کے جھمیلے، مدرز ڈے ہے یا بسنت، عورتوں کی آزادی ہے یا بچوں کے مسئلے بشرف کی آزادی ہو یا ضیا کی پابندی، طالبان ہیں یا امریکہ کی پالیسی، ڈاکٹر عافیہ کا مسئلہ ہے یا پاکستان میں سٹیج ڈرامے کے زوال کی کہانی ہے وہ اپنے گہرے مشاہدے اور علم کی وجہ سے ہر معاملے میں اپنا ایک واضح نقطۂ نظر رکھتی ہیں۔ اور ان کا رویہ بڑا معتدلانہ ہے۔ نہ ایک شدت اور نہ دوسری انتہا۔ وہ اسی رویے کو اپنانے کی تلقین کرتی ہیں۔ اور یہاں وہی میں جوان نسل میں ان

کے کالموں کو جوش وخروش سے پڑھنے کی وجہ بھی یہی ہے ۔وہ زندگی سے لطف اٹھانے کو منع نہیں کرتیں مگر لطف اور بازاری پن کا فرق بتاتی ہیں ۔

وہ انتہائی شگفتہ اور ہلکے پھلکے انداز سے اخلاق اور تہذیب کی بات کرتی ہیں کہ وہ ذہن پر بوجھ نہیں لگتا بلکہ دل خود بخود اس طرف مائل ہونے لگتا ہے ۔اس لئے میں کہتا ہوں کہ روبینہ دورِ جدید کے ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جن کے خلوص کی وجہ سے ان کی آواز میں دم ہے ،اور وہ ہمارے ٹھہرے ہوئے معاشرے میں تحریک کا باعث ہیں ۔۔ان کے الفاظ کی گونج میں بڑی جان ہے ۔اسی لئے کئی دفعہ ہم سب گروپ بیٹھ کر ان کے کالم پر بات کرتے ہیں ورنہ آجکل کی نسل کو انڈین فلموں سے نکالنا بڑا مشکل کام ہے ۔

میں جب بھی ان کی کوئی تحریر پڑھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یورپ ،امریکہ کی پرفریب زندگی ان کی یادوں ،خوابوں اور وطن سے محبت کو ہلکا سا بھی متاثر نہیں کر سکی ۔۔انہیں ہم آج بھی ،ہیلی کالج آف کامرس کی کلاسوں میں ،ایف سی کالج کے خوبصورت فیلڈز میں اور پنجاب بنک کی میزوں کے پیچھے اسی طرح پاتے ہیں جیسے وہ اپنے پاکستان کے دنوں میں تھی ۔مون مارکیٹ ہو یا مال روڈ ۔۔ جہاں جہاں بم دھماکے ہوئے ،ہم نے روبینہ کے کالموں میں ان کا بچپن لرزتے دیکھا ۔ان کا انداز تحریر بہت منفرد ہے ۔اور اس انفرادیت کی وجہ یہ ہے کہ آج جب ہر صحافی ،ہر شعبہ بکا لگتا ہے ۔۔وہ چند ایک ان آوازوں میں سے ایک آواز ہے جو دل کی بات کہتی ہے ،حق کا نعرہ لگاتی ہے ،اور ہم صرف سچ کا چہرہ دیکھنے کے لئے ان کے کالم پڑھتے ہیں ۔ وہ ہمیں یورپ کے خوبصورت نظام کی باتیں بتاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کے لوگوں کو کچھ کرنے کی ترغیب دیتی ہیں ،سچ حق کی بات کہنے ،کرنے کو اکساتی ہیں ۔ جب ہم ان کے خوابوں میں ان کے ساتھ اترتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ یہ دنیا حاصل کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ۔ جہاں وہ عام پاکستانی کو جمہوریت بتاتی ہیں وہاں وہ ان پاکستانی نام نہاد لیڈروں کا پورا پوسٹ مارٹم کرتی ہیں جو انہیں جمہوریت کے نام پر اور کبھی روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر الو بنا رہے ہیں ۔ وہ عام پاکستانی کو

باشعور دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ پاکستان کے بچوں کو وہی سہولتیں دینے کی جنگ میں ہیں جو مغربی ممالک اپنے بچوں کو دے رہے ہیں۔

ہم نے روبینہ کے مضامین سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ معلومات، رشتوں کا احترام، دوستی کے معنی، محبت کے رنگ، سیاست کی مداریاں، انصاف کے معنی، انسانیت کی قدر، دنیا میں ہونے والے مختلف واقعات سے آگاہی۔۔ روبینہ ایک معلومات کا سمندر اور ایک راہبر ہیں۔ ایک کالم نگار، ایک شاعرہ، ایک افسانہ نویس، ایک ڈرامہ رائٹر، امیگریشن کنسلٹنٹ، ایک ماں، بیٹی، ایک بہن،، ایک بیوی اور سب سے بڑھ کر ایک انمول دوست۔ جس کے دوست اپنے سارے دکھ درد اس کے آنگن میں جمع کرتے جاتے ہیں۔ وہ دلاسہ دیتی ہیں، جینے کا ڈھنگ بتاتی ہیں اور اس کے بعد لگتا ہے جیسے ہر طرف۔۔ سب اچھا ہے۔۔ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ دنیا خوبصورت ہو جاتی ہے جینے کے قابل۔۔ اور اور اور۔۔ بہت کچھ۔۔ روبینہ فیصل جی کی شخصیت ایسی ہے جس پر ایک مضمون ناکافی ہے۔ مگر یہاں میں بات ختم کرتا ہوں، آپ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد روبینہ فیصل کو مجھ سے زیادہ جان جائیں گے۔ ان کے تعارف کے لئے کسی اور کے الفاظ شاید اتنے اثر انگیز نہ ہوں کیونکہ ان کے اپنے الفاظ ان کا سب سے اچھا تعارف ہیں، اس کتاب کو پڑھیں اور جانیں کہ سچائی کیسے بولتی ہے؟ آج کے دور میں جب ہم ہر طرف نقل ہی نقل دیکھ رہے ہیں، روبینہ جیسے اصلی لوگ کم کم رہ گئے ہیں، منافقوں کے شہر میں سچا چہرہ لئے ہماری روبینہ یونہی اپنا سفر طے کرتی رہے۔ وہ سچ لکھتی جائے، ہم پڑھتے جائیں، یوں سچائی سے جینے کا ایک ڈھنگ بنا رہے۔

آصف شہزاد

(دبئی)

روبینہ فیصل ایک دل اور دماغ

روبینہ فیصل ایک ہر فن مولا شخصیت ہیں۔ تصورات کے دھارے روبینہ کی تحریر سے پھوٹتے ہیں۔ وہ دل اور دماغ کا خوبصورت امتزاج ہیں۔ انہوں نے جذبات کے اظہار کے لئے کئی راستے چن رکھے ہیں، کبھی وہ نظم کہتی ہیں، اور کبھی افسانہ کبھی کالم اور کبھی ڈرامہ۔ ان کی تحریروں میں انسانیت سے محبت کا درس ہے۔ وہ دنیا میں آزادی اور امن لانے پر زور دیتی ہیں۔ ان کے کالم بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں سیاسی اور سماجی مسائل بڑی مشاقی سے زیر بحث لاتی ہیں۔ ان کے کالموں میں تنقید، توصیف، اور گہرائی ہوتی ہے۔ جو پڑھنے والے کے دل کو چھوئے بغیر نہیں گذرتی۔ میں روبینہ فیصل کے کالموں کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور میں نے ہمیشہ ان میں سیاسی سوجھ بوجھ، سماجی درد، جمہوریت کو پنپتا دیکھنے کی خواہش، سماجی انصاف پایا۔ ان کے کالموں میں ایک ایک جملے میں پاکستان کی محبت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جب ہم ان کے کالم بہت گہرائی میں پڑھتے ہیں تو ہر لفظ ایک کہانی بتاتا ہے۔ اور ان کے کالم اس چیز کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ اپنے وطن سے کتنی مخلص ہیں اور ان کا اس کے ساتھ کیسا گہرا بندھن ہے۔

ان کے کالموں نوحہ نوحہ ابھی جاری ہے ایک تھی شبانہ۔۔ میں دہشت گردی کے نتیجے میں گھروں میں لگنے والی آگ کو بڑے دردمندانداز سے موضوع بنایا ہے۔ ان کی تحریروں

میں chaucer کا ہلکا پھلکا مزاح نہیں بلکہ swift pope کا چیر پھاڑ کر رکھ دینے والا دو دھار طنز ہے۔ جس کو پڑھنے والا اگر سمجھ بوجھ رکھتا ہے تو ایک دفعہ تو لرز کر رہ جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں شدت ہے، حوصلہ مندی ہے اور جرات ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر بات کہنے کی عادی ہیں۔ ان کے جملوں میں کوئی سمجھوتہ، کوئی خوف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہوتی۔۔ وہ کبھی سیدھے سیدھے وار کرتی ہیں اور کبھی طنز کی گہری چادر میں لپیٹ کر تیر اچھال دیتی ہیں۔

کچھ لوگ نثر لکھتے ہیں اور کچھ شاعری کرتے ہیں اور جو دونوں کام کرتے ہیں ان کے پاس خدا کی طرف سے دیا ہوا ایک مضبوط دماغ اور دل ہوتا ہے۔ جو اس دنیا میں ایک نایاب چیز ہے۔ روبینہ ان نایاب لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ان کا دماغ ان کی نثر میں اور دل شاعری میں نظر آتا ہے۔ اور اس امتزاج نے ان کی تحریروں کو ایک عجب حسن بخش دیا ہے۔ وہ دل اور دماغ رکھنے والی ایک منفرد خاتون ہیں۔

ڈاکٹر اقبال، جوش اور فیض نے انقلابی شاعری کی۔ انگلش لٹریچر میں byron نے سیاسی شعور اور آزادی، شیلے نے سماجی انصاف کی بات کی۔ آج کے دور میں ہمیں ایسے لکھنے والوں کی ضرورت ہے جو لوگوں میں سیاسی اور سماجی آگاہی جگا سکیں، جو انسانوں کو ان کے حقوق بتا سکیں، جو بغیر کسی لالچ اور غرض کے کلمہ حق بلند کر سکیں۔ آج آرٹ برائے آرٹ ایک مردہ تھیوری ہے۔ زندگی کے لئے آرٹ۔۔ آج کا نعرہ ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا کہ آرٹ کا مقصد تفریح پہنچانا نہیں بلکہ سکھانا ہے۔ اور میں ڈاکٹر جانسن کی اس بات سے متفق ہوں۔ اگر ہم صرف فن کو تفریح کا ذریعہ بنا رہے ہیں تو پھر ہم رائٹر، شاعر یا افسانہ نویس نہیں بلکہ مسخرے ہیں۔ دوسری طرف میں اس بات سے اختلاف کرتا ہوں اگر ہماری تحریریں بہت خشک مزاجی سے اخلاقیات اور انسانیت کا درس ہی دے رہی ہیں تو پھر ہم پادری کے منبر پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔۔ سو میرے خیال سے ان دونوں کو تحریروں میں شامل ہونا بے حد ضروری ہے۔ تفریح بھی اور درس بھی۔۔ میں نے روبینہ فیصل کی تحریروں میں یہ دونوں رنگ دیکھے، اس لئے ان کے کالم پڑھنے والے بوریت کا شکار نہیں

ہوتے اور جو بات یہ کہنا چاہتی ہیں اسے بڑے مزے سے پڑھ لیتے ہیں۔

روبینہ کے کالموں میں چھپے پیغامات ایک دلنشین انداز میں دل کے اندر بغیر کسی بوریت کے اتر جاتے ہیں۔روبینہ کے ہاتھ میں ایک چابک ہے جو کسی کو نظر نہیں آتی مگر جب وہ پیٹھ پر پڑتی ہے تو جسے پڑتی ہے اسے سب سمجھا جاتی ہے،اور روبینہ کے کالموں میں بہت سی میٹھی گولیاں ہیں جن کی کڑواہٹ حلق میں اترنے پر ہی محسوس ہوتی ہے۔روبینہ نے میری کتاب "songs of humanity" پر ایک کالم لکھا جسے میں اپنی نئی اردو شاعری کی کتاب ۔۔اوج دار۔۔ میں شامل کیا ہے۔میں ان کے کالم پسند کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ یونہی اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں لکھتی رہیں۔

ڈاکٹر مقصود جعفری

(نیویارک)

چند باتیں!

کچھ باتیں قاری سے کرنا ضروری ہیں۔ میں کون ہوں، کہاں ہوں اور کیسے ہوں؟ افسانہ لکھتے لکھتے، ایکدن یونہی غصے سے، حالات سے مایوس ہو کر چند جملے کاغذ پر بکھیر دیے، وہی ہوتے ہوتے بعد میں کالم کی شکل اختیار کر گئے، اور کسے معلوم تھا وہی کالم میری پہچان بن جائے گا۔ آج میں روبینہ فیصل ایک کالم نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہوں، مانی جاتی ہوں یا نہیں اس کا ابھی فیصلہ ہونا ہے۔ اپنے حصے کا کام ہے جو مجھے کرنا ہے۔ میں نہیں جانتی اس سے کچھ فرق پڑ رہا ہے یا نہیں مگر یہ میرا پختہ یقین ہے کہ سچائی خوشبو کی طرح پھیلتی ہے۔ میرے حصے کا دیا میرے ہاتھ پر دھرا ہے اور مجھے اسے جلائے رکھنا ہے، اس کوشش میں چاہے میری ہتھیلی جلتی جائے۔ میں نے اپنے کالموں میں ہمیشہ سچائی، میانہ روی اور انصاف کی بات کی ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ ہمارا معاشرہ کم ازکم منافقت سے پاک ہو جائے۔ پاکستان میں لوگوں کو انسان سمجھا جائے تمام دنیا میں انسانوں کو برابر سمجھا جائے۔ اور سیاست اور صحافت کرنے والے کم ازکم سچ کا ساتھ دیں۔ سچ بولنا

تو ضروری ہے ہی، پچ سن کر سہنا اس سے بھی زیادہ ضروری۔

میرے ملک کے لوگوں کو علوم ہونا چاہیئے کہ وہ جاگیرداروں، وڈیروں اور سیاست دانوں کی طرح کے ہی انسان ہیں۔ اس لئے ان کے حقوق بھی اتنے ہی جتنے ان امیرزادوں کے۔ کالج کے زمانے سے، یہی ناانصافی اور تفریق نے ہمیشہ دل میں بغاوت پیدا کیے رکھی۔ برانچ کا مینجر ہو یا کالج کا استاد ناانصافی کرتے جسے دیکھا، اسی کو ایک دفعہ للکارا ضرور بعد میں نتیجہ جو بھی بھگتتی۔ بنک کی نوکری کے دنوں میں کرپشن کے سر پر تاج اور اپنے جیسے ایماندار، چاپلوسی سے پاک، خوشامد سے دور اور عزت کی حفاظت کرنے والے افسروں کو ہمیشہ کبھی ٹرانسفر کی تلوار کے نیچے اور کبھی ترقی نہ ہونے کی دھمکی کے زیرِ سایہ زندگی گذارتے دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ میرے ملک سے شرافت اور خوداری کیوں غائب ہوتی جاتی ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں پاکستان سے اتنی محبت تھی تو ملک کیوں چھوڑا۔ میں اس کو کبھی نہ چھوڑتی مگر اس نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا۔ میری خوداری اور شرافت اس کے نظام میں گلے سڑے پھل کی طرح پڑے پڑے مرجھا رہے تھے، اور بس ایک دن یونہی اپنی شاخوں کو بچانے کے لئے، وہاں کے نظام سے دو حرف بنے اور کوچ کر لیا۔ میرے قاری مجھے کہتے ہیں پاکستان واپس آئیں اور یہاں کی سیاست میں حصہ لے کر ملک کو صاف کرنے کی مہم میں شامل ہوں۔۔ میں اتنی بہادر نہیں ہوں۔۔ میں اتنی ہی بہادر ہوں کہ دیدہ دلیری سے سچ لکھتی جاؤں۔ یہ میرے حصے کا دیا ہے، وہ کسی اور کے حصے کا دیا ہوگا، جو جلائے گا یا جلا رہا ہوگا، آخر میرے ملک میں ایک روشن صبح آنی تو ہے، یہ تو نہیں کہ ہر وقت اندھیرا ہی رہے گا۔

میری ایک بہن ہے فوزیہ حق، اس سے میں نے سچائی اور صفائی سیکھی۔ حوصلہ اور بہادری سیکھی، مگر اس کی طرح بے پناہ حساسیت نے مجھے ادھ موا کر دیا ہے، اس کے حساس ذہن نے اسے دماغ کا نظر آنے والا ٹیومر دیا اور میری حساسیت نے مجھے روح کے چھوٹے چھوٹے بے تحاشا ٹیومر دیے، جن کی تکلیف سے میں رات رات بھر جاگتی ہوں اور ان لوگوں کے لئے تڑپتی ہوں جو شائد مجھے جانتے بھی نہیں ہوتے۔

ذیبا نورین میری ایک اور بہن جس سے بچپن میں کہانیاں سنتے میں نے کب کہانیاں بُنی شروع کر دیں، خبر بھی نہ ہوئی ۔ بہن ہے، شریک غم ہے، میری دوست ہے اور میری استاد ہے ۔ ڈاکٹر افشاں رافع میری سب سے بڑی بہن جس کی محنت اور پھرتی کی میں اتنی قائل ہوں کہ آج تک مجھے اس کی طرح کی ایک بھی عورت نظر نہیں آتی ۔ دو بھائی میرے سگے ہیں اور تین بھائی میرے بہنوئی ہیں ۔ یوں میرے پانچ بھائی ہیں ۔ میرا چھوٹا بھائی عدنان ہاشمی، کہنے کو مجھ سے چھوٹا ہے مگر جب میرا دل رونے کو کرتا ہے تو اسکے چوڑے سینے کے ساتھ لگ کر رو لیتی ہوں، اور اس کے بعد یوں لگتا ہے دنیا میں کوئی غم نہیں، وہ بھائی بھی ہے اور باپ بھی ۔ اس سے بڑا مجاہد اسلام، اس کے دم سے میں نے پڑھنا شروع کیا، جب بھی اس کے کمرے میں میری کتابیں پڑی رہ جاتیں، وہ اٹھا کر باہر پھینک آتا اور میں غصے اور جنون میں پھر اور پڑھتی جاتی ۔ اس کا مشاہدہ اور حسِ مزاح اسے ایک بہت کامیاب رائٹر بنا سکتا تھا اگر اسے لکھنے پڑھنے سے اتنی دشمنی نہ ہوتی ۔

میں کون ہوں ۔۔ میں یہ سب ہوں، اپنے بہن بھائیوں میں ہوں، میں نے ان سے سیکھا، اپنے ماں باپ سے سیکھا ۔ میری ماں ایک فولادی خاتون ہیں ۔ آئرن لیڈی کا خطاب کسی عام عورت کو ملتا تو کوئی صورت نہ تھی کہ میری ماں اس سے محروم رہتی ۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی محنت، سمجھداری، شرافت وقار اور حسن کا مجموعہ کبھی نہیں دیکھا، جو میں اپنی ماں میں دیکھتی ہوں ۔۔ لوگ کہتے ہیں اپنی ماں تو ہر ایک کو اچھی لگتی ہے، مگر میں نے یہ کب کہا کہ وہ صرف میری ماں کی حیثیت میں اچھی ہے، وہ تو کسی کی بھی ماں ہوتی تو میں اس پر ایک کتاب لکھتی، اور پاکستان کی عورتوں میں بانٹتی اور بتاتی کہ دیکھو اپنی عزت اور شرافت میں رہ کر بھی اپنی محنت کے بل بوتے پر بھی ایک عورت کیسا نام اور کیسا کام کر سکتی ہے ۔ میری ماں کی مثال پاکستان کی ہر لڑکی، ہر عورت کو دیتی ۔۔ اور جب ایسی مائیں ہر گھر میں ہوتیں تو میرا پاکستان کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہوتا ۔ کہیں جہالت، بے غیرتی اور بے شرمی نہ ہوتی ۔ علم، محنت، وقار، غیرت اور خودی ہر بچہ ماں کی گود سے گڑتی کی جگہ لے کر دنیا میں آتا ۔۔ کاش میری ماں جیسی پاکستان کی ساری مائیں ہوتیں

اردو سے لگاؤ، پڑھانے کا فن، پرائے جھگڑے میں گھس کر اسے ختم کروانے کا یا اچھی لڑوانے کا ہنر، بے غرضی، مزاج، ذہانت ۔۔۔ یہ سب جاگیریں میں نے اپنے باپ سے لیں ۔۔ میرے باپ کی جیب میں اگر ایک روپیہ ہے تو کوئی ضرورت مند مانگ لے تو وہ اسے دے دیں گے اور خود یہ فکر نہیں کریں گے کہ کل کیا ہوگا ۔۔؟ یہ سب میرے چہرے ہیں ۔۔ یہ میں ہوں ۔ میں کسی ایک جگہ تھوڑی ہوں ۔۔ میں اپنے اردگرد پھیلے ان سب چہروں میں ہوں ۔ کچھ فون کرتے ہیں اور کچھ لوگ چل کر آتے ہیں، وہ کینیڈا آتے ہیں اور پھر اپنی اس بیٹی کو بھی ملنے آتے ہیں اور صرف اتنا ہی کہتے ہیں بیٹی اپنا قلم کا جہاد روکنا مت ۔ ہم نے پاکستان کے لئے قربانیاں دیں، اور جب تم پاکستان کے لئے لکھتی ہو تو یوں لگتا ہے اب پاکستان کو کچھ نہیں ہوگا ۔ ڈاکٹر ریاض خان زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے ڈین رہ چکے ہیں ۔ زراعت پر بہت کتابیں لکھ چکے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں تم میرے جہاد کو لے کر آگے بڑھو گی اور یہ میری ایسی جاگیر ہے جو میں تمھارے سپرد کرتا ہوں ۔۔۔ اور مجھے اس دنیا میں کیا چاہیئے؟ کیا کسی کو اس کے علاوہ بھی اور کچھ چاہیئے ۔ میرے بزرگوں کا مجھ پر اعتماد، یہی میری دولت ہے ۔

ڈاکٹر خالد سہیل، ڈاکٹر عصمت علوی، ڈاکٹر مقصود جعفری، تسلیم الٰہی زلفی صاحب، عبد المتعال مقیں اور جاوید چوہدری صاحب ان سب سے قلم کا رشتہ ہے ۔ جو کسی بھی اور رشتے سے زیادہ پائیدار ہے ۔ جو ہمیشہ اپنے تجربے سے مجھے مزید روشنی عطا کرتے ہیں ۔ جن میں نہ علم کا تکبر ہے اور نہ خمار ۔ جوان نسل کے آصف شہزاد، سلمان جاذب اور رابعہ مشرف جیسے مخلص لوگ بھی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے رہے ہیں ۔ جو پاکستان میں تبدیلی دیکھنے کے خواہش مند ہیں، جو اپنے اپنے طور پر سوشل ورک بھی کر رہے ہیں مگر میری تحریروں کو اس لئے سراہتے ہیں کہ ان میں سے انھیں اپنے الفاظ اور احساسات کی خوشبو ملتی ہے ۔

پرویز صلاح الدین صاحب کا شکریہ ادا کرنے کیلئے الفاظ نہیں، انھوں نے سب سے پہلے میرے کالموں کو ایک ویب سائٹ بنا کر اس میں پرویا ۔ ان کے اس کام میں نہ کوئی لالچ

تھا اور نہ کوئی غرض۔ اور یہ تو شائد کوئی بھی کر لیتا مگر مجھے وہ دن نہیں بھولتے جب پرویز صاحب کے کینسر کے مرض کی تشخیص ہوئی تھی، وہ بہت بیمار تھے مگر اس بیماری میں بھی میرے کالم وقت پر اپ ڈیٹ کر دیتے تھے۔۔ کیا ایسے کسی بھی عمل کا شکریہ ادا ہو سکتا ہے؟

میرا پہلا ادبی استاد میرے کالج کا دوست فیصل حنیف (شاعر) جس نے مجھے لٹریری شعور دیا۔ اور جس کی باتیں قدم قدم پر میری رہنما بنیں۔۔ جس نے بی کام کے دنوں میں اکاؤنٹنگ اور اکنامکس پڑھتے پڑھتے میرے ہاتھ پر کبھی ممتاز مفتی دھر دیا تو کبھی جوش ملیح آبادی۔ کبھی منیر نیازی سمجھایا تو کبھی میر تقی کی بات کی۔ وہ میری کالم نگاری سے مایوس ہوتا ہے، اسے لگتا ہے ایک افسانہ نگار کو مار کر ایک کالم نویس بن کر میں نے ایک قاتل کا کام کیا ہے جسے سراہا نہیں جا سکتا بلکہ اس کی شدید مذمت کی ضرورت ہے۔

قدم قدم پر ساتھ دینے والا میرا دوست، میرا ساتھی، میرا شریک حیات، فیصل محمود۔۔ اگر فیصل میری زندگی میں نہ آتے تو شائد میں کسی بنک میں اے وی پی بن کر دو جمع دو ہی کر رہی ہوتی۔ زندگی میں محبت کے معنی مجھے فیصل نے بتائے۔ جو صرف دینا جانتے ہیں، وہ بھی خاموشی سے بغیر جتلائے، مجھ سے انہوں نے کبھی کچھ مانگا ہی نہیں اور خود میرے لئے زندگی میں اتنا کچھ کیا ہے کہ میں حیران ہوں آج کے دور میں بھی محبت کے نہ صرف معنی سمجھتے ہیں بلکہ اسے کرنا اور نبھانا بھی جانتے ہیں۔ مجھے لکھنے میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں، مدد کرتے ہیں، ورنہ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ چار بچوں، امیگریشن کے بزنس اور گھر داری کے ساتھ پڑھتی کب ہیں اور لکھتی کب ہیں؟ تو یہ سب فیصل کی معاونت سے ہے۔ اللہ راستے بناتا ہے۔ جس سے جو کام لینا ہوتا ہے اسکا وسیلہ بناتا ہے۔ میرے کام کا وسیلہ فیصل ہیں۔۔ اور خدا نے میری زندگی میں انہیں داخل کر کے اس بات کو اور بھی سہل بنایا ہے کہ میں اپنا لکھنے کا مشن جاری رکھوں۔ ورنہ تو زیادہ تر پاکستانی لکھنے والی عورتوں کو لکھنے کے لئے طلاق لینا پڑتی ہے۔

سب سے آخر میں عمران یاور کا شکریہ جنہوں نے کتنے سالوں سے رکے ہوئے اس عمل کو جاری کیا۔ میرے کالموں کو کتابی شکل دی اور آج یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ایک ایک

مرحلے میں انہوں نے پیشہ وارنہ مہارت کا نہ صرف ثبوت دیا بلکہ بڑے خلوص سے بغیر کسی مادی لالچ کے میری کتاب کو اس قابل بنایا کہ یہ آپ کے ہاتھوں میں آ سکے۔ ورنہ تو باہر بیٹھے لکھنے والوں کی پاکستانی پبلشرز وہ درگت بناتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔! دیکھیے ۔۔کتاب آپ کے پاس ہے ۔۔فیصلہ کیجئے ۔۔اپنی رائے سے نوازیے۔۔۔

روبینہ فیصل (کینیڈا)

بابا لطیف پھر مر گیا......

نواز شریف کی سابقہ رہائش گاہ جو اب بوڑھے لوگوں کی پناہ گاہ بن چکی ہے......وہاں پر پچھلے دنوں ایک 85 سالہ بوڑھے بابا لطیف کی موت ہو گئی......اس کے بچے اسے زندگی میں ہی درگور کر گئے تھے اس لئے مرنے پر دوبارہ دفنانے نہیں آئے بہت سالوں پہلے زندہ درگور بد نصیب ڈیڈ باڈی بھی لینے کوئی نہیں آیا......بابا لطیف بھی اس دنیا میں پیدا ہوا تھا اس دنیا کے سات رنگ دیکھتا تھا بچے بھی پیدا کئے اور انہیں پال پوس کر دنیا کی اس بھیڑ میں ملا دیا اور اپنے لئے کیا مانگا اور کیا پایا اس زندگی سے؟ کیا ہر جگہ ہر وقت ایک بابا لطیف نہیں پیدا ہو رہا ایک کی جگہ دوسرا لیتا ہوا بابا لطیف۔

زندگی تو ٹھوکروں پر کٹ جائے ایسا تو دیکھا تھا......مگر ماں باپ کا ایک اور سپنا بھی ہوتا ہے اگر وہ بھی خاک ہو جائے تو دنیا میں کیا رہ جاتا ہے؟ وہ سپنا کوئی ہمت سے دیکھتا ہے اور کوئی ڈرتے ڈرتے مگر مجھے لگتا ہے ماں باپ کے دل میں یہ پھوٹتا ہوگا......اپنے بچوں کے کندھے پر سوار ہو کر سفر آخرت کو روانہ ہونے کا......میرا بیٹا جب پیدا ہوا تو ایک دن میں اسے کندھے لگائے پھر رہی تھی اچانک نہ جانے کہاں سے میری آنکھوں میں ڈھیروں پانی آ گیا یہ سوچ کر کے کل کو جب یہ مجھے کندھا دے گا تو مجھے کچھ خبر نہ ہوگی بالکل جیسے آج یہ معصوم میرے کندھے سے لگا بے خبر ہے......میں اس کو اٹھائے اٹھائے کتنی مسرور ہوں......کل کو یہ کس جذبے سے مجھے کندھے کا یہ قرض لوٹائے گا......یہ میری آنکھوں کا ایک غم ناک تصور تھا میرے ذہن کی ایک عجیب سی کھڑکی

کھولتا خیال تھا..... مگر مجھے لگتا ہے ماں باپ کا درجہ پانے کے بعد جلد یا بدیر سب کے دل میں پھوٹتا ہوگا..... سوچو جب آپ کی اولاد آپ کو زندگی میں سے تو بے دخل کر دے مگر موت میں بھی آپ کو تنہا کر دے کیسا بد نصیب ہو گیا ہے انسان ترقی کی اس منزل تک پہنچ کر۔ بابا لطیف تو اسی دن مر گیا ہوگا جب اس کی زندگی جوان بچوں کے لئے بوجھ بن گئی ہوگی جب اس کے بیٹوں اور بہوؤں نے اسے گھر سے جانے کو کہا ہوگا، جب اس کے بھانجے بھتیجوں نے منہ موڑا ہوگا، جب سب کی زندگیوں سے اس کی ضرورت ختم ہو گئی ہوگی انہوں نے اسے ایک دن ردی کے ساتھ باہر کا راستہ دکھا دیا ہوگا کوڑے کے ساتھ پھینک دیا ہوگا..... بابا لطیف تو اسی دن مر گیا ہوگا۔

میں ٹی وی پر اس کے ساتھ دوسرے رہنے والے بزرگوں کے بیان سن رہی تھی جن کے چہروں پر اپنے ساتھی کی جدائی لگی تھی اور ساتھ ساتھ اپنی ایسی ہی بے رحم اور لاوارث موت کا انتظار لکھا تھا، جو بڑے دکھ سے بتاتے تھے کہ بابا لطیف کی زندگی میں بھی کوئی اسے پوچھنے نہیں آیا موت پر بھی کوئی لاش لینے نہیں آیا..... ان کو امید تھی کہ زندگی جب لاش میں بدلے گی تو شائد کسی جانور کو بھی انسان میں بدل دے گی مگر ان کی اس آخری امید نے ایسا دم توڑا تھا کہ سب بزرگ جھکی کمر اور شرمندہ آنکھوں سے کھڑے تھے..... ان کی زندگیوں اور موتوں کی اپنے ہی جنے ہوؤں کے ہاتھ بے حرمتی ..... یہ سب دکھ ان دکھیاروں کی آنکھوں میں خوابوں کے ساتھ ہی بس گئے تھے۔

ہم جتنے مرضی ان بزرگوں کے لئے آشیانے بنا لیں ہم جو مرضی کر لیں ..... ہم ان کے اندر اکھرتے ہوئے دکھوں کو ان کے دلوں میں گھر کیے ہوئے غموں کو کبھی نہیں مٹا سکتے۔ اس کا کوئی حل کسی سوشل ورک میں نہیں ہے اس کا حل تو ان سنگدلوں کے پاس ہے جن کو اولاد کہا جاتا ہے ..... جو صرف ماں باپ کو ان کے ماں باپ ہونے کی ایسی سزا دیتی ہے جو کوئی قانون کسی بڑے سے بڑے جرم کی نہیں دے سکتا کیونکہ وہ سزا تو جسمانی ہوتی ہے اور کسی گناہ کی ہوتی ہے..... مگر بچوں کی اس عدالت میں ماں باپ کا گناہ ان کا ماں باپ ہونا ہے..... اور سزا جسمانی نہیں ذہنی ہے روحانی ہے قلبی ہے ان بدقسمتوں کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ والدین وہ چیز ہیں جو ہمارے دکھ پر بھاگے

آئیں گے جو ہماری خوشی میں سب سے بڑھ کر خوش ہوں گے وہ چاہے لاکھ برا کرلیں ساری رات انہیں دروازے سے باہر کھڑا رکھیں صبح اگر بچے کے منہ سے ایک بھی درد کی آواز نکلے گی تو یہ ماں باپ اپنا رات بھر کا درد بھول کر اس درد میں کھو جائیں گے جو ان کے بچے کو ہوا ہے...... یہ اولاد یہ سب جانتی ہے تبھی تو وہ ماں باپ کے ساتھ ہی یہ گھناؤنا کھیل کھیلتی ہے ورنہ دنیا میں اور کون ہے جو اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دے۔

دنیا کی سب سے گھٹیا بلیک میلنگ...... جذباتی بلیک میلنگ ہے جو صرف آج کی اولاد جانتی ہے کس طرح ماں باپ کو کرنی ہے...... ماں باپ کی سرشت خدا نے ایسی بنائی ہے اولاد کیلئے کبھی برا نہیں چاہتے، ان کے ہاتھ کبھی ان کیلئے بد دعا کیلئے نہیں اٹھ سکتے ان کے دل ان کی محبت سے بھرے رہتے ہیں وہ ان کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتے ہیں ان کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھنا چاہتے ہیں دنیا کی ہر خوشی ان کا مقدر ہو...... اس چاہ کے بدلے انہیں کیا ملتا ہے...... آشیانے؟ یا پر نکلتے ہی تو کون اور میں کون؟ کا رویہ...... ہمیں کہیں تو رکنا ہے کسی کو تو سوچنا ہے کہ کیا ہونا چاہئے اور کیوں ہو رہا ہے؟

میں بابا لطیف کی بخشش کیلئے دل سے دعا کرتی ہوں...... جس نے یہ سپنا تو ضرور دیکھا ہوگا...... کہ وہ اپنے بچوں کے کندھے پر سوار ہو کر ہی قبر میں اترے، راتوں کو جاگ جاگ کر ان بچوں کیلئے اس نے کیا نہیں کیا ہوگا؟ خود بھوکا بھی رہا ہوگا مگر ان کو کبھی فاقہ نہ کرنے دیا ہوگا۔ اپنا پیٹ کاٹ کر انہیں سکول بھیجا ہوگا اپنے عیش کے دنوں میں راتوں تک ان کی دو روٹی کیلئے محنت کی ہوگی...... اس کے بدلے میں اس نے شائد ایک ہی خواب دیکھا ہو...... اس وقت بھی دیکھا ہو جب انہی بچوں نے اسے آشیانے میں داخل کروایا ہوگا...... اور اس کے بعد اس کو بھول گئے ہونگے...... شائد اس وقت بھی اس نے یہی خواب دیکھا ہو کہ میرے بچے ہی مجھے کفنانے دفنانے آئیں گے...... 85 سال کی عمر کے تجربوں اور تلخیوں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا ہوگا...... مگر یہ خواب شائد اس کی آنکھوں میں مرنے کے بعد بھی زندہ ہوگا...... اور ہمیشہ زندہ رہے گا...... جب

تک ماں باپ یہ نہ سوچ لیں کہ ایسے بچوں کو دنیا میں کیسے بھلاتا ہے...... ہمارے مشرقی ماں باپ ان بچوں کو کمزوری بنا کر چلتے ہیں ورپھر نوبت یہاں تک آجاتی ہے......ماں باپ کا قرض کوئی نہیں اتار سکتا مگر ان سے نرمی اور محبت کا سلوک تو کر سکتے ہیں......ایک حدیث ہے جو آپکا محتاج ہو اس سے نرمی برتو......سوایک عمر میں ماں باپ آپ کے محتاج ہوتے ہیں......صرف روٹی کیلئے نہیں بلکہ پیار کے دو بول کیلئے بھی، آپ کے مسکراتے چہرے کے بھی، آپ کے وقت کے بھی......ایسی محتاجی میں اگر ہم انہیں خوشی کی چند گھڑیاں دے دیں تو کیا کمال ہو جائے گا؟ کیا انہونی ہوگی؟ فقط ان کی دعا ان کی محبتوں کا شکریہ......اور ہم مہنگائی میں ڈوبے ہوئے لوگ ان رشتوں کو کیا لوٹا سکتے ہیں؟......یہ بےغرض اور مجبور رشتے ہیں......

ان کو رسوا کرنے والوں کیلئے میرے دل سے بد دعا نکلتی ہے......خدایا ایسے لوگوں سے دنیاوی آسائشیں واپس لے لے......ان کو غربت اور رسوائی کی ایسی اندھیری کوٹھری میں دھکیل دے جہاں صرف انہیں ماں باپ یاد رہ جائیں۔شائد اس طرح بابا لطیف بار بار مرنے سے بچ جائے۔

☆☆☆

مری زمین کیلئے تھا مثال ابر کرم

قائداعظم کی سالگرہ کے موقعے پر بہت کچھ لکھنے کو دل تڑپ رہا ہے لیکن اب قلم ساتھ نہیں دیتا کیونکہ لگتا ہے اس قلم کو اور آج کی زندہ روحوں کو یہ احساس بہت شدت سے ہو گیا ہے کہ ہم سے زیادہ دنیا میں بے بس کوئی نہیں ......جس قوم سے غیرت رخصت ہو چکی ہو، جہاں مردہ رحوں کا ڈیرہ ہو وہاں میرا قائد کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ کئی سال پہلے جب ہم بچے تھے تو لگتا تھا ایک شخص تھا بلکہ ہے جس نے سامراجی طاقتوں سے ٹکر لی جس نے ہمیں ہماری انا اور خوداری دلوائی جس نے مسلمان قوم کو شناخت دی، ان دنوں یہ احساس دل میں دھڑکن کے ساتھ ساتھ ہی رہتا تھا کہ ہمارا محسن، ہمارا قائد ہمیں علیحدہ شناخت دیکر ایک ٹوٹی پھوٹی ایمبولینس میں اپنا سفر آخرت طے کر چکا ہے مگر پھر بھی زندہ ہے وہ شخص بہت دل کے قریب تھا لگتا نہ تھا کبھی دور ہو گا مگر آج کیا آج وہ ہمارے پاس ہے؟ کیا دل کے ساتھ آج وہ اور اس کے اصول دھڑکتے ہیں؟ ہم اس کے نقش پا سنبھالے ہوئے ہیں؟ .....لوگو! آؤ آج مل کر ماتم کریں کیونکہ آج ہم نے اس شخص کو کھو دیا ہے۔ آج سالگرہ منانے کا نہیں قائد کی وفات کو celebrate کرنے کا دن ہے ہم نے قائد کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کھو دیا ہے۔

کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا؟ ایسا سمجھنے میں ہی ہماری عافیت ہے کیونکہ اگر آج ہم اس کو زندہ تصور کر لیں اور کل کو ہمارے سامنے آ کھڑا ہو اور ہم سے پوچھے کیا تم لوگوں نے پاکستان کو آج تک اسلامی سٹیٹ بنا لیا ہے تو ہمارے پاس کیا جواب ہو گا......سر ہم تو آج اس بحث میں الجھے ہیں کہ کیا آپ نے ہمیں اسلامی سٹیٹ دلوائی تھی، ہم مورکھ تو سوچ رہے ہیں آپ کا مذہب سے دور دور

تک تعلق نہیں تھا ہم نے تو اپنی مسجدوں کو اکھاڑہ بنا رکھا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو فرقوں اور نظریات کی موت مار رہے ہیں وہاں تو آپ کو یہ احساس ہوا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہب نہ ہونے کی وجہ سے کبھی ایک نہیں ہو سکتے ،تو سر ہم آپس میں ہی ایک نہیں ہو سکے ہمارے ہر چوراہے پر ہر جگہ ایک لاش آپ کو مل سکتی ہے مگر قاتل کون ہے؟ گمنام ہمیشہ گمنام ...... کس کو قتل کرنے والا کون؟...... ہمیں کبھی پتہ نہیں چلا ہمیشہ گمنام قاتلوں نے اور گمنام دہشت گردوں نے لاشیں گرائی ہیں یہ گمنام قاتلوں اور لاشوں کا ملک ہے سر آپ یہاں کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ سنا ہے خواب دیکھنے والی قومیں کبھی غریب نہیں ہوتیں ...... ہمارے پاس تو دیکھنے کو اب خواب بھی نہیں رہے، ہم نے سب سے ہار مان لی ہے۔ ہم جھکی ہوئی ، بکی ہوئی قوم ہیں۔ آپ ہمارے قائد کیسے ہو سکتے ہیں جب آپ کی عینک گر پڑی تو ساتھ بیٹھے ماؤنٹ بیٹن نے کہا اب کیسے اٹھاؤ گے آپ تو کبھی کسی کے آگے جھکتے نہیں آپ نے جیب سے دوسری عینک نکالی اور آنکھوں پر لگالی۔ اور سر ہم تو جھکی ہوئی شکستہ حال، پسپا قوم ...... ہمارے پاس دوسری عینک نہیں ...... عینک ہو بھی تو ہمیں یاد نہیں کہ ہماری جیب میں ہے بھی یا نہیں، اگر ہے بھی تو ہمیں اسے بروقت استعمال کرنے یا نہ کرنے کا شعور تک نہیں۔ ہمیں تو کوئی بتائے کہ عینک لگا لو تو ہم لگا لیتے ہیں کوئی کہے نہ لگاؤ تو ہم نہیں لگاتے۔ ہم میں تو اتنا فیصلہ کرنے کی طاقت بھی نہیں ہے تو کیا سر آپ ہمارے قائد ہو سکتے ہیں؟۔

ہم نے پہلے آپ کے نقش پا دھندلے کیے پھر آپ کی ذات کو اپنے اندر سے نکال پھینکا آج کل صرف آپ ہمارے کرنسی نوٹوں میں زندہ ہیں مساوات کو جھٹلاتی ، جمہوریت کے پرخچے اڑاتی ، فیوڈلزم کو فروغ دیتی ہمارے سوسائٹی لاکھوں میں تنخواہیں لیتے ہمارے مشیر وزیر بھی سنوری ہماری اسمبلی کی اراکین (خواتین) ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہمارے سیاستدان۔ رشوت سے بنا یہ پورا معاشرہ ، بے انصافی کا بول بالا ، قانون آپ کی دشمن، غریب سے غریب تر ہوتا بزدل انسان، امیر سے امیر تر ہوتا بے غیرت انسان۔ اس جنگل میں کیا آپ جیسا کوئی قائد رہ سکتا ہے ایک دفعہ آپ نے کہا تھا میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں ...... سر آج یہی کھوٹے سکے ہیں جن کے

رحم و کرم پر ہمارا معاشرہ، ہماری ناؤ کے ٹوٹے چپو ہیں اور ناؤ میں بڑے بڑے چھید ہیں...... ایسی ناؤ کبھی پار لگتی ہے؟ اس ملک پر قرآن کا سایہ ہے آپ جیسے لیڈر کی پرچھایاں ہیں......شائد نہ ڈوبے شائد بچ جائے (اللہ کرے اللہ کرے)۔

ان کا سایا ایک تجلی ان کے نقش پا چراغ......مگر آج اتنی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کاش یہ ملک ایک صرف ایک لیڈر آپ جیسا پھر پیدا کر دے آپ کے پاؤں کی خاک جہاں پڑی تھی وہاں سے ایک اور آپ جیسا ہمارا نجات دہندہ پیدا کر دے جس کی بدولت ہمارے جھکے سر اٹھیں اور ہم پھر سے جی اٹھیں آپ بھی دوبارہ سے زندہ ہو جائیں تو پھر ہم آپ کی سالگرہ منائیں۔

آپ وہ لیڈر تھے جو جھکتے نہیں تھے دوسرے کو جھکاتے تھے، اپنے نوکر کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے وقت کی پابندی کرتے تھے بددیانتی سے بیر تھا، جھوٹ سے نفرت تھی۔ مکاری کر نہیں سکتے تھے اپنے موقف سے پیچھے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ آپکے اندر کا وقار آپ کے چہرے پر تھا اپنی غلطی پر نوکروں کی تنبیہ بھی برداشت کرتے تھے ان تھک محنت سے اپنی خوداری سے اپنی ایمانداری اور لگن سے ایک کمزور انسان یہ ملک ہم کو بنا دیا گیا مگر شخص کی بدقسمتی کہ ملک ان کے بعد ہمیشہ راشیوں، زانیوں، شرابیوں، عیاشوں، جاگیردارانہ ذہنیتوں، بے اصولے، بن پیندے کے برتنوں کے ہاتھ رہا جو نہیں جانتے عزت نفس کیا ہے وقار کیا ہے خودی کیا ہے؟ ہم کون ہیں اور ہمارا ملک کیوں بنا تھا؟ جو بے نام اور بے شناخت لوگ ہیں......جنہوں نے اوروں کی طرح مٹی میں ہی ملنا ہے مگر اپنی ماں کو اچھی طرح رسوا کر کے۔ جو ماں کو ماں ہونے کی ایسی سزا دے کر جان چھوڑیں گے کہ مدتوں تاریخ ان پر تھوکتی رہے گی مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ اس احساس سے بھی عاری ہیں کہ یہ تھوک ہے یا امرت؟

بے حسی کی انتہا کو پہنچتی اس قوم نے اپنا قائد کھو دیا ہے کیونکہ بے ضمیر، بے غیرت، نام نہاد لیڈروں کے صدقے برباد ہوتی یہ قوم بربادی کی اس انتہا کو پہنچی ہے کہ وہ اپنا اصل اور اپنا نجات دہندہ بھی کھو بیٹھی ہے۔ چلو مل کر منائیں سالگرہ سید پرویز مشرف کی جو اپنا آپ بھولے امریکہ کردا

آپ امریکہ ہو یا۔نواز شریف کی منائیں جس کی بیگم فرماتی تھیں کیا ایک ملک کا منتخب وزیر اعظم جہاز کا رخ بھی نہیں موڑ سکتا؟ بھٹو کی منائیں جو پیٹ سے کپڑا اٹھا کر کہتا تھا جب تھک جاتا ہوں تو تھوڑی سی پی لیتا ہوں ...... یحیٰی خان کی منائیں جس نے ہنستے کھیلتے ملک دولخت کر دیا اور کسی نے اف تک نہ کی۔جنرل غلام محمد کی منائیں جس نے کبھی رال ٹپکتے منہ سے نہ کبھی لڑکی چھوڑی اور نہ شراب۔ایوب خان کی منائیں،ضیاالحق کی منائیں جنہوں نے مارشل لاء لگا لگا کر جمہوریت کے نام پر بنے ملک کو دنیا میں ایک تماشہ بنا دیا۔

آج ہمارا ملک ان لیڈروں کا بچہ ہے۔وہ ایسا سپوت بن چکا ہے جس کو کہا جا سکتا ہے ڈاکو کا بیٹا ڈاکو......وہ ایک ایسی طوائف ہے جسے اپنے شروع شروع میں بکنے پر تکلیف ہوتی تھی، جو کبھی کبھی سسکتی تھی کہ میں بھی اصول والی،ہوں ایمان والی ہوں مجھ پر رحم کرو۔مگر اب زمانے کے ہاتھوں بک بک کر وہ کہتی ہے بس اتنا ہی بکنا تھا؟ ارے بھئی اور بیچو کتنا کو اور بیچ سکتے ہو؟ پہلے وہ اپنے ایمان سے بھرے پاکیزہ جسم پر غلاظت سے اتھڑے ہاتھوں پر شرمندہ ہوتی تھی کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی گناہ کر کے کئی کئی دن اپنے آپ سے نظر نہیں ملا پاتی تھی،تو کسی اور سے کیا۔مگر اب گناہ سے بھرے جسم میں وہ ذرا ذرا سانس لیتی ایمانداری سے شرمندہ ہے،وہ گناہ کے تالاب میں ہلکی سی ایمان کی روشنی سے شرمسار ہو جاتی ہے۔پہلے اس کو گناہ رلاتا تھا آج اس کو نیکی پریشان کرتی ہے۔ اس رنڈی بازار میں سوری قائد اعظم آپ تو کہیں نہیں رہے......دور دور تک نہیں۔شیشے میں دل کے سارے یقین بال ہو گئے۔تو بڑا عظیم رہبر تھا ہم نے تجھے کھو دیا......اپنے اندر سے تجھے کھرچ کھرچ کر نکال دیا......ہماری کوئی معافی ہے؟

کیا پھر کبھی نہ لوٹ کے آئے گی وہ بہار
کیا پھر کبھی نہ آنکھ میں اترے گی وہ دھنک

☆☆☆

یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیمان جاناں

کیا کبھی بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں سوچیے ...... سب رہنے دو یہ سب ڈھول تماشوں کو سب ظاہری جھنڈا باجوں کو چھوڑ کر بس سوچیے سچے دل سے اپنے اپنے خداؤں کو حاظر ناظر جان کر مان کر سوچیے کیا ایسا ممکن ہے؟ میرا دل کہتا ہے نہیں! آپ کا دل بھی یقینی طور پر یہی کہانی سنائیگا۔ آپ کے دل کے ڈھول پر بھی یہی تھاپ پڑے گی ہم اپنے ملکی لیول پر اس طرح کی بڑی قلابازیاں بڑا مداری پن دیکھ چکے ہیں اگر ہم چپ ہیں تو یہ نہیں کہ ہمیں بات نہیں کرنا آتی یا ہم دیکھنے سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہیں ...... نہیں ہم تو تھک گئے ہیں کوئی ہلکے سے سر اٹھاتا ہے کوئی ایک آدھا سر پھرا، جھوٹ سچ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو کیا؟ ...... کچھ بھی نہیں وہ سر پھرا اپنا سر سنبھالتا ہے اور پھر اپنی کینچلی میں گھس جاتا ہے اور مداری ہیں کہ اپنی ڈگڈیاں بجائے جاتے ہیں ان کا ناچ دیکھنے کا لوگوں کو الجھائے رکھنے کا شوق ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔

نسلیں ہیں کہ ختم پر ختم ہوتی جاتی ہیں ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری، اور تیسری کے بعد چوتھی بھی آ چکی ہے، مگر ان پر چھائی بے بسی ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی، مسائل اتنے توانا ہیں کہ قابو میں نہیں آتے۔ نسلوں کی بے بسی کو پختہ کرتے یہ شعبدہ بازی اپنی کمزوریوں کے ساتھ مٹی ہو چکے ہیں یا راکھ بن کر بہ چکے ہیں مگر اس سے پہلے وہ اپنے ہی جیسی ایک نئی فصل کھڑی کر جاتے ہیں وہ فصل ان بھی زیادہ زہریلی ثابت ہوتی ہے۔ تو کیا ایسے پھیلے ہوئے زہر میں کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟ ...... کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ اس زہر سے انسان یا

انسانیت اگ سکتی ہے۔؟

مجھے حیرت ہوتی ہے جب کوئی پاکستان کی اداکارہ بھارت جاتی ہے اور کوئی بھارت کا کلاکار پاکستان آتا ہے تو ہر طرف یہ صدا لگانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وقت آ رہا ہے اور آج یہ ماضی کے دشمن ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہونے کو ہیں صرف اداکاروں کے خالصتاً ذاتی فائدے پر مبنی دوروں کو قوموں کی تقدیروں کا مالک بنانے کی کوشش کی جاتی۔ اور فضا میں ایسا تاثر بٹھایا جاتا ہے کہ یہ مصنوعی زندگیاں گزارتے لوگ طبلے پر اور ڈھول پر ناچتے لوگ اتنے برسوں سے بھرا غض ختم کردیں گے اور یہ برسوں سے سرد جنگ اور گرم جنگ میں ڈوبی ہوئی دو قوموں، دو مذہبوں اور دو خطوں کی قوموں کو ایک کردیں گے۔ سب پیار، مان سمان اپنی جگہ مگر کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا کوئی سنجیدہ قدم اٹھائے بنا ہم یہ جنگ بندی جو کبھی نظر آتی ہے اور کبھی نظر سے اوجھل ہوتی ہے کر سکتے ہیں؟

پاکستان اور انڈیا کے لوگوں میں تعصب کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ یہ کسی میرا کے بھارت جانے یا مہیش بھٹ، عامر خان کے پاکستان آنے سے ختم نہیں ہوسکتیں۔ انڈیا کی پاکستان کے خلاف بنی فلمیں دیکھ کر کوئی محب وطن، نارمل انسان اپنا بلڈ پریشر کنٹرول نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ انہی کی کسی اداکارہ کا اچھا سا رقص نہ دیکھ لے، یہ تضاد ہے ہماری شخصیات کا۔ ہمارے شوق بھی ہیں اور ہمارے وطن کیلئے جذبات بھی ہیں انہی چیزوں کو سمجھ کر بھارت ہمیں چارہ ڈال رہا ہے کسی نادان، لالچی بچے کی طرح وہ ہمارے منہ میں اپنی فلمی ثقافت کا لالی پاپ ڈال کر ہمیں بہلا رہا ہے یہ بہلاوہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم سے ٹریڈ کر کے وہ اپنا الو سیدھا کرے گا ان کی ہیروئنز جانتی ہیں پاکستان میں ان کی کیا مانگ ہے انڈیا کی تھکی ہوئی ہیروئنز پاکستانی پروڈیوسرز سے منہ مانگی رقم مانگتی ہیں، نادرہ ببر جیسی جس کے نام سے ہم واقف نہیں آ کر ہم پر احسان کرتی ہے کہ میں تو پاکستانی ہیرو کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں ...... لو جی پہلی کامیابی ...... وہاں پر جا کر ہماری میرا اپنا پیسہ مال سب لٹا کر کہتی ہے بڑے فخر سے سر اٹھا کر مجھے جتنی عزت بھارت میں ملی شاید ہی اپنے ملک میں

ملی ہو.....لو جی دوسری کامیابی ...... یہ سب کامیابیاں ہیں جو اتنے بڑے بڑے ناٹکوں کے بعد ہم کو ملی ہیں۔انڈیا کے اندر بھرا ہوا وہ مان کہ وہ ہمارا باپ ہے یا اس کی بدولت ہم معرض وجود میں آئے یا یہ کہ اس نے ہم پر کوئی احسان کیا کچھ بھی یا اس کا احساس برتری ......یا اس کا جذبہ حسد یا ہمارے کھلتے چہروں سے کوئی احساس کمتری کچھ تو ہے جو بھارت کو چین نہیں لینے دیتا۔

اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ پاکستان، انڈیا کی عوام ایک دوسرے کے پاس آنا چاہتی ہے ایک دوسرے سے محبت کرتی ہے ...... سراسر غلط، کرکٹ میچ سب سے نمایاں تماشہ جہاں انڈیا پاکستان ایک دوسرے کے روبرو ہوتے ہیں۔ ہر دفعہ شارجہ کپ میں ان دونوں کا رن پڑا دونوں طرف کے لوگوں کی حالت میدان جنگ میں لڑتے ہوئے سپاہیوں کی سی ہو جاتی تھی۔عوام اتنی جذباتی کبھی نہ ہوتی جتنی اس وقت ہوتی۔کپل دیو نے ورلڈ کپ جیتا تو ہم خوش ہوئے کہ ایشیا کے پاس کپ آیا لیکن چھوٹے دل و دماغ کے ہندوستانی نے کہا یہ کپ صرف انڈیا کا ہے اس جملے نے ہم سب کے جسموں میں تناؤ بھر دیا جب کبھی یہ تناؤ کم ہونے کو آیا ہم نے ایسا ہی کوئی فقرہ سنا۔ ہماری عوام پیار کرنے والی اور سادہ دل ہے وہ اندر نہ مینگنی پال سکتی ہے نہ کسی کی مینگنی آسانی سے سمجھ سکتی ہے اسی عادت کے ہاتھوں ہمیشہ مسلمان قوم ماری گئی۔

مجھے ایک بھارتی لڑکا کہتا ہے پاکستان بنا کے تم لوگوں نے کیا کمال کیا ہیں تو ہم تمہارے باپ۔ میں نے کہا یہی تو مصیبت ہے باپ نہیں بڑا بھائی کہو۔وہ بھی برادران یوسف کی طرح جس میں حسد ہے جس میں یہ خوف گھر کر گیا ہے کہ دنیا میرے چھوٹے بھائی کو زیادہ نہ مان لے۔دنیا میں وہ کوئی مقام نہ بنا لے بڑے بھائی سے آگے نہ نکل جائے۔ میں نے کہا یہ چلن بھائی کے تو ہو سکتے ہیں، جو چاہتا ہے چھوٹا تمام عمر چھوٹا رہے سر نہ اٹھائے اپنا جہاں نہ بنائے چھوٹے کی کوئی کامیابی بڑے کی برداشت کی حد میں نہیں آتی باپ تو کبھی ایسے نہیں ہو سکتے وہ تو بچوں کا سایہ ہوتے ہیں ان کو اچھا برا سمجھاتے ہیں اپنی پلیٹ سے بوٹی نکال کر بیٹے کو کھلا دیتے ہیں تم کیسے باپ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے ہم نے تو تمہیں اپنی بوٹیاں چباتے دیکھا ہے وہ مجھے کہتا ہے تم لوگ

بہت جذباتی ہوتے ہو۔ میں نے کہا ٹھیک کہتے ہو! ہماری بغل میں چھری ہو تو منہ میں اللہ اللہ آتی ہی نہیں بغل میں چھری کے ساتھ رام رام ہی ہو سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کشمیر باعث نزاع ہے مگر مجھے ایسا نہیں لگتا بھارت کی ضدوں میں سے ایک ضد تو ہو سکتی ہے مگر اس کو پورا الزام نہیں دیا جا سکتا یہ مسئلہ تو کوئی نہ کوئی نسل ختم کروا ہی دے گی مگر انڈیا کے اندر جو جڑوں تک پھیلا زہر ہے تعصب کا ،حقارت کا احساس کمتری یا برتری کا حسد کا چھوٹے بھائی کو کنوئیں میں پھینک کر باپ (امریکہ) اور پوری دنیا کو اس کی بھیڑ کے خون سے بھری قمیض دکھا کر جھوٹا ڈرامہ کرنے کے شوق کا۔ اس کے خاتمے کے ساتھ ہی سب ٹھیک کی آواز آ سکتی ہے تو سوچئے اور بتایئے کیا یہ کسی انسان کسی قوم، کسی ملک کے بس میں ہے کہ وہ اپنے ان نفسیاتی امراض کا علاج کروا کر کسی فلم یا ڈرامے کے اختتام کی طرح ہنسی خوشی ہمیشہ ہمیشہ رہنے لگے یہ سب تو موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

انڈیا ہمیں ہمیشہ کی طرح بدھو بنا کر UNO کا ممبر اور سپر طاقت بننے کی فکر میں ہے ہمیں فلمی اداکاروں کے چکر میں الجھا کر خود کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں سپر مین بننا چاہتا ہے کچھ سال پہلے تک بھارت پاکستان کے complex میں تھا آج پاکستان اس میں الجھ گیا ہے...... برادر یوسف رفتہ رفتہ ہمیں کنوئیں میں دھکیل رہا ہے اور ہم ہنسی خوشی اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیئے اپنی ہی ذات کی نفی کرتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ آج ہمارے بیچ یہ سوال بھی مضحکہ خیز طریقے سے اٹھ رہے ہیں کہ کیا پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا بھی؟ یا نہیں؟ یا سلامی ملک بنا تھا یا سیکولر سٹیٹ کا قیام ہوا تھا؟ کیا علامہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا یا وہ ویسے ہی خواب خرگوش کے مزے لیتے رہے تھے بھائی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا ہے تو یہ سب تو اب سوچنا ہی ہے......سوچ کی کھڑکی پروپیگنڈا سے کھلی ہے تو اب تو بہت کچھ سوچنا ہے......اب تو بھائی کے زیر سایہ بڑے ہو رہے ہیں سوچنا تو بہت ہے اپنی ذات کو مٹانے کا سفر ہے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ سفر تو ابھی بہت ہے آغاز ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

☆☆☆

چندہ مسجد اور دہشت گردی

خوشی ہے کہ کینیڈا میں مسجدیں بن رہی ہیں دل خوش ہوتا ہے جب کسی گھر میں بھی نماز ہوتی ہے کہیں سجدہ پڑتا ہے تو دل خوش ہوتا ہے لگتا ہے خدا کی ذات ہمارے ساتھ ہے ہمارے سجدے پر خوش ہے۔ عید کی نماز پر ہر مسلمان چاہے وہ روزہ رکھتا ہے یا نہیں مسجد کو بھاگتا ہے ہر مسلمان کا دل قدرتی طور پر چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور دوزانو ہو کر اس کا ایک بار تہہ دل سے شکریہ ادا کر دے۔ اس سب کے لئے جس سے اس نے ہمیں نوازا۔ اس دن ہر جبین خضوع وخشوع کے ساتھ رب کے حضور جھکنا مانگتی ہے۔ ہر کوئی رب سے بات کرنا چاہتا ہے، نہا دھو کر رب کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونے کو دل کرتا ہے۔ اس کیلئے کوئی نہیں چاہتا کہ بہت عالی شان مسجد ہوگی تو ہی میں نماز پڑھوں گا۔ سادہ سی جگہ پر سادگی سے پڑھی گئی نماز خدا کے نزدیک اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی سجی سنوری مسجد میں پڑھی ہوئی، پھر یہ سب کاروبار کیوں؟

کیا ہم اتنی بڑی بڑی مساجد بنا بنا کر اپنے ہم وطن بھائیوں کو جو مہاجرین کی صورت آتے ہیں اور یہاں کے سسٹم میں دھتکارے جاتے ہیں ان کو پناہ دینے کیلئے بنا رہے ہیں؟ کیوں کے مسجد میں نمازی نہیں ہوگا تو مسجد کس لئے کسی علاقے میں ایک مسجد کا ہونا ضروری ہے مگر ایک علاقے میں مسجدوں کو دکانوں کی طرح سجانے اور بنانے کا کاروبار شروع ہو جائے تو وہ کسی طور پر قابل ہضم نہیں۔ اگر ایک علاقے میں بہت سی مسجدیں، سنی کی مسجد، شیعہ کی مسجد، بریلوی کی مسجد، قادیانی مسجد، بوری مسجد، اور اسی طرح ہر فرقے کی ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بن جائے جیسے

پاکستان میں ہو رہا ہے، تو اتنی مسجدیں بن جاتی ہیں جتنے نمازی نہیں ہوتے۔ نماز پڑھنے والوں کیلئے مسجد میں جانا عذاب بن جاتا ہے۔

میں نے عید کی نماز پڑھنے والے ہر عورت اور مرد کو پریشان دیکھا؟ کیوں؟ صرف اور صرف چندے کے مطالبوں سے۔ میرا خیال ہے کہ جس کسی نے چندہ دینا ہوتا ہے وہ بن مانگے بھی دے دیتا ہے۔ ضرور دیتا ہے۔ صرف ایک دفعہ اس کے علم میں ہو کہ کوئی نیک نیتی سے نیک کام کر رہا ہے اور جس نے نہیں دینا اس نے نہیں دینا چاہے مولوی حضرات زمین آسمان ایک کر دیں تو کیا فائدہ اس مقدس کام کی سیل لگانے کا؟ اس سے فائدہ تو شائد کچھ نہ ہوتا ہو بلکہ نقصان ہی ہوتا ہوگا لوگ متنفر ہو جاتے ہیں مسجد کا رخ کون کرے گا؟ جب لوگ مشکل سے اپنے اور اپنے خدا کیلئے ٹائم نکالتے ہیں۔ ایسے میں چندے کی اپیلیں کر کر کے گھنٹوں کے حساب سے ان کا وقت اور موڈ برباد کر دیا جائے اور وہ بھی کہاں؟ جہاں فی گھنٹہ کے حساب سے لوگ مزدوری کرتے ہیں۔

کینیڈا جیسے ملک میں ہماری مذہبی جگہ جہاں ہم سب اپنے مذہبی اجتماع کر سکیں ہونا ضروری ہے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ لوگوں کی نماز سے محبت کو (جب وہ اطمینان سے اپنے رب سے کچھ حال دل بیان کرنے کو آئے) اس کی اس چاہت کو لگن کو اکتاہٹ میں نہ بدل دیا جائے وہ اس خوف میں مبتلا نہ رہے کہ اگر میں مسجد میں جاتا ہوں تو میرے اتنے گھنٹے ضائع ہو جائیں گے۔ ہمارے مولوی اگر نمازی بھی مسجد سے بھگا دیں گے تو اور کیا کام مسجد کا رہ جائے گا نہ ہماری آج کی مسجد بھولے بھٹکے مسافر (ریفیوجی) کو پناہ دیتی ہے نہ کسی سمت ہماری رہنمائی کرتی ہے جیسے عید کا چاند ہے تو وہ ہم آج کے سائنسی دور میں بھی ایک ملک میں چار پانچ مختلف اوقات میں دیکھتے ہیں۔ جب ہر شخص عید اپنے چاند کو دیکھ کر کر رہا ہے تو مولوی حضرات کس لئے اتنی بڑی بڑی مسجدیں سجا کر بیٹھنا چاہتے ہیں؟

اس عید پر مجھے احساس ہوا کہ مسجد پچھلے دنوں میں دہشت گردی کی وجہ سے باعث خوف بن گئی تھی مگر اب ان چندہ اپیلوں نے لوگوں کو ڈرا رکھا ہے جیسے پاکستان میں ہر گلی میں ایک مختلف فرقے

کی مسجد ہے پہلے تو کشمکش مذاہب کی چلتی تھی اور شاعر پریشان تھا۔

کعبہ میرے پیچھے ہے کیسا میرے آگے

مگر اب تو اندرون خانہ ماشاءاللہ ہم اتنے خود مختار ہو چکے ہیں کہ اس بات پر کئی اشعار لکھے جا سکتے ہیں کبھی کوئی فرقہ میرے آگے تو کبھی کوئی میرے پیچھے وغیرہ وغیرہ، کوئی کدھر کھینچے تو کوئی کدھر کو۔ پہلے تو بڑے بوڑھے کہتے تھے جاؤ بیٹا نماز پڑھو، مسجد جاؤ جہاں نہ ایمان کو خطرہ نہ جان کو مگر آج ایسی قسمت نہیں رہی۔ مائیں بچوں کو خود مسجد جانے سے منع کرتی ہیں سب سے آسان ٹارگٹ لوگوں میں نفرت کا بیج بونے کا فرقہ واریت کو فروغ دینے کا، عبادت گاہوں کو نشانہ بنا دو، سو آج کا بندہ پریشان ہے

فقط اک روح لے کر جایئے گا اب مساجد میں
بدن چھلنی ہوا کرتا ہے واں سجدہ گذاروں کا

آج کے اس ڈرے ہوئے دور میں، سہمے ہوئے انسانوں کے بیچ، حضرت مولوی سے یہی کہنا ہے زندگی آگے ہی بہت مشکل ہے اس کو اور مشکل نہ بنائیں۔ خدا کے گھر کو سادہ صاف اور پرسکون رہنے دیں۔ مسجد کے نام پر ہمیں محل نہیں بلکہ خدا کے روبرو اتحاد سے ایمان سے جھکنے کی ایک تمنا چاہئے۔ کیا وہ آپ حضرات کے بس میں ہے؟ اگر ہے تو ہم سے چندہ مانگیں ورنہ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ پاکستان میں دہشت گردی کے خوف سے کوئی مسجد نہیں کھلتا یہاں آپ اپیلوں کا خوف اور اکتاہٹ نہ ان کا مقدر بنائیں۔ ہمارے فرقوں کو ایک کر دیں ہماری نفرتوں کو کم کر دیں۔ ہمیں اور ہمارے خدا کو اکیلا چھوڑ دیں مسجد کو لوگوں کے چندے سے بنا کر پھر اپنی جاگیر نہ بنائیں...... کرنے کو دنیا میں اور بھی کاروبار ہے ہمارے ڈولتے ایمانوں کے صدقے مذہب کا کاروبار بند کر دیں نمازی کو نماز سے ہراساں نہ کریں۔ نمازی تو لائیں، مسجدیں تو وہیں بن جاتی ہیں جہاں کئی جبینیں اپنے رب کے آگے اکٹھی ہو کر جھک جاتی ہیں۔

☆☆☆

اسی لئے تو انصاف کا حکم ہے!!!

جب ناانصافی حد سے بڑھتی ہے تو خدا کی قدرت بھی جلال میں آتی ہے۔ مگر عروج کو دیکھتا ہوا انسان اور چڑھتے سورج کے زیر سایہ پروان چڑھتا کوئی بھی ذی روح اس خوش فہمی میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اگر اس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے تو وہ سدا رہے گی اور وہ ہمیشہ بھینس کا مالک رہے گا مگر یہ دنیا ہے اسے گھومتے وقت نہیں لگتا، ہاتھ سے لاٹھی جانے کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا ہے تاریخ بدلتے وقت نہیں لگتا۔ دور نہیں جاتے بھٹو سے دیکھتے ہیں، ضیاء کو دیکھتے ہیں، نواز شریف کی شاہی فیملی کا حال سب کے سامنے ہے۔ صدام کا انجام آنکھوں میں ہے، بینظیر اور اس کے محلات کی کہانی ہمارے سامنے ہے۔ ان میں سے کس کو یقین ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ تخت گمشدہ بنا دیتا ہے کسی بھی جگہ کا ہو، گھر کا ہو یا ملک کا...... تخت بری چیز ہے جو اس کے ہوتے ہوئے اپنے اندر اعتدال اور انصاف پسندی پیدا کر لے وہی سکندر ہے۔ مگر یہ بات کس کو سمجھ آتی ہے اور کوئی سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔

اسی طرح ناانصافی کا کھیل بھی بڑا واضح ہے اور ساتھ ساتھ مبہم بھی۔ جس کے ہاتھ میں

کوئی طاقت ہوتی ہے چاہے وہ ماں باپ ہیں یا کسی ملک کا سربراہ وہ اس چیز کو بہت ہلکا لیتے ہیں، بہت آسان لیتے ہیں۔ جیسے ایک بچہ آ کر ماں سے کہتا ہے ماں تو مجھے چیز لے کر نہیں دیتی تو بڑے بھائی کو لے دیتی ہے یا ماں تو میرے لئے اس طرح راتوں کو جاگ جاگ دعائیں نہیں مانگتی جیسے تو بڑے بھائی کے لیٹ آنے پر تڑپتی پھرتی ہے تو ماں ہنس کر کہتی ہے جا پاگل کبھی ماؤں کے دل بھی ایسے ہو سکتے ہیں، ماں تو سب کی سانجھی ہوتی ہے، مگر شاید ماں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تو تسلی دے لیتی ہے اور اپنا ضمیر صاف کر لیتی ہے مگر بچہ دل پر بوجھ لے کر جیتا ہے اور اپنی غیر اہمیتی کا سانپ ساری عمر اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور وہ اس کے سائے میں ایسے پلتا بڑھتا ہے کہ اپنی کم مائیگی اور بڑے بھائی کی نسبت اپنی کم اہمیتی اس کی ذات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جس کی خبر اسے خود بھی نہیں ہوتی، مگر بڑے چپکے سے اس کے اندر یہ چیز گھر کر جاتی ہے وہ احساسِ کمتری کا شکار رہتا ہے، منفی خیالات اس کی ذات کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ گھر ماں باپ سے اور گھر کے ماحول سے بغاوت محسوس کرتا ہے، وہ اپنے بڑے بھائی کے خلاف بھی دل میں غصہ رکھتا جاتا ہے جو آنے والے دنوں میں کوئی بھی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

دوسری طرف بڑا بھائی احساسِ برتری اور چھوٹے کو نہ برداشت کرنے کی عادت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس کے بدلے میں اس کی شخصیت بھی منفی پہلو لئے ہوتی ہے، دونوں اپنی اپنی جگہ حالات و تربیت کے ستائے ہوئے ہیں، ان دونوں کے حصے وہی کردار آیا جو ان کو تربیت میں ملا۔ اسی بات کو لے کر چلتے ہیں، یہی حال ملکی سطح پر ہے جب باپ (حکمران صوبہ) صوبوں میں ناانصافی رکھے گا تو یکجہتی کی بات کیا کرے گا؟ جیسے میں ان ماں باپ کو الزام دیتی ہوں جو بچوں میں کھلم کھلا ناانصافیاں رکھ کر بعد میں پوچھتے ہیں نہ جانے ہماری تربیت میں کیا کمی رہ گئی، دیکھو ایک تو اتنا اچھا بچہ نکلا اور دوسرا آوارہ گرد ہو گیا، آج تک کچھ بن نہیں سکا۔

اسی طرح ان فیصلوں کو بھی میں الزام دیتی ہوں جو ان صوبوں کے خلاف ہوتے ہیں یا ان کو مدِنظر رکھے بغیر ہوتے ہیں یا ان کی حق تلفی میں ہوتے ہیں، کچھ ان صوبوں سے بغاوت کے

شعلے اٹھیں تو بولیں قصور کس کا۔ اس ماں کا یا اس باپ کا جس نے پہلے دن سے صرف زبانی حد تک بچے کو یہ احساس دیا کہ میں تجھے بھی بڑے بھائی جتنا پیار کرتی یا کرتا ہوں، مگر عملاً جب بھی چھوٹے کو ضرورت پڑی تو اس کے اوپر بڑے کو ترجیح دی، چھوٹے کی ضرورت کو پس پشت ڈال دیا۔

پہلے ہم نے انہی حرکتوں سے بنگال کھو دیا، اس بھائی کے ساتھ ہمارے باپ نے ناانصافیاں کیں اور شور یہ مچایا کہ اس کو تو شروع سے ہی احساس کمتری ہے مگر یہ بتانے سے ہمیشہ گریز کیا کہ یہ احساس کمتری کیسے پیدا ہو گیا اور پنجاب میں احساس برتری کہاں سے آ گیا۔ کون سا ایسا رویہ تھا؟ مگر محسوس کرنے والی آنکھ احساس کرتی ہے کہ جب گیس کی قیمت 22 روپے فی ملین مکعب فٹ ہو گی، بلوچستان سے جب حکومت گیس لے گی اور وہی قیمت 5000 فی ملین مکعب فٹ ہو گی جب وہ پنجاب سے لے گی۔ پنجاب کی سڑکیں بھی بنیں گی اور بلوچستان میں ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اپنے مقدروں کو روتی رہیں گی۔ ریلوے سسٹم کے نظام میں واضح فرق ہو گا، جہاں صحت کا نظام گھسا ہوا لٹریسی ریٹ سب سے کم ہو گا۔ خوبصورتی کے کام چھوڑ بنیادی ضرورت کے کام بھی جہاں کوئی حکومت نہ کروائے تو وہ چھوٹا بھائی کہے گا...... ماں تو مجھے بھی اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا میرے بڑے بھائی کو کرتی ہے۔ تیرے پیار میں انصاف ہے اور سکون ہے۔ ظاہری بات ہے نہیں کہے گا، اس کی بجائے اس کے دل میں خیال آئیں گے میں اس گھر کو چھوڑ دوں، کوئی دوسرا پیار سے دیکھے گا اس کی طرف بھاگے گا۔ غیر اس چیز کا فائدہ اٹھائیں گے، اسے بڑھ کر گلے لگائیں گے اس سے فائدے اٹھائیں گے، اس کی صلاحیتوں کو اس کے گھر کے خلاف استعمال کریں گے، اپنا ہمدرد بنا لیں گے اور اپنے ہی گھر کا دشمن کر دیں گے۔

تبھی تو آج کہا جا رہا ہے بلوچستان میں انڈیا کی خفیہ ایجنسیاں اپنا جال پھیلا رہی ہیں، اسی لئے تو بنگلہ دیش کے بعد بلوچستان میں حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں، Terrorist Groups دھڑا دھڑ بن رہے ہیں۔ آئے دن دھماکوں کی خبریں، راکٹس کے حملے، جنرل صاحب فرماتے ہیں اڑا کر رکھ دیں گے، انہیں اس میں سے اب اسامہ چاہیے۔ رتبے کے حساب

سے سب سے بڑا صوبہ اور آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا صوبہ اس وقت ماں کی ناانصافی کا شکار ہے۔ ایک انتشار کا شکار ہے۔ سوچنے کی بات ہے ملک کا 40% to 43% رقبہ اس صوبے کا ہے، جیسے کبھی 56% بنگلہ دیش کا ہوتا تھا، نہ اس کی ہم نے پرواہ کی نہ اس کی کر رہے ہیں، اسی ٹھکرائے جانے پر وہ بھی دہشت گردی کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ وہ بات بات پہ بگڑنے کرتا ہے، جیسے بیٹا بگڑا بیٹھا ہے وہ مانتا نہیں اب ۔ وہ ہر اس بات پر بھی جو گھر کے مفاد میں جاتی ہے، پھڈے ڈالنے لگ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے ہمیں کالا باغ ڈیم منظور نہیں ۔ کیوں نہیں؟ بس نہیں ۔ وہ بھول جاتا ہے کہ ملکی انرجی کا کتنا بڑا ذریعہ ہوگا جب ڈیم بن جائے گا تو۔ وہ بس باتوں کو جھٹلا کر اپنی اہمیت ثابت کر رہا ہے۔ کیونکہ اب پتہ چل رہا ہے کہ احساس کمتری کے شجر کے نیچے پلنے والا بیٹا بڑا ہو کر کیا کر رہا ہے وہ منفی سوچ لے کر ابھرا ہے۔

دوسری طرف جس کی ماں بولے بغیر ضرورت پوری کرتی رہی ہے، چھوٹے کو پیچھے کر کے اسی کو سجاتی سنوارتی رہی ہے۔ پنجاب ...... وہ بھی تو اب ایک احساس برتری کا شاہکار بن چکا ہے۔ وہ کیسے کسی کو برداشت کرے، اسے تو برداشت کرنا آتا ہی نہیں ...... اسے تو کسی کو دیکھنا آتا ہی نہیں ۔ ماں کے لاڈ نے اسے بے حس اور اپنی ذات کا غلام بنا دیا ہے۔ اسے چھوٹا بھائی کیسے نظر آئے گا۔ وہ کیسا اس کی طرف پیار سے دیکھے گا۔ تو جنرل صاحب لاٹھی ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں نہیں رہنی، یہ تو خدا کا ایک کارڈ ہوتا ہے کبھی کسی کے پاس سو کبھی کسی کے پاس۔ ان معصوموں پر راکٹ برسا کر، اسامہ مل بھی جاتا ہے تو کیا کریں گے اس اسامہ کا، اپنے سے بڑے دادا جی (امریکہ) کو دیں گے اور شاباش لیں گے۔ وہ معصوم کہاں سے واپس لا کر دیں گے جنہوں نے ایک جھٹلائے ہوئے بیٹے (بلوچستان) کے گھر میں آنکھ کھولنے کا جرم کیا ہے۔

آج بھی وقت ہے 16 دسمبر کو ڈھاکہ کو رونے کی بجائے بلوچستان کو بچانے کی بات کی جاتی تو اچھا تھا۔ اس احساس کمتری کے مارے، اس گرے پڑے بیٹے کو سینے سے لگانے کی بات کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اسے مزید دھمکانے اور ڈرانے کی۔ جنرل صاحب آپ کی دھمکیوں

سے حالات ہاتھ سے نکل گئے تو کسی کا کچھ نہیں جائے گا فقط ہم سے ہمارا ایک اور بازو جدا ہو جائے گا۔ پہلے بازو کو کاٹنے والوں کو ہم نے کیا کہہ لیا تھا جو آپ کا کچھ بگاڑ لیں گے؟ مگر پھر بھی خدا کے ہاں ناانصافی برداشت نہیں۔ خدا کو ناانصافی بری لگتی ہے۔ شاید بہت بری۔ اگر سب جگہ انصاف ہو جائے تو شاید منفی خیالات جنم لینا بند کر دیں اور اس کے بدلے ہر طرف امن ہو جائے، تشدد اور اذیت جیسے لفظوں کا وجود نہ رہے اور رہے نام اللہ کا۔ جو ہمیں اس وقت بچا سکتا ہے تاریخ کے ایک اور بڑے کرائسس سے۔

ہمیں بلوچستان کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ بچا کر، لگا کر، سمیٹ کر رکھنا ہے۔ جو بھی جڑ ہے اسے سرے سے اکھاڑ کر۔ ہر قیمت پر اس بھائی کو اپنے ساتھ ہی رکھنا ہے۔ اس کام میں خدا ہمارے ساتھ ہے۔ آپ بھی دور اندیشی سے کام لیں، اس ناانصافی کو ختم کرنے کی کوشش کریں، سب کچھ اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ ناانصافی کی لہر تو ختم کریں۔ یہ لہر گھر بھی اجاڑ دیتی ہے، صوبے بھی اور ملک کے ملک بھی۔ اس چیز کا احساس کرنے کی ضرورت شاید آج سے پہلے کبھی نہ تھی۔

☆☆☆

کیا مردہ بچی کا نوحہ زندہ سے فرق ہے

(کسی بھی مظلوم عورت کے لئے)

انشو مالویہ، گجرات کے فسادات میں ماں کے پیٹ میں آگ میں جلانے والی بچی کے دکھ میں نوحہ لکھتا ہے:

سب کچھ ٹھیک تھا اماں
تیرے کھائے اچار کی کھٹاس
تیری چکھی ہوئی مٹی
اکثر پہنچتی تھی میرے پاس
سورج تیری کوکھ سے چھن کر مجھ تک آتا تھا
میں بہت خوش تھی اماں
مجھے لینی تھی جلدی ہی اپنے حصے کی سانس
مجھے لگنی تھی اپنے حصے کی بھوک
مجھے دیکھنی تھی اپنے حصے کی دھوپ
میں بہت خوش تھی اماں
ابو کی ہتھیلی کی چھایا
تیرے پیٹ پہ دیکھی تھی میں نے

مجھے ان کا چہرہ دیکھنا تھا
مجھے اپنے حصے کے ابو دیکھنے تھے
مجھے اپنے حصے کی دنیا دیکھنی تھی
میں بہت خوش تھی اماں
ایک دن میں گھبرائی، بجلی جیسے مچلی
ترے کوکھ کے پانی میں
کسی چیز کی چھایا تھی انجانی؟
مجھے لگا تو چل نہیں گھٹ رہی ہے
مجھے چوٹ لگ رہی تھی اماں!
پھر جانے کیا ہوا
میں تیری کوکھ کے گنگنے، ملائم اندھیرے سے نکل کر
چمک دھوپ، پھر چمک آگ میں پہنچ گئی
وہ بہت بڑا آپریشن تھا اماں
اپنی ان آنکھوں سے جو کبھی
نہیں کھلیں میں نے دیکھا
بڑے بڑے ڈاکٹر تجھ پہ جھکے ہوئے تھے
ان کے ہاتھوں میں تین منہ والے
بڑے بڑے نشتر تھے اماں
وہ مجھے دیکھ کر چیخے اماں
چیخے کس لئے اماں؟
کیا خوش ہوئے تھے مجھے دیکھ کر؟

باہر نکلتے ہی آگ کے کھلونے دیئے انہوں نے اماں
پھر تو میں کھیل میں ایسا بسری
کہ تجھے دیکھا نہیں اماں
تو نے بھی اُنم بھگی ہے سو ہر گائی ہو گی اماں
میں کبھی نہیں جنمی اماں
اور اسی طرح کبھی نہیں مری
ہسپتال میں رنگین پانی میں رکھے ہوئے
آجنمی بچوں کی طرح، میں امر ہو گئی اماں
لیکن یہ رنگین پانی نہیں، چبھتی ہوئی آگ ہے
مجھے کب تک جلنا ہو گا اماں؟

یہ تو ایسی بچی کا نوحہ ہے جو جنمی نہیں، جو ماں کے پیٹ میں ہی آگ میں جھونک دی گئی، لیکن یہ تو ملتا جلتا ہے کسی بھی زندہ بچی سے۔ عورت جنم لینے سے پہلے مر جانے یا بعد میں اس کا نوحہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ سب عورتوں کی کہانی ایک سی کیسے ہو جاتی ہے؟ جنم لینے کے بعد ہی بچی کو احساس ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکی ہے اور لڑکا نہیں ہے، ہر آتا جاتا ماں باپ کو بجائے مبارک دینے کے ایک نہ نظر آنے والے دکھ سے نہیں دیکھتا؟ کیا اسی لمحے بچی کے حصے کے انگارے تیار نہیں ہو جاتے؟ ماں باپ جوں جوں لڑکی بڑھتی جاتی ہے اس کو خوف سے دیکھتے جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں یہ Rape نہ ہو جائے، یہ گھر سے نہ بھاگ جائے، ہماری عزت کی دھجیاں نہ اڑا دے، ایسے خوف کے سایوں میں کون بچ سکتا ہے مگر وہ ہے اور آگے کو چلتی بھی ہے اپنے حصے کے ابو بھی دیکھتی ہے اور اپنے حصے کی دنیا بھی۔ نظر کیا آتا ہے؟ ابو کے گرد کھچا ہوا انا کا شدید حصار، جس میں وہ داخل تو کیا ہوتی جھانک بھی نہیں سکتی، ابو اس کے ہونے پر بظاہر خوش مگر اندر سے غیر مطمئن۔ جب تک بیٹا نہ ہو جائے ابو کو بے چینی، اماں کی زندگی اجیرن اور بیٹے کے آتے ہی اماں ابا کو اپنا

مستقبل، اپنا بڑھاپا سب کچھ محفوظ محسوس ہونے لگ جاتا ہے، ہر کرم، ہر نوازش بیٹے پر، ہر پابندی، ہر اخلاقی سبق بیٹی کے لئے، تو کیا یہاں سے اس کے انگارے بڑھ نہیں گئے؟

وہ اپنے بھیا کو دیکھ کر خوش، اپنے ابو کے صدقے واری، اپنی اماں کے لئے تڑپتی، ان کے چہروں پر خوشیاں ڈھونڈتی۔ اماں ابا کہتے ہیں اس کو گھرداری سکھاؤ، پرایا دھن ہے اس سے کیا جی کو لگانا، اپنے گھر جا کر راج کرے گی، یہاں اس کو خدمت کی عادت ڈالو، وہ چلتی رہتی ہے وہ بچی پیدا ہونے کے بعد چلتی رہتی ہے اور یونہی جوان ہو جاتی ہے، ماں باپ خوف سے اور دوہرے ہو جاتے ہیں، اس پر نظر اور گہری ہو جاتی ہے، وہ ماں کی کوکھ سے نکل کر اب بڑی بے اماں ہے بڑے غیر محفوظ ہے مگر ایک دم جوانی کی چلچلاتی دھوپ اس کو احساس دلاتی ہے کہ وہ طاقتور ہے، اندر باہر سے بہت سے مرد اس کے لئے جان ہتھیلی پر رکھے گھومتے ہیں۔

وہ نادان سمجھتی ہے وہ اب بڑی ہو کر طاقتور ہو گئی ہے، ہر جوان اس کی راہوں میں پڑا ہے، ہر کوئی اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے وہ بچپن کی ناقدری کو بھول کر اپنی جوانی کی پذیرائی میں کھو جاتی ہے، ایسے ہی کھوئے کھوئے کبھی اس کی عزت تار تار ہو جاتی ہے، کبھی وہ کسی بات پر نشانہ بنتی ہے اور کبھی کسی بات پر۔ اور پھر یا قسمت یا نصیب وہ شادی کے بند دروازے کے باہر جا کھڑی ہوتی ہے۔ اس بند دروازے کے باہر سے اسے اندر اپنا راج سنگھاسن نظر آتا ہے، اپنا مہاراج نظر آتا ہے جو اس کے آگے غلام بننے کی قسمیں کھاتا ہے اور وہ سنگھاسن جس کے بارے میں وہ بچپن سے سنتی آئی ہے کہ اس کی اصل زندگی اس کی شادی کے بعد ہے مگر یہاں کیا ہوتا ہے اماں آنکھ کھلنے سے پہلے ہی منظر بدل جاتے ہیں، بند دروازے کے کھلتے ہی چار قدم بعد ہی آگ کے تختے ملنے شروع ہو جاتے ہیں وہ جو کبھی چند دن، کبھی چند مہینے اور کبھی چند سال بادشاہی میں گزارتی ہے (وہی سال جب وہ بھرپور جوان ہے اور وہ نگوڑی اس جوانی کو ہمیشہ کی طاقت سمجھ لیتی ہے) پھر اچانک جب وہ مورنی اپنے رنگ برنگے پروں کے زعم میں ناچے جا رہی ہوتی ہے اپنا جنگل خود پیدا کر کے اس میں مست ہوتی ہے،

خود کو سر پر تاج پہنے دیکھتی جاتی ہے، اپنے آقا کو جو اس کے سامنے موجود ہے، اپنی طرف سے تسخیر کیے ہوئے ہیں اچانک جب اس کے پروں کا رنگ اڑ جاتا ہے اور اس کے بدنما پاؤں نمایاں ہوتے جاتے ہیں کسی چھوٹی سی بات پر وہی غلام اس کو بھرے بازار میں گھسیٹ دیتا ہے، پھر کبھی اس کو لوگوں کے سامنے، کبھی تنہائی میں بے عزت کرنے سے نہیں چوکتا، اپنے پاؤں کی جوتی کے ساتھ ہی اس کو بھی جھاڑنا شروع کر دیتا ہے، اس دن اس بچی اور سپنوں کے شہر میں رہنے والی بچی کو اپنے چہرے پر جھریاں نظر آتی ہیں، اپنے بالوں میں چاندی نظر آتی ہے اسی دن سے جب سے اس کا آقا، اس سے منہ موڑے سویا رہتا ہے، اس دن وہ چھوٹی سی گڑیا بوڑھی ہو جاتی ہے، کیا یہاں اس کی آنکھوں میں خوابوں کے بدلے آگ نہیں بھر دی جاتی، یا اس آگ کی جلن اس آگ سے کم ہوتی ہوگی؟ آگے ایک اور میدان ہے، اس کے بچوں کا، پھر وہ اپنے بچوں کے سامنے طاقت آزماتی ہے وہ ابھی تک ماں کی اوقات سے واقف نہیں ہوئے، ان کے لئے وہ بڑی طاقت ہے۔

وہ سمجھتے ہیں یہ ہمیں چلنا، بولنا، نہانا، دھونا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا سکھاتی ہے نہ جانے کتنی طاقتور ہے وہ اس کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، وہ بھی ان پر غصہ اتار کر سمجھتی ہے کہ وہ بھی کچھ ہے مگر اس دن تک جب تک بیٹا ہاتھ پکڑ کر کسی بات سے روک نہ دے گا، اس کی بے اوقاتی، بے ہمتی سے واقف نہ ہو جائے گا اور پھر کہے گا اماں میری کسی بات میں نہ بولا کرو تم کو کسی بات کا کیا پتہ؟

تو کیا وہ بچی کبھی جنمی؟؟ اس نے جنم ہونے سے پہلے ماں کے پیٹ میں سے جس گھر میں آ کر راج کرنے کے خواب دیکھے تھے، ان خوابوں نے اسے اگلے خوابوں تک دھکیلا، بند دروازے کے پیچھے سجے ہوئے خوابوں کی طرف اور وہاں ان خوابوں کے بدلے اس کی آنکھوں میں آگ لگائی گئی۔ کیا وہ آگ اس آگ سے زیادہ کربناک ہے جو ماں کے پیٹ میں ہی لگا دی گئی ہو؟ ماں کے پیٹ سے کس گھر میں آنے کا انتظار کیا؟ اتنی بڑی دنیا میں اس بچی کا کوئی گھر ہے کیا؟ یا صرف گھروں کے جھانسے ہیں؟

ماں کا پیٹ کہتا ہے جاؤ بیٹی اپنے ابو کے گھر میں، ابو کہتے ہیں جاؤ اپنے شوہر کے گھر میں، شوہر کہتا ہے جاؤ اپنے بیٹے کے گھر میں،تو اس بچی کو ماں کے پیٹ میں ہی جلا دیا تو کیا انوکھا ہوا، کسی نہ کسی مقام پر تو وہ جلتی ہے نہ، بلکہ جگہ جگہ جلنے سے بہتر نہیں ایک ہی جگہ جل گئی، اپنی آنکھوں میں سجائے خوبصورت خوابوں کو ویسے کا ویسا ساتھ لے گئی۔

میں کبھی نہیں جنمی اماں میں کبھی نہیں مری اماں

اور سب مان ختم ہو جانے کے بعد

ہر بچی کہتی ہے ہر بچی روتی ہے

ہسپتال میں رنگین پانی میں رکھے ہوئے

اجنمی بچوں کی طرح، میں امر ہو گئی اماں

لیکن یہ رنگین پانی نہیں، چبھتی ہوئی آگ ہے

مجھے کب تک جلنا ہوگا اماں .... مجھے کب تک جلنا ہو گا اماں؟

دل کرتا ہے اس میں ایک اضافے کی جسارت کروں۔

مجھے اپنے پیٹ میں ہی رہنے دیا ہوتا اماں

کیوں مجھے دنیا میں دھکیلا تو نے؟؟؟؟؟؟

☆☆☆

بین بین

عورتوں کے حقوق کی بات اور عورتوں کی آزادی کی بات ...... یہ ایسا موضوع ہے جس پر نجانے کب سے لکھا بھی جا رہا ہے، سوچا بھی جا رہا ہے اور تحریکیں بھی چل چکی ہیں، چل رہی ہیں اور چلتی رہیں گی۔ اس موضوع پر بہت ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ یہ جذبات سے، احساسات سے یا وقتی باتوں کا کھیل نہیں یہ بہت گہرا اور توجہ طلب موضوع ہے۔ اس سنجیدہ اور حساس موضوع کو بہت تدبر سے، بہت دھیان سے بحث میں لانے کی، اس پر بات کرنے کی اور اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ کچھ یوں ہے کہ عورت کی آزادی کی جب بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب اپنی اپنی خواہشوں کے مطابق کیا جاتا ہے اور آزادی کا مفہوم بالعموم بے جا اور مادر پدر آزادی لے لیا جاتا ہے، جو عورتوں کی آزادی کی علمبردار خواتین ہوتی ہیں وہ عام طور پر عورتوں کو اکساتی ہیں کہ ان کی ذات ہی اہم ہے اور وہ گھر اور بچوں سے پہلے اپنے آپ کو دیکھیں اور اپنی شخصیت منوائیں اور اگر کوئی ان کو روکے تو وہ رکیں نہ۔ جو من میں آئے وہ کریں۔

عورت کی آزادی ملکوں میں ایسے ہی مسئلہ ہے جیسے اقلیتوں کا ہوتا ہے۔ ان کے حقوق اور ان کی آزادی کی بات۔ البرٹا کینیڈا میں ایک مذہبی فرقہ Hutterian brethren of wilson colony ہے جنہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ ان کے مذہب میں تصویر کھنچوانے کی اجازت نہیں ہے اس لئے تصویری شناخت والے تمام کارڈز پر انہیں تصویریں کھنچوانے سے مبرا قرار دیا جائے۔ خاص کر ڈرائیونگ لائسنس کے لئے جس پر ایک بالغ شخص کی تصویر لگنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس فرقے کے لوگوں نے عدالت میں اس قانون کو چیلنج کیا اور ملکی، شہری قانون

کو اپنے مذہب کے مطابق بدلنے کی کوشش کی ہے۔ قانون کے مطابق کسی بھی مرد یا عورت کی تصویری شناخت شہریوں کے لئے سکیورٹی رسک اور فراڈ کے جرائم کو کم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ مگر اقلیتیں اگر قانون کو اپنے مذہب کے ساتھ متصادم کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو نتائج خطرناک اور منفی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں جب آزادی کی بات کرتی ہیں اور اسے اپنے کلچر یا مذہب سے متصادم کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو نتائج نسلوں کے لئے اسی طرح منفی اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔

میرا دماغ بہت الجھ جاتا ہے جب عورت ایک طرف تو مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی بات کرتی ہے، اپنی دماغی صلاحیتوں کو اس کے نہ صرف برابر بلکہ بسا اوقات زیادہ سمجھتی ہے مگر دوسری طرف وہی آزادی کی بات کرتی عورت اپنے جسم کو پرانے وقتوں کی لونڈیوں کی طرح صرف مرد کو لبھانے والا اور مرد کو تفریح فراہم کرنے والا آلہ سمجھتی ہے۔ عورتوں کے مقابلہ حسن، عورتوں کے جسم کو نہ ڈھانپنے والے کپڑے، عورتوں کے رقص ...... کیا یہ سب آدمیوں جتنی آزادی کی بات ہے یا صدیوں پرانے لونڈیوں کے زمانے کی گونج ہے بازگشت ہے۔ عورت اگر حقیقت میں سمجھتی ہے کہ وہ آزاد ہے اور مرد کے برابر ہے تو مردوں کے مقابلہ حسن تو ہوتے نہیں، مرد اپنے حسن کی آڑ میں پیسہ تو نہیں بناتے، مرد اپنے مردپن سے ترقیاں اور پروموشنز تو نہیں لیتے۔

عورت کی آزادی اصل میں سوچ کی آزادی ہے، یہ بات بہت سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عورت جب آزاد ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے ان تمام کمپلیکسز سے احساس کمتری سے آزاد ہے جو اسے ایک گھٹا ہوا معاشرہ دیتا ہے جس میں مردوں کی اہمیت ہے اور عورت بس ایک خالی ذہن کی کم عقل والی فرد ہے۔ عورت اس وقت آزاد ہے جب اس کا مخاطب اسے عورت نہیں بلکہ ایک فرد سمجھے ایک انفرادی سوچ ایک مضبوط ارادے اور ایک شعور والا فرد سمجھے نہ کہ مخاطب اسے صرف ایک جسم، ایک نمائش، ایک سجاوٹ اور ایک کھیلنے کی شے سمجھے۔ عورت کی آزادی یہیں سے شروع ہوتی ہے اور یہ ایک سراب ہے کہ اپنے جسم کو سٹیج پر ناپ تول کے لئے، پیمائش کیلئے مردوں

کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دو اور ان پر چھوڑ دو کہ وہ کسے مس ورلڈ اور کسے مس یونیورس قرار دیتے ہیں۔

مجھے یہاں ایک بنک کے پریذیڈنٹ کی بات بہت متاثر کن لگی جس نے کھلے گریبان اور شارٹ سکرٹ پہنی لیڈی آفیسر کو بلا کر یہ بتایا کہ یہ بنک ہے یہاں کا لباس دوسرا ہے اگر ایسے کپڑے پہننے کا شوق ہے تو بنکنگ تمہارے لئے ٹھیک پروفیشن نہیں اور مجھے پاکستان کے بینک یاد آ گئے جہاں عورتیں صرف عورت ہونے کے ناطے بہت سا فائدہ اٹھا لیتی ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں یہ عجیب وغریب قسم کی دھاندلی چھائی ہوئی ہے یہ تو ایک حد ہے جس پر کھڑی عورت اپنا مقام، اپنا رتبہ اور اپنی ذہانت بھولے کھڑی ہے اور وہ کسی بھی قسم کی کمپلیکس زدہ اقلیت کی طرح معاشرے کو بلیک میل کر رہی ہے اور آزادی کی حقیقی روح کی پہچان نہیں رکھتی اور دوسری طرف ایک اور حد ہے جس پر کھڑی عورت بہت برے حال میں ہے جس کی روح تو کیا جسم تک گھائل ہے۔ جس میں اپنی پہچان سرے سے مفقود ہے جو مرد کی آنکھ سے دیکھتی اس کی آنکھ سے سوچتی اور ایک گھن چکر کی طرح چکی میں پسی جا رہی ہے جس کے پاس نہ آواز ہے اور نہ شعور اور سمجھ باقی بچی ہے اور گھٹن کی اس حد پر کھڑی عورت معاشرے کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی ہے وہ نہ بول سکتی ہے اور نہ سمجھ سکتی ہے اور یہ صرف ایک کم پڑھی یا مزدور پیشہ یا کسی گھریلو عورت کی کہانی نہیں بلکہ اس حد پر، اس لکیر پر کئی پڑھی لکھی عورتیں بھی کھڑی ہیں، جن کے باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹے ایک دم سے یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے فیصلے ہم نے کرنے ہیں

یہاں آزادی کا سوال پیدا ہوتا ہے عورت کو یہاں اس لمحے کچھ سوچنے کا سمجھنے کا موقع تو دیا جائے یہاں یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ اسے کیا پتہ...... یہ تو بے چاری عورت ہے اور وہ بچاری عورت چاہے کتنی مرضی سمجھدار، دانشور، مفکر، بنکر، ڈاکٹر اور انجینئر ہو...... مگر بہت ساری باتوں میں اس کی خواہشوں کے اوپر پاؤں رکھ دیا جاتا ہے اسے بتایا جاتا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسے فیصلہ نہیں کرنے دیا جاتا یہاں پر آزادی سلب ہوتی ہے

یہاں پر ذہنوں میں جالے لگتے ہیں اور یہیں سے عورتوں کی حقیقی غلامی کے دور کا آغاز ہوتا ہے اور دوسرا وہاں سے جہاں عورت کو فرد نہیں بلکہ صرف عورت سمجھا جاتا ہے اور اسے غیر ضروری مراعات سے نوازا جاتا ہے...... اور اسے ایک دماغ نہیں ایک جسم سمجھا جاتا ہے یہاں ضرورت ہے آزادی کی بات کی عورت کا عورت پن سے نکلنا اور اس ایک لیبل سے جان چھڑانا ......کوئی عورت ڈاکٹر ہے تو وہ پہلے عورت ہے، کوئی عورت دانشور ہے تو وہ پہلے عورت ہے کوئی شاعرہ ہے تو وہ پہلے عورت ہے......کوئی جرنلسٹ ہے تو وہ پہلے عورت ہے...... نہ اس کی ذہانت، نہ تجربہ نہ تعلیم فقط ایک عورت پن۔

میں نے کئی حضرات کو شاعر عورتوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے سنا ہے......وہ ان کی شاعری کی بات نہیں کرتے وہ یہ دیکھتے ہیں کیا وہ خوبصورت ہے یا نہیں ...... کسی لیڈی جرنلسٹ کے کالمز کے بارے میں اظہار خیال کم اور اس کے چہرے پر تبصرے زیادہ ہوتے ہیں ......کسی عورت کہانی کار کے سوال میری کہانی کیسی ہے؟ کا جواب ہوتا ہے آپ پیاری ہیں ......تو عورت کی آزادی اس کا چھوٹے چھوٹے کپڑے پہننا، یا گھروں سے بے جابا ہر وقت گزارنے میں نہیں، بلکہ عورت کی آزادی اس کے دماغ کو اس کے جسم سے الگ کر کے دیکھنے میں ہے......خود اس کیلئے بھی اور دوسروں کیلئے بھی ......عورت کے عورت پن سے پہلے اس کا دماغ نظر آنا چاہیے۔اور جن بے چاریوں کا پیشہ اپنے جسم سے وابستہ ہے میں اس پر بات نہیں کرتی اس پر قلم اٹھانے کا مجھ میں حوصلہ نہیں اور نہ یہ آج کا موضوع ہے تو عورت کی آزادی کا راستہ بڑا معتدل ہے...... بڑا بین بین۔ یہ سمندر کے دو کناروں کے درمیان چلتا پانی ہے......نہ ایک کنارہ نہ دوسرا ......بڑا گہرا ہے بڑی شعور والی تحریک ہے یہ عورت کی آزادی اتنا آسان موضوع نہیں بڑی سمجھ کی بڑی دانش کی بات ہے یونہی چھچھور پن میں بات بگڑنی نہیں چاہیے بہت سنبھل کر چلنے کی بات ہے۔

☆☆☆

موت سے زیادہ صدمے کی خبر؟

ایران میں ایک 13 سال کی بچی کو اس کے بھائی کے ساتھ تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے سمیت 55 کوڑے پڑے اس کے پندرہ سال بھائی کو 150۔ انہیں قید تنہائی میں رکھا گیا ہے کوئی ثبوت نہیں ان کے گناہ کا وہ کہتے ہیں ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بچی کہتی ہے مجھے گھر جانے دو، سب اس کو پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ کہتی ہے مجھے سکول جانے دو سب پھر اس کو پیٹنا شروع کر دیتے ہی۔ اس کو یہ بھی نہیں پتہ اس کا نومولود بچہ کہاں ہے؟ جیسے اتنی فرسٹریشن میں اسے یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ اس کا سگا بھائی ہے؟ اگر انہوں نے ایسا کیا تو بھی گنہگار وہ معاشرہ ہے وہ والدین ہیں وہ بزرگ ہیں جوان کو اچھے برے کی تمیز نہ سکھا سکے جوان کو اخلاقی اقدار نہ دے سکے جنہوں نے یہ زور رکھا کہ ان کو اتنا دباؤ کہ یہ ہل نہ سکیں، پر نہ مار سکیں۔ جہاں ایک لڑکی نے اپنے کیس میں کہا آج جو گناہ میرے پیٹ میں ہے اس کی ذمہ دار میں نہیں مجھے کیوں سزا مل رہی ہے سزا اس کو دو جو مجرم ہے اس لڑکی کے پاس کوئی وکیل نہیں تھا اس نے اپنا کیس خود لڑا جج نے کہا اس کو پھانسی کی سزا دو، یہ لڑکی تو بدزبان ہے، سو اس عورت نے اپنی بدزبانی کی سزا موت پائی ۔یہ اکتوبر کے مہینے کے کچھ ایران کے واقعات ہیں۔

میں یہاں پر ایران کی لڑکیاں دیکھتی ہوں وہ جسم کی نمائش میں اتنی کھوئی ہوتی ہیں کہ جان نہیں پاتیں کہ کہاں رکنا ہے؟ وہ اپنے ملک کی فرسٹریشن سے دب کر سب کچھ بھول گئی ہیں ان کے پاس اب کوئی بریک نہیں کوئی اخلاقی روک نہیں وہاں کے جوان نماز، روزے سے دور یہاں عیش کر رہے ہیں کیونکہ ان کا اسلام سختی پر تھا، غصہ تھا، شدت تھا۔ نرم نہیں تھا ان کیلئے محبت نہیں تھا پاؤں کی بیڑی تھا۔ آزاد ہوتے ہی انہیں سب بھول گیا۔ ایک ایرانی لڑکی کہتی اگر مجھے ایران میں یہ آزادی ہو تو شائد میں ادھر کبھی نہ آؤں ......تو سوچو کل کو بش ادھر حملہ کرتا ہے ایران کو اسلامی بنیاد

پرستوں سے رہائی دلاتا ہے تو کون نہیں کہے گا بش تم عظیم ہو۔

جہاں ہمارے اسلامی ملکوں میں مذہب کیلئے اتنی نفرت اگا دی ہو اور مذہب کو دنیا کی جابر ترین چیز بنا دیا ہو جہاں لوگوں کو اپنے گھروں میں مقید ہو کر رہنا پڑے تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ آزادی موت سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اسی لئے تو ایسے ملکوں کے باسی کہتے ہیں ہمارے پورے خاندان کو مار دو مگر دے دو ہمیں آزادی۔ سو کہنا یہ ہے کہ بش کی عوام نے اسے چنا اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ ہی ان کا نجات دہندہ ہے وہشت گردوں کیلئے موت ہے ان کا تحفظ ہے اور بش جب جاتا ہے، جس بھی جگہ حملہ کرتا ہے یا کرے گا وہ ہر جرم سے بالاتر ہے اپنے لوگوں کی نظر میں بھی (کیونکہ انسانیت کی بات کرنے والوں نے اسے پھر مسند پر بٹھایا ہے) اور جہاں جا کر بم برساتا ہے ان لوگوں کی نظر میں بھی کیونکہ وہ لوگ پہلے ہی اپنے آنگن میں اتنی آگ دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ پرائی آگ محسوس ہی نہیں کرتے۔ وہ امریکہ کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر خوش آمدید کہتے ہیں،

غیروں کے دیئے ہوئے زخموں کو اپنوں کے دیئے ہوئے زخموں میں جمع تفریق کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون سا پلڑا بھاری ہے؟ اور ان کی موت کو ایک اور موت آ جاتی ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اپنوں والا ہی بھاری ہے۔ وہ غیروں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور سوچتے ہیں شائد کل کا سورج ایسا نہ ہو جیسا میں نے گزرے کل میں دیکھا تھا یا جیسا میں آج دیکھ رہا ہوں اس بیرونی حملے کے نتیجے میں بہنے والے خون سے شائد میرے ملک کی فضائیں بدل جائیں اور ہمیں اپنوں کے خوف و را پنوں کے ہاتھوں دی ہوئی موت سے نجات مل جائے۔

سو غیروں پر کیا غصہ؟ غیروں سے کیا کہنا زندگی ہی موت سے بری ہو گئی ہے جبھی تو ہر طرف موت ہے اور ایسی موت جو اب محسوس بھی نہیں ہوتی لگتا ہی نہیں موت آئی کیونکہ آج کا دلفریب کھیل ہے ظلم......اور موت۔

☆☆☆

بد سے بدنام برا

ایک انگلش فلم کا سین ہے ایک کالا جیل کے اندر بند ہے اور جب بھی کوئی جرم جیل میں سرزد ہوتا ہے اس کا الزام کالے کے سر لگتا ہے اور اس کے بعد وہ کالا اس قسم کی عادت کا شکار ہو جاتا ہے کہ جونہی اس کو لگتا ہے پولیس کسی کیس کی تفتیش میں جیل میں بڑے غصے سے داخل ہو رہی ہے وہ اتنا نبض شناس ہو چکا ہے کہ پولیس کو دیکھتے ہی ہاتھ کھڑے کر دیتا ہے اور منہ دیوار کی طرف کر دیتا ہے کیونکہ اسے اپنے سابقہ تجربوں سے یہ سبق مل چکا ہے کہ وہ ہی پولیس کی نظر میں مجرم ہے چاہے اس نے جرم کیا ہے یا نہیں۔ یہی حال پاکستان کا ہے، مسلمانوں کا ہے کہیں بھی کچھ بھی غلط ہو ہمارا کام ہے ہم منہ دیوار کی طرف منہ کریں اور ہاتھ اٹھا دیں...... اللہ اللہ خیر صلہ۔ 9/11 سے لے کر ممبئی تک مسلمان دہشت گرد ہیں۔

ہمارا سفر دہشت گردی کا ہے افغان، عراق، فلسطین، کشمیر اور اب لبنان میں جو ظلم ہیں وہ جمہوریت کے فروغ کیلئے ہیں وہاں پر جو وحشیانہ قتل وغارت ہو رہی ہے وہ انسانی فلاح کیلئے ہے...... لبنان سے کینیڈا اپنے سٹیزن اور برطانیہ اپنے انسان نکال رہا ہے...... باقی جو مر رہے ہیں وہ لبنان کے سٹیزن ہیں اور وہ بھلا انسان تھوڑے ہی ہیں وہ صرف مسلمان ہیں اور انسانیت کے جتنے لوازمات ہیں انسانی حقوق کی جتنی گردان ہے وہ سب مسلمانوں کیلئے نہیں ہے مسلمانوں کی جتنی سٹیٹس ہیں ان سب کو بس جمہوری بنانا ہے انہی کے خون سے رنگ رنگ کر اس میں جمہوریت

کے رنگ بھرنے ہیں یہ ہے امریکہ بہادر کا مشن۔

میں ممبئی کے دھماکوں کے حوالے سے بات کرتی ہوں ...... خون جہاں بھی گرتا ہے دل ہمارا بھی کٹتا ہے مگر جب ناانصافی کا بگل بجتا ہے تو وہی دل پتھرا سا جاتا ہے ...... ابھی دھماکے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے کہ انڈیا کو وحی نازل ہوگئی کہ یہ دھماکے پاکستان نے کروائے ہیں انہوں نے فوراً اپنے پاکستان کے ساتھ مرتب کئے گئے منصوبے کینسل کئے G8 میں اشاروں میں پاکستان کو موردالزام ٹھہرایا جب پاکستان نے اپنی صفائی میں بیان دیا تو فوراً انڈیا کی زبان سے نکلا ہم نے تو نام نہیں لیا چور کی داڑھی میں تنکا ہے بھائی ہماری داڑھی میں تنکا نہیں ہمیں عادت ہو چکی ہے دیوار کی طرف منہ کر کے ہاتھ کھڑا کرنے کی۔

ہم نے انڈیا کے ساتھ تعلقات کو ہمیشہ بردباری سے نبھانے کی کوشش کی ہے اس کا ثبوت ہمارا گزشتہ رویہ ہے ہماری گورنمنٹ تو انڈیا کے اداکاروں کی پذیرائی میں بچھی بچھی جاتی تھی، ہماری عوام نے دل قدموں میں رکھا ہوا تھا اس وقت بھی میں نے ایک کالم لکھا تھا کہ انڈیا ہمارے منہ میں اپنے ثقافت اور شوبز کے گلیمر کی چوسنی ڈال دیتا ہے اور ہم اس کو چوستے چوستے خواب غفلت کے مزے لیتے ہیں علاوہ ہمارے ساتھ مخلص نہیں ہے صرف ایک دوستی کا ڈھول بجا رہا ہے اور ہمارے لوگ پاک انڈیا دوستی کا نعرہ لگاتے پھرتے ہیں ...... اور یہ دوستی ایک سراب ہے جو ممبئی میں بم دھماکوں کے بعد چند لمحوں میں ہی نظروں سے غائب ہو گیا ہے۔

ہمارے کابل کے دھماکے بلوچستان میں آج تک ہونے والی تخریب کاریاں، نشتر پارک کے دھماکے، سوئی کا حادثہ، ہم کس کا گریبان پکڑیں، ہمارے پاس بھی نام تھا کہ یہ سب انڈیا نے کروایا ہے مگر پاکستان نے ایک دفعہ بھی ایسے کسی شک کا یا یقین کا اظہار نہیں کیا۔ بردباری سے تحمل سے اسے اندر ہی اندر پی گیا ...... کیا ممکن نہ تھا کہ یہ سب انڈیا کی امداد سے یا اس کی مرضی سے ہو رہا ہے؟ اس میں کیا ناممکن تھا ...... مگر بات ہے منہ اٹھا کر الزام لگانے کی ...... وہ پاکستان سے کبھی نہ ہو سکا ...... پاکستان نے انڈیا کے معاملے میں ہمیشہ بہت نرم سلوک کا مظاہرہ کیا ہے جس

کی اب مذمت ہی کی جا سکتی ہے۔

انڈیا کے اپنے ملک کے اندر کافی انتشار ہے بجائے اس کے کہ انڈیا اس پر قابو پائے وہ ایک کام جانتا ہے اور وہ ہے پاکستان پر نام لگانے کا ایسا کر کے وہ خود اپنی ذمہ داریوں اور نا کام حکومت کے لیبل سے بچ جاتا ہے۔ لفظوں کے ہیر پھیر نے اس دنیا میں ایک ہلچل برپا کر رکھی ہے...... مسلمان کی لڑائی وہشت گردی ہے اور کسی دوسرے مذہب کے حملے وہشت گردی کے خلاف جنگ ہیں...... مجھے اس سوال کے جواب کی تلاش ہے جنگ کہاں سے شروع ہوئی ہے اور وہشت گردی کہاں پر اپنا دامن پھیلاتی ہے؟ کون وہشت گرد ہے اور کون جمہوریت کا مجاہد؟ کون سے بچے مارے جاتے ہیں تو معصوم کہلاتے ہیں اور کون سے بچے خون میں نہائے جانے کے بعد مسلمان اپنے موت آپ مر گیا...... کہلائے جاتے ہیں مسلمان کی موت کو وہشت گردی موت اور کسی دوسرے کی موت کو مظلوم موت......

کون یہ فیصلہ کرتا ہے اور کس کو یہ اختیار ہے کہ وہ یہ ٹائٹل بانٹے۔ بہت سے ایسے ہی سوالوں کی تلاش ہے اور آج کی اس بے سمت زندگیوں میں کسی ایسی سمت کا انتظار ہے جو راستے تو سیدھے کروا دے جو مفہوم تو لفظوں کے ایک کر دے...... سب موتیں موتیں ہوں سب زندگیاں زندگیاں ہوں...... کسی کی موت کا مطلب زندگی نہ ہو اور کسی کی زندگی کا مطلب موت نہ ہو...... اور جو دنیا میں سب سے بڑا خطرہ ہے لوگوں کو اس کی پہچان تو ہو...... جو سب سے اونچا تاج پہن کر چھوٹی چھوٹی نیچ حرکتوں میں الجھا ہے...... اس کو لوگ پہچانیں تو...... اس کو تخت سے نیچے اتاریں تو۔

☆☆☆

میرا ہادی، میرا عبداللہ اور لبنانی بچے

جاپان پر، ہیروشیما پر حملے کی 6 اگست تاریخ بھی آ گئی اسی دن امریکہ نے جاپان کو ناکارہ بنانے اس کی قوموں کو تباہ کرنے اور اس کی نسلوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی تھی اب 6 اگست کے ساتھ جاپان اس پوزیشن میں ہے کہ وہ اس دن کو یاد کرتا ہے اور تمسخرانہ انداز میں امریکہ کو دیکھ بھی سکتا ہے کہ بڑے بھیا نکلے تھے ہمیں تباہ کرنے اور آج ایک زمانے کی محنت کے بعد ہم پھر سر اٹھائے جی رہے ہیں اور بھیا ہم ترقی یافتہ قوم ہیں......تمہارے اتنے بڑے بم نے ہمیں نقصان خوب پہنچایا مگر تم ہمیں تباہ کرنے میں ناکام رہے، ہم نے اپنی محنت سے اپنا دبا ہوا سر پھر سے اٹھا لیا ہے، تم ہمارے بچے ہم سے نہ چھین سکے اور انہیں ہمارے بچوں نے پھر سے زندگی کو جیتا ہے اور غربت کو اور بے بسی کو مات دی ہے۔ جاپان کی ترقی کوئی شک نہیں امریکہ کے منہ پر ایک طمانچہ ہے، کاش یہ طمانچہ مارنے کی ہمت ہمارے افغانستان میں بھی ہو عراق میں بھی ہو فلسطین میں بھی ہو کشمیر میں بھی ہو اور اب مسکین لبنان میں بھی ہو۔ یہ ہمت ہمارا مقدر ہے؟

امریکہ کی ہٹ دھرمی دیکھنا اور اس کی شہ پر پہلے انڈیا اور اب اسرائیل کو معصوموں کے سروں پر ناچتے دیکھنے کی عادت ہو چکی ہے۔ ان کے نزدیک ان کا حساب ناممکن ہے اور ان کی جواب دہی کوئی نہیں کر سکتا مگر کیا قدرت نے ان کی رسی زیادہ ڈھیلی نہیں کر دی ......؟ عام انسان اس طرح کے ظلم ہوتا دیکھ کر ہی (جو مناظر ٹی وی پر دیکھائے جاتے ہیں) کئی کئی راتوں کی نیند سے محروم ہو جاتا ہے۔ بے چینی اس کے جسم کے اندر کئی مہینے بسیرا کر لیتی ہے۔ اپنے بچوں کے مستقبل سے وابستہ خدشے اور غیر یقینی صورتحال اسے کروٹ کروٹ ذہنی مریض بنانے کیلئے کافی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بھیانک جنگ معصوم لوگوں پر جن کا گناہ بھی کوئی نہیں، ان پر مسلط کر دی گئی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ سب لوگ اپنے گھروں میں سکون سے مگر کبھی کبھی کسی ان دیکھے خدشے سے کانپتے لوگ (کیونکہ ان کو یہ اعزاز ہے کہ اسرائیل ان کا ہمسایہ ہے) اپنے اپنے گھروں میں رہ رہے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے بچوں کیلئے خواب بننے سے تو نہیں رکتے ہوں گے۔ جیسے میں اپنے ہادی کیلئے دیکھتی ہوں، جیسے میں اپنے عبداللہ کیلئے دیکھتی ہوں۔ جب میرا ہادی تتلی کے پیچھے بھاگتا ہے تو میں اپنی آنکھوں میں نہ جانے کون کون سے خواب بن لیتی ہوں میں اپنے ہادی کو عبداللہ کو نجانے کتنا بڑا ہوتے دیکھ لیتی ہوں۔ میں نے تصور کی آنکھ سے اپنے ان دونوں بیٹوں کو اپنے جنازے کو کندھا دیتے بھی دیکھا ہے......

مگر یہ کیا تصویروں میں خبروں میں کہیں ماں تو کہیں باپ اپنے بیٹوں کی لاشیں تھامے بیٹھے ہیں چھوٹے چھوٹے بچے جن کو یہ پتہ نہیں کہ اچھا کیا ہے؟ برا کیا ہے؟ جو انگارے اور پھول کے فرق سے بھی واقف نہیں ان کو بے رحمی کی ہر حد پار کرتے ہوئے انگاروں پر پرویا جا رہا ہے۔ ہماری آنکھیں اب اور کتنی تاب لائیں ہمارے دل اور کتنے پتھر دل کے ہوں تو ہم یہ سب ہضم کر سکیں؟ ہم سے یہ سب برداشت ہو جائے مگر کتنا؟ روز دیکھتے ہیں کہیں کوئی باپ تصویر میں دکھایا جاتا ہے بچہ اٹھائے ہوئے جواب سانس نہیں لے رہا جس کو کبھی سانس لیتے دیکھ کر ماں باپ خوشی سے پھولا نہیں سماتے تھے، جس کے ماتھے پر انہیں چاند سورج بنا نظر آتا ہو گا اور کہیں کوئی ماں اونچی

اونچی بال کھولے دہائی دیتی دکھائی جاتی ہے اس بچے کی لاش پکڑے جس کو اس نے لوری دے کر سلایا تھا جس کے خواب میں خوبصورت رنگ بھرے تھے جس کے ساتھ مل کر ماں تتلی پکڑتی تھی جس کے کندھوں پر ماں نے اپنی میت کی چارپائی تصور تصور میں بار ہا دیکھی ہوگی۔ جس کے ہاتھوں پر لگی ہلکی سی کھروچ سے بھی ماں کا دل کتنا ہوگا، اسی بچے کو کسی اندھی گولی سے نہیں بچا سکی نہ ماں، نہ باپ، اسی بچے کو اب بغیر سانس کے بغیر کسی زندگی کے اٹھائے کھڑے ہیں...... ہاں یہ تصویر تو یہی بتا رہی ہے۔

کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی
بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
کبھی ہم خوبصورت تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دور تھے لیکن ہمارے پاس رہتے تھے
نئے دن کی مسافت جب کرن کے ساتھ آنگن میں اترتی تھی
تو ہم کہتے تھے
امی تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی
ہوا کے ساتھ کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

سب بچے ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں تتلیوں کے پرندوں کے پیاری پیاری گائی ہوئی نظموں کے، ان کی آنکھوں میں ان کے سینوں میں انگارے کیسے بھرے جا سکتے ہیں؟ ان خوبصورت لبنانی بچوں کو ہم کیسے بوسہ دے دے کر رخصت کریں اس جہاں سے جس جہاں میں ابھی انہوں نے روشنی کے جگنوں ڈھونڈ نے تھے جس جہاں میں ابھی انہوں نے رنگ برنگی تتلیاں پکڑنی تھیں ...... کیسے؟ اس کیلئے کتنا سنگ دل ہونا پڑے گا اور کتنا بے حس ہونا پڑے گا...... ان بچوں کی خبروں نے ان کی بے قصور موتوں نے ان کی لاشوں پر گرتے ان کے ماں باپ کے بینوں نے، آنسوؤں نے ہر حساس دل کو ایک ایسے کرب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ دنیا ایک اندھیری جگہ کے سوا اور کچھ نہیں لگتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ معصوم لاشے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔ خالی خالی آنکھوں سے دنیا کی سپر پاورز کو دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کیا ہم کو لبنانی ہونے کی اتنی بڑی سزا ملنی تھی؟ کیا ہم کو عراقی ہونے کی اتنی بڑی سزا ملنی تھی کہ ہمارے سینوں میں آگ بھر کر ہم کو اس جہاں سے نکال دیا ہے؟

کیا ہمیں امریکی نہ ہونے کی اسرائیلی نہ ہونے کی اتنی بڑی سزا ملنی تھی کہ ہمیں جانوروں کے بچے سے بھی کم قیمت جان کر کاٹ پھینکا ہے؟ مجھے ان بچوں کی آوازیں سونے نہیں دیتیں ...... مجھے ان کی ماؤں کے بین اور باپوں کی فریادیں دن رات بے چین رکھتی ہیں اور جب میں نیرہ نور کی خوبصورت آواز میں یہ نظم سنتی ہوں ’’ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو: تو میں اونچی اونچی آواز میں روتی ہوں مجھے وہ مرتے ہوئے لبنانی بچے نہیں بھولتے، مجھے ماؤں سے بچھڑتے ہوئے لبنانی بچے نہیں بھولتے میرے سے ان کی شکلیں بھولی نہیں جاتیں کسی میں مجھے اپنا ہادی نظر آتا ہے اور کسی میں میں اپنے عبداللہ کو دیکھتی ہوں میری برداشت میں یہ چیزیں نہیں آرہی ہیں کوئی تصویر دیکھ لوں کتنے دن نظر سے وہ سین نہیں جاتا شائد ہم اپنی بزدلی کے بدلے شائد ہم اپنی بے بسی کے بدلے شائد ہم اپنی کمزوریوں کے بدلے عنقریب پاگل ہونے والے ہیں شائد ہم سب اپنا ذہنی سکون کھونے والے ہیں شائد ہم سب ابنارمل ہونے والے ہیں۔

امریکہ کے ابنارمل اور بے حسی کے رویے نے شائد ساری دنیا کے مقدر میں پاگل پن لکھنا ہے مگر پاگل پن کے نتیجے میں جو بربادی پھیلے گی، جو توازن بگڑے گا تو بچے گا کوئی بھی نہیں ..... جلد پکڑ میں آئیں گے جتنے بھی چالاک ہوں، جتنے بھی ٹیکنالوجی میں مضبوط ہوں جتنے بھی ہتھیاروں سے لیس ہوں ..... ماؤں کی بددعا کی طاقت سے زیادہ نہیں اور میرا یقین ہے جتنے کرب سے ان معصوم خون آلود مردہ بچوں کے چہروں کو دیکھ کر میں روتی ہوں، وہ اس کا 1000 واں حصہ بھی نہیں ہوگا جنم دینے والے ماؤں کے آنسوؤں میں ہوگا۔

تو کیا یہ سب آنسو مل کر سب کرب اکٹھے ہو کر سب آہیں یک جا ہو کر کوئی بھی تختہ الٹنے کیلئے بہت نہیں؟ ..... تو ڈرو اس وقت سے جب ماؤں کی بددعاؤں سے فرش عرش ہل جائے گا اور سب تخت زمین بوس ہو جائیں گے سب اٹھے ہوئے سر زمین پر پڑیں ہوں گے ..... ظلم جب اتنا انتہا کا بڑھتا ہے تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنا گلہ بھی دبا لیتا ہے ..... یہی قانون فطرت ہے اور یہی اس کائنات کا نظام ہے ان بددعاؤں کے آگے کسی کی چالاکی نہیں چلتی پھر۔ فطرت بگڑ جائے تو پھر آسانی سے مانتی نہیں۔

☆☆☆

جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے!

پاکستان میں یہ فقرہ کثرت سے سننے میں آیا اللہ کی رضا.....اللہ کی مرضی.....خدا کو یہ منظور نہیں تھا وغیرہ وغیرہ.....ٹھیک اسی طرح جس طرح عبرتناک شکست کے بعد انضمام الحق نے ساری دنیا کے سامنے اپنی ناقص کارکردگی کا الزام اللہ پر ڈال دیا، جائے نماز پکڑ، تسبیح گھما اللہ اللہ شروع کر دی تھی ٹھیک اسی طرح ہم نے 71ء میں اپنا آدھا ملک کٹوا کر اللہ کا ورد جاری کیا تھا.....میرا خیال تھا ہندی، انگریزی کلچر میں ڈوبی یہ قوم شائد اپنے کرتوت اب بھگوان یا یسوع مسیح کے ذمے لگاتی ہو.....مگر یہ اعزاز پاکستان میں آج بھی اللہ کو ہی حاصل ہے اس فقرے کی کثرت میں کمی نہیں بلکہ شدت آ گئی ہے لوگ اپنے اوپر ہوتے ظلم کو بھی خدا کے کھاتے میں ڈالتے ہیں اور جب خود کسی پر ظلم کرتے ہیں تو اسے بھی اتنی ہی ایمانداری سے خدا کی منشا والی ٹوکری میں انڈیل دیتے ہیں اور ایسا لگتا ہے پاکستان میں سب کام اللہ کر رہا ہے اس کے فرشتے بڑی خضوع وخشوع کے ساتھ پاکستان میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں کیونکہ سب سے زیادہ کام تو انہیں پاکستان میں ہی کرنا ہوتا ہے باقی سب لوگ تو ساری دنیا کے لوگ تو اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں سے جب کوئی اچھا کام ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں انہوں نے محنت کی، پلاننگ کی، عزم کیا، ارادہ باندھا اور خدا نے ان کا ساتھ دیا اگر ان سے کوئی برا کام سرزد ہوتا ہے تو وہ

سوچتے ہیں کہاں خامی رہ گئی کیا کوتاہی ہوئی پلاننگ میں کوئی پختگی نہ تھی، ذہن فوکس نہیں تھا خیالوں میں انتشار تھا محنت میں کمی تھی، جن کو درست کرنے کی ضرورت ہے ورنہ یہ کام یا وہ کام میرے بس کا روگ نہیں ......تو ایسی جگہوں پر خدا اور اس کے فرشتے کچھ زیادہ مصروف نہیں ہوتے اور وہ سارا دھیان، سارا وقت پاکستان میں صرف کرتے ہیں.....کیونکہ وہاں تو جو کرتا ہے رب کرتا ہے رب کی کرنی کی ایک تازہ اور آپ بیتی مثال آپ کیلئے۔

کینیڈا واپسی کی تاریخ تھی 5 ستمبر رات نو بجے کی فلائٹ، اتحاد ایئر ویز ہماری سواری تھی اور لاہور کا نیا جگ مگ کرتا ہوا ایئر پورٹ ہماری روانگی کا مقام تھا، گاڑیوں سے سامان اتارا، پورٹر کو آواز دی وہ حسب معمول بھاگا بھاگا آیا سامان اتارنے سے پہلے اس نے ہلکا سا پوچھا کہاں جانا ہے بتایا کینیڈا اتحاد ایئر ویز سے، اس نے بڑے تمسخر سے کہا وہ فلائٹ تو کل جا رہی ہے ہمارے ہاتھوں کے طوطے اور باقی کے سب پرندے بھی فنا.....گرمی کا عالم، تین بچے ساتھ اور جو رشتے دار چھوڑنے آئے ان میں سے سامان والی وین تو سامان اتار کر واپس بھی جا چکی تھی باقیوں کے ساتھ جتنی گاڑیاں اس کے حساب سے بچے.....سب سے پہلے یہ خیال ذہن میں آیا کہ شائد کل صبح نو بجے کو رات نو سمجھ لیا گیا ہے۔ آپس میں تکرار کرنے سے پہلے سوچا ٹکٹ دوبارہ چیک کر لی جائے ٹکٹ دیکھی ٹائم درست تھا اور ہم نے بھی اسے درست سمجھا تھا بھاگ کر اتحاد ایئر ویز کے آفس گئے وہاں ایک طوفان مچا ہوا تھا لوگ صرف یہ پوچھ رہے تھے کہ اگر فلائٹ delay تھی تو فارم پر ان کے فون نمبر جو لئے جاتے ہیں ان پر اطلاع کیوں نہیں دی جو لوگ دوسرے شہروں سے آئے تھے ان کے رہنے کا مسئلہ، واپس جانے کا مسئلہ۔ منیجر نے نوازش کی اور کہا آپ سب کو ہوٹل میں ٹھہرایا جائے گا اور آپ کا سامان بھی ہوٹل کی گاڑیوں میں پہنچا دیا جائے گا۔ فکر نہ کریں اور یقینا ذکر بھی نہ کریں.....باہر آ کر دیکھا عجیب وغریب قسم کے حلئے میں اس ہوٹل کا سٹاف مصروف عمل تھا جہاں جا کر ہمیں رات گزارنی تھی، انہوں نے پوچھا سامان کون سا ہے بتایا آناً فاناً انہوں نے سامان کو گھسیٹا اور ایک چیز کی طرف بڑھنے لگے جسے وہ بس کہہ رہے تھے اور اس میں بیٹھ کر ہم نے

ہوٹل پہنچنا تھا میں نے سوچا ابو دبئی (conecting flight) مانچسٹر، امریکہ، کینیڈا جانے والے لوگ کیسے اس بس پر بیٹھیں گے جو یقینی طور پر کبھی بس رہی ہو گی مگر اب وہ صرف بس کا پنجر ہی تھی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ابو دبئی جانے والے اور ہمارے علاوہ وہ تین لوگ اور تھے جنہوں نے آگے سے دوسری فلائٹ پکڑنا تھی...... سب اس میں گھس گئے ہم نے بھی سوچا شائد اندر سے یا اتنی بری نہ ہو جتنی باہر سے نظر آرہی ہے مگر اندر حالات اس سے بھی زیادہ برے تھے۔ سیٹیں کم اور لوگ زیادہ۔ جو سامان بس کی چھت پر پورا نہ آیا تو لوگوں کو اٹھا کر پہلے سامان سیٹوں پر رکھا اور پھر اس کے اوپر لوگ بٹھا دیے گئے۔ میں نے سوچا اب کوئی بولے گا...... کوئی آدمی اٹھے گا اور ڈرائیور کا یا اس ہوٹل مینجر کا سر پھاڑ دے گا مگر میرا یہ خیال شائد اتنا باغی تھا کہ عملی نہ بن سکا...... ہوٹل پہنچے...... سارا راستہ دل دھڑکتا رہا کہ بس اتنی ظالم ہے تو ہوٹل نہ جانے کیسا ستم گر ہو گا...... دل کو تسلیاں دیں کہ سب ٹھیک ہو گا یہ جو اتنے سارے لوگ ہیں یہ بھی تو ہماری طرح ہی ہیں......

بس میں گرمی انتہا کی کیونکہ اے۔ سی جیسی کوئی فضول چیز اس میں نہیں تھی گرمی سے اور دھول سے بچوں کو تے آنے والی ہو گئی ڈرائیور نے سگریٹ سلگایا اور رہی سہی کسر پوری کرنے کی کوشش کی۔ ہوٹل گئے تو صرف اے سی کی ٹھنڈک محسوس ہوئی اور دنیا کے سب غم بھول گئے ہوٹل کیسا ہے؟ سروس کیسی ہے؟ کمرے میں کیا ہے کیا نہیں ہے سب بھلا دیا...... صرف بچوں کو رات بھر سلانے کی فکر تھی وہ دور ہوئی۔ یہ خیال تھا کہ صبح چلے ہی جانا ہے...... رات بھر فون آتے رہے کبھی ہوٹل کی انتظامیہ کوئی حکم سنائے کبھی کوئی یعنی ہماری صبح روانگی سے متعلق...... رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ دونوں شائد اسی حساب سے رکھے گئے تھے جس حساب سے بس میں بھر کر بھیڑ بکریوں کو لایا گیا تھا میں نے سوچا کوئی بولے گا کوئی احتجاج کی آواز آئے گی مگر خاموشی...... صبح نو بجے روانگی کا وقت دیا گیا اور رات والی بس سے بھی زیادہ حسین بس دو ڈھائی گھنٹے مقررہ وقت سے لیٹ پہنچی میں نے پھر سوچا شاید ہمارے علاوہ بھی کوئی اور بولے کیونکہ بول بول کر احتجاج کر کر کے ہمارے گلے سوکھ چکے تھے بلکہ یہ لگنے لگا گیا تھا کہ ہم غلط ہیں کیونکہ اگر شادمان کے وویو گارڈز

ہوٹل والے غلط ہوتے تو کوئی اور بھی تو بولتا...... اتحاد ایئر ویز کے دفتر پہلے جانا تھا ٹورنٹو والوں کو وہاں پھینکنا تھا اور باقی کی بھیڑ بکریوں کو ایئر پورٹ لے کر جانا تھا کیونکہ ابو ظہبی کی فلائٹ تو آج بھی جا رہی تھی مسئلہ ہمارا گھمبیر تھا۔ اس قیامت بس میں ایک قیامت برپا تھی کل رات سے بھی زیادہ برا حال یوں بنا کہ بارش نے بھی اس افتاد میں اپنا حصہ ڈالا، لوگوں کا سامان چھتوں پر بھیگ رہا تھا لوگ اندر بھیگ رہے تھے کیونکہ بس کی کھڑکیوں کے شیشے نہیں تھے، ڈرائیور اندھا دھند گاڑی چلا رہا تھا، اندھا دھند اس لئے کہ بس کے وائپر بھی نہیں تھے...... اتحاد ایئر ویز کے دفتر کے آگے بس رکی...... کینیڈا امریکہ جانے والے لوگ اپنی قسمت کا حال اور اپنے مستقبل کا پوچھنے کیلئے اندر گئے ان کے بچے اور عورتیں بس میں ہی تھے۔ ابو ظہبی والے لوگ اپنی فلائٹ مس ہونے کے خوف میں مبتلا تھے......

میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہمارا سامان بس کے اندر تھا مگر بہت سے لوگوں کا اوپر چھت پر تھا بری طرح بھیگ رہا تھا، میں نے پھر سوچا یہ لوگ اندر جا کر اتحاد ایئر ویز والوں کو دکھاتے کیوں نہیں کہ ہمارا سامان تباہ ہو گیا ہے اور باہر آ کر دیکھو اس بس میں امریکہ کینیڈا میں کوئی اپنے جانوروں کو بھیجنے کا رسک نہ لے اور تم لوگوں نے اسے انسانوں کی سواری بنا رکھا ہے؟ تم لوگ اسے ٹھیک سواری سمجھ رہے ہو یا ہمیں جانور؟ تم نے کیا سمجھ کر اس ہوٹل کا اور اس سواری کا انتظام کیا ہے۔ مگر یہ میرے سوال تھے میرے اندر رہے وہ پاکستانی لوگ تھے جس میں اکثریت دبئی جانے والے لیبر کلاس کی تھی...... وہ پاکستانی تھے ہم بدل گئے تھے ہمیں اپنے حقوق سے آگاہی تھی ہمیں کینیڈا میں رہتے رہتے اپنے آپ کو انسان سمجھنا آ گیا ہے اپنے حق اور ان کی جنگ لڑنا آ گئی ہے...... ہمارا سامان بس سے اتارا گیا...... جب میرے شوہر ایئر ویز کے مینجر کو بازو سے گھسیٹ کر باہر لائے اور اسے دکھایا کہ یہ بس ہے جس میں ہم آئے ہیں اور یہ ہماری حالتیں ہیں اس سے اندازہ لگا لو کہ رات بھر ہمارے قیام و طعام کا کیا حال ہوا ہوگا...... مینجر ہلکا پھلکا سا ڈرا، اس نے معذرت کی، ہوٹل کی بابت اپنی کم علمی کا اظہار کیا، ہمیں باقی ریوڑ سے علیحدہ کیا...... ہمارے لئے

لاہور کے شاندار ہوٹل پرل کانٹینینٹل میں اگلی دو راتوں کیلئے کمرہ بک کروایا۔ پی سی کی عالی شان بس ہمیں لینے آئی ...... ابو ظبی کی فلائٹ کی سواریاں اسی بس میں ایئر پورٹ جا رہی تھیں جو بھی بس رہی ہوگی، میں نے انہیں کہا آپ اس مینیجر کو کیوں نہیں بتاتے کہ آپ کا سامان برباد ہوگیا ہے آپ اس مینیجر کو کیوں نہیں بتاتے کہ کل رات سے ہمارے ساتھ جانوروں کا سلوک ہو رہا ہے آپ لوگ چپ نہ رہیں اپنا احتجاج اندر جا کر ایئر ویز کے آفس میں ضرور کریں ...... ایک باریش بزرگ بولے بیٹی ہمارے نصیب میں پاکستان کا ایک دن کا قیام اور ایک دن کا اور کھانا لکھا تھا اس میں اس مینیجر کی کیا غلطی؟

میں نے کہا انکل آپ کا سامان سارا بھیگ گیا ہے اتنی گندی بس کی بات پر تو آپ لوگ بولیں، ایک نوجوان پیچھے سے بولا، باجی جو اللہ کی مرضی، اللہ کی یہی رضا تھی ...... ایک اور بولا اگر جو لوگ اندر آفس میں گئے ہیں ان کو دیر ہے تو ہم بھائی بھائی مل کر خود ہی ٹیکسی کرواتے ہیں اور ایئر پورٹ چلتے ہیں یہ نہ ہو آج کی فلائٹ بھی مس ہو جائے......

میں خاموش ہوگئی...... میں اس بھائی کو کہنا چاہتی تھی اگر تم آج اس ایئر ویز کو سبق سکھانے کیلئے اپنی فلائٹ مس بھی کر دو تو شائد یہ آئندہ کسی انسان کے ساتھ جانوروں والا سلوک کرنے سے پہلے اتنے بے جگر نہیں ہوں گے، مگر میں خاموش رہی آئندہ کے بارے میں کسی نے سوچا ہے؟ اگر یہ سوچ پیدا ہو جائے کہ وقتی فائدہ ذاتی مفاد اور سطحی ترجیحات کو پس پشت ڈالنا ہے، بہت آگے کے مستقبل کو سوچنا ہے۔ آنے والے کسی کو یہی دکھ نہ ہو، یہی جھمیلے نہ ہوں جن سے ہم گزر رہے ہیں تو شائد ہم اس دن اللہ کی نوکری میں بھی اپنے صبر، اپنے الزامات، اپنی کوتاہیاں، اپنے غم اور اپنی ہڈ حرامیاں ڈالنی چھوڑ دیں گے۔ اگر ہمیں اپنے حق کا پتہ چل جائے اور اپنے حق کی جنگ لڑنا آ جائے تو شائد اس دن ہم اللہ کا بوجھ بھی کم کر دیں گے اور ان حکمران نما لوٹوں لفافوں سے بھی نجات حاصل کر لیں گے۔

☆☆☆

سب کا ایک سا سورج کیوں نہیں ؟؟؟

کبھی کبھی دل اور دماغ بڑی متضاد خبروں میں الجھے رہتے ہیں اور بعض اوقات اتنا الجھ جاتے ہیں کہ دل دماغ کو اور دماغ قلم کو کچھ سمجھا نہیں پاتا۔ یہی کچھ پچھلے دنوں میرے ساتھ ہو رہا تھا ہر خبر بکھری ہوئی اور ہر چیز الٹی، اسی وجہ سے اتنے دن گزر گئے اور لکھا بھی نہیں گیا، سب رابطے منتشر تھے ایسی ہی الجھی الجھی باتیں آج بھی ہیں سوچا ایسے تیسے ہی انہیں شیئر کر لوں۔

دماغ کی خرابی کا سلسلہ شروع ہوا ایک لیڈی ڈاکٹر کی بے حرمتی کی خبر پڑھ کر......

عورتوں کی بے حرمتی کوئی نئی بات نہیں نیا اور اندوہناک پہلو تھا، ایک لیڈی ڈاکٹر۔ ہماری پاکستانی مائیں اور باپ اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم خاص طور پر جب ڈاکٹر یا ٹیچر بنانے کا سوچتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں انہوں نے اپنی بچیوں کو ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے، جہاں پہنچ کر وہ ساری دنیا کی عزت اور تعریف کماتی ہیں ایسا کر کے وہ سوچتے ہیں انہوں نے اپنے ماتھوں سے بیٹی پیدا کرنے کا داغ ہٹا دیا ہے۔ مگر اس خبر کے بعد یہ داغ کچھ اور گہرا ہوتا نظر آیا...... اس لیڈی ڈاکٹر کیلئے دل بہت اداس ہوا سوچا عورت جہاں بھی پہنچ جائے جو بھی مقام حاصل کر لے اس کی عزت اسی طرح نازک کی نازک ہی رہے گی، شعبے جتنے مرضی مضبوط ہو جائیں، مگر عزتوں کا یہ کھیل کچی مٹی جیسا ہی رہے گا، عورت کی عزت ایسے ہی بند مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح ہی رہے گی۔ اس دن دل نے سوچا ایسا مردوں کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا یا تنے پکے کھروں میں کیوں بیٹھے ہوتے ہیں ان کے گرد قدرت نے اتنی گہری چادریں کیوں تان رکھی ہیں یہ سوچتے سوچتے اتنے دن گزر گئے اور آج ایک خبر میں نے سنی ایک 12 سال کے بچے کے ساتھ اس کی لیڈی ٹیچر نے زیادتی کی۔ خبر امریکہ یا کینیڈا کے کسی سکول کی ہے...... ٹیچر کو 10 سال کی سزا ہوئی۔ اور جب ٹیچر رہا ہوئی تو اسی بچے کے

ساتھ اس نے شادی کر لی ..... اب یہ نہیں پتہ کہ بچے نے اپنے آپ کو باقی لڑکیوں کے قابل نہ سمجھ کر یہ شادی کی ہے یا ٹیچر نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کیا ہے..... مگر یہ خبر سن کر دل کو ہلکی سی تسلی ہوئی کہ مردوذات کے ساتھ بھی عورت کبھی کبھی زیادتی کر سکتی ہے مگر زیادتی کر کے وہ سزا بھی بھگتی ہے اور پھر کفارہ بھی ادا کرتی ہے۔ اور یہ مغربی ممالک میں ہی ممکن ہے۔

ابوغریب کی جیل سے نکلے اور چھپے ایک بہن کے خط کو پڑھتی ہوں جو لکھتی ہے ہماری دن میں 9 یا 10 مرتبہ سب کے سامنے بے حرمتی ہوتی ہے، ہمیں کپڑے پہننے کی اجازت نہیں ، ہمارے پیٹوں کو بندروں اور خنزیروں نے اپنی اولادوں سے بھر دیا ہے شرم و حیا سے لپٹی ان عورتوں کے جسم اور عزت کی کوئی قیمت نہیں جب ان سے منہ کالا کر کے یہ گورے منہ والے لوگ اٹھتے ہیں تو پاس ایک ڈالر نہیں رکھ کر اٹھتے۔ یہ عورتیں اپنے چہرے اور جسم ڈھکے رکھتی تھیں انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کہ اتنے مردان کے جسموں کو ہاتھ لگا سکیں گے یا کبھی کوئی ایک نامحرم بھی کبھی ان کی جھلک دیکھ سکے گا مگر اس کے برعکس وہ دنیا جہاں میں ایک تماشا بنے کھڑی ہیں اپنی خواہشات کے برعکس۔ دوسری طرف وہ عورتیں ہیں جو اپنے جسم کی نمائش لگاتی ہیں ..... مس ورلڈ کی دوڑ میں اپنا آپ لوگوں کو دکھاتی ہیں ..... جو فلموں میں اپنی کھلم کھلا نمائش کرتی ہیں ..... جسم کا کھیل نہ صرف ان کی خواہش ہے بلکہ پیشہ بھی ہے اور اس کے بعد بھی وہ حرمت کی اس منزل پر کھڑی ہوتی ہیں جہاں ان کے ساتھ کھانا کھانے کی قیمت 10 لاکھ اور ساتھ بیٹھنے کی قیمت 5 لاکھ ہے آج جب عزت کی پاسدار عورت کا جلوس نکلتا ہے اور نمائش کرنے والی عورت کو عزت کی اعلیٰ مسند پر بٹھایا جاتا ہے..... ایسے میں کون انصاف کرے اور کس کے آگے رونا رویا جائے۔

کبھی لگتا ہے محمد بن قاسم کی طرح کوئی سپہ سالار ہو گا جو ایک بیٹی کی آواز پر دوڑ پڑا تھا...... مگر دوسرے ہی لمحے احساس ہوتا ہے کہ یہ دوڑ بیٹی کو بچانے کیلئے نہیں ہو گی بلکہ کسی بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کیلئے ہو گی اور وہ کوئی محمد بن قاسم نہیں ہو گا..... ایسے بیٹے ماؤں نے جننا بند کر دیئے ہیں اب تو جو مسلمان ہے وہ یا تو بزدل ہے یا انتہا پسند ہے کیونکہ جب کوئی اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر کسی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے یا کسی ظلم کا بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے اس پر انتہا پسندی کا لیبل

چپک جاتا ہے کیونکہ جو ہمارے جذباتی لوگ ہیں وہ معصوم ہیں بھولے ہیں آسانی سے شکنجے میں پھنسنے والے لوگ ہیں ......اور جو بہت زیادہ سیانے ہیں وہ ایک طرف تو اپنی جیبیں گرم رکھتے ہیں اچھل کود کر پیسہ کماتے ہیں اور دوسری طرف یہ بیان دیتے ہیں ......اسلام کو انتہا پسندی کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلت کا سامنا ہے تو آئیے جناب ......اپنی اعتدال پسندی کے ساتھ آگے آئیے......ناچ گانا چھوڑیئے اور عراق جا کر، کشمیر جا کر، فلسطین جا کر کسی ایک عورت کی عزت بچا لائیے۔ اتنا نہیں تو اپنے ملک کے اندر کسی ایک جھوٹے کا، کسی ایک ملک کے چور کا منہ کالا کر دیجیے۔

آج جب ظلم اتنا انتہا کو پہنچ چکا ہے، کرپشن اتنی منہ زور اور بے شرم ہو چکی ہے ایسے میں مسکین مسلمان کو تلقین کی جاتی ہے تو اور دب جا......تو اور اپنا منہ بغل میں چھپا لے......کسی بچے کے نیزے پر چڑھنے سے جو تیرا دل آج بھی دھڑکتا ہے اس کو سلا دے، کسی عورت کے لٹ جانے پر تو رات رات بھر جاگتا ہے تو ایسی بے آرامی کو بھی خدا حافظ کہہ دے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کشمیر ڈے پر بسنت کیسے جوش و خروش سے منائی جاتی ہے؟ کسی کشمیری کے خون کا رنگ مٹ نہیں جاتا جب بسنت کے رنگ فضاؤں میں چھاتے ہیں؟ کسی عزت لٹتی کشمیری عورت کی چیخیں دب نہیں جاتیں جب بسنت کا ڈھول بجتا ہے؟ سب رقص کرتے ہیں سب پاکستانی جھومتے ہیں صاحب صدر بسنت کی رونقوں میں اپنا حال جیتے ہیں نہیں جانتے کہ ایسا کرنے سے وہ اپنا وجود آنے والے دنوں میں کتنا سیاہ کر رہے ہیں شائد وہ تاریخ کو کالا کر دیں بسنت کے ان رنگوں سے......ان دو پل کی خوشیوں سے وہ آنے والے کل کو کس کرب میں مبتلا کر رہے ہیں یا نہیں آج کوئی بتانے والا نہیں اور آنے والے کل میں وہ سننے کیلئے اس دنیا میں سدا نہیں رہنے والے۔ کبھی تو یہاں ایک ایسا سورج اگے گا جو ساری دنیا کے انسانوں پر مساوی روشنی پھینکے گا......سب کیلئے ہوا میں برابر کا حصہ ہوگا......کبھی تو دھرتی وہ دن دیکھے گی۔

☆☆☆

لطائف کے وقفے میں کالم بھی ہوگا

لطیفہ نمبر ایک: استاد کلاس سے گراہم بیل کا سب سے زیادہ ممنون اور احسان مند کون ہے؟ کوئی سے تین اشخاص کے نام لیں؟ ایک بچہ کھڑے ہوتے ہوئے انتہائی بے چینی سے۔۔۔ جناب صدر بش۔۔ جن کے ایک ٹیلی فون گھمانے سے تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے ملک گھوم جاتے ہیں۔ دوسرا بچہ ہمارے صدر زرداری صاحب جن کے ٹیلی فون سے لائیو ٹاک شو میں شامل ان کے وزراء کسی بھی قسم کی شراکتی یا صدارتی رہنمائی سے محروم نہیں رہ سکتے۔ اور ایک اور ڈرتا ڈرتا بچہ۔۔ سر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔۔ مجھے پہلے پورا تحفظ دیا جائے، پولیس پروٹیکشن دی جائے۔۔۔ استاد نے اکتائے انداز میں کہا اچھا بابا تمھیں ہر طرح کی حفاظت کا یقین دلایا جاتا ہے۔۔ سر میرے گھر والوں کی بھی حفاظت کا۔۔ ہاں بابا ہاں۔۔ سب کی۔۔ سر میرے محلے والوں کی بھی۔۔۔ ہاں ہاں ہاں۔۔۔ پھر خوف سے کانپتے ہوئے سر جی۔۔ جناب الطاف بھائی صاحب کو۔۔۔ اگر گراہم بیل فون نہ ایجاد کرتا تو لندن سے کراچی اور کراچی سے پورے پاکستان کی سیاست میں مداخلت کیسے ممکن تھی؟ اتنی موتوں کا افسوس کس نے کرنا تھا، کتنی بیماریوں کی عیادت سے لوگوں نے محروم رہ جانا تھا، لوگوں کی خوشیوں میں جو بذریعہ فون الطاف بھائی شریک ہوتے ہیں، وہ سب کیسے ممکن ہوتا تھا۔۔ رونا دھونا، اوڑھنا بچھونا، لڑنا مرنا، خوشی غمی، دکھ سکھ۔ تقریریں، مرثیے، گانا بجانا اور سر سنگ۔ ان سب میں الطاف بھائی ایک فون سے شامل ہو جاتے ہیں۔۔ سب سے زیادہ گراہم بیل کے وہ ممنون و مشکور ہونگے۔

دوسرا لطیفہ: ایک اخبار نویس دوسرے سے الطاف بھائی نے اسفند یار ولی پر حملے کی

مذمت کی ہے اور انہیں حسب معمول فون پر یہ روح پرور پیغام دیا کہ وہ اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھیں، زیرو مائن ان کا گھر ہے اور وہ اسے اپنی پناہ گاہ سمجھیں اور ان کے بندے اسفندیار ولی کی بھرپور حمایت کریں گے۔ دوسرا اخبار نویس جو اس اشتہار کی پیشکش کو نہایت غور سے پڑھ رہا تھا، تیزی سے پوچھتا ہے تو کیا یہ پیشکش صرف غیروں کے لئے ہے؟ کیا مطلب؟ الطاف بھائی دھاڑے ،میرا مطلب جو آپ کی حفاظت نہ کر سکا۔ جو بندے آپ کی پناہ گاہ کے لئے ناکافی ہیں جس کی وجہ سے آپ پاکستان چھوڑ کر لندن میں شیلٹر لئے بیٹھے ہیں۔ تو کیا یہ پیشکش صرف اوروں کے لئے ہے۔اپنے لئے میں اور میرا لندن؟ ہنسی نہیں آئی۔؟ شائد یہ لطیفہ تھا بھی نہیں۔

ایک اور لطیفہ سناؤں جو شائد حکمرانوں کے لئے تو ہو مگر ہمارے لئے نہیں ہے۔ مجھے، آپ کو، ہر عام آدمی کو اس پر ہنسی نہیں آئے گی۔ صدر صاحب نے فرمایا۔۔ کشمیری دہشت گردوں اور بھارت سے ہمیں کوئی خوف نہیں اور امریکہ امن کی فاختہ اور دنیا میں اس مثالی امن کا سہرا جناب صدر بش کے سر۔ ہمیں آپ کو انگریزی اخبار کو سب کو یہی سمجھ آئی مگر وزیر اطلاعات جنہیں حقیقت میں وزیر بیوٹی پارلر ہونا چاہیے نے انکشاف کیا کہ امریکہ کا میڈیا جناب صدر زرداری کے انٹرویو کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہے۔ان کا یہ مطلب نہیں تھا تو کیا اسے جنرل نالج کی کمزوری سمجھا جائے، اعصابی کمزوری سمجھا جائے، دماغی کمزوری سمجھا جائے یا فقط انگریزی کی کمزوری سمجھا جائے۔۔۔ جیسے ایک بزرگ خاتون نئی نئی کینیڈا آئی تو دوران سیر ایک کتا ان کی طرف لپکا، وہ بتاتی ہیں۔۔ پرے پرے کی انگلش یاد کرتے کرتے وہ کتا انہیں کاٹ گیا۔ کتے نے کاٹا تو پرے کی انگلش بھی یاد آ گئی۔۔ تو کیا ہمارے صدر کی گرامر بھی اسی دن ٹھیک ہوگی جب بہت سارے کتے مل کر ہمارے ملک کو کاٹ چکے ہونگے۔

ان سب کمزوریوں سے ایک اور کمزوری یاد آئی۔۔ اخلاقی یا کرداری۔۔۔ جب سارہ پالن کو دیکھ کر ہمارے صدر زرداری نے صبر کا دامن چھوڑ دی، یا بہت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا، پتہ نہیں کیا تھا مگر جو ہمارے حکمران وزیر کہتے ہیں ہم تو ان کی بات سنتے اور مانتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ

سب رسما تھا۔۔ (کچھ ناقدین اسے رسم بھی کہہ رہے ہیں) فوزیہ وہاب اس قصے کی صفائی میں کہہ رہی تھیں ان ملکوں میں اس طرح کی تعریف کوئی معیوب بات نہیں بلکہ اچھے اخلاق کے زمرے میں آتا ہے۔۔

فوزیہ کے ویسٹرن ملکوں کے راج کو دیکھ کر مجھے یہاں کینیڈا کی ایک بھولی بسری خبر یاد آ گئی، ایک ایرانی کو جو نیا نیا کینیڈا آیا تھا ایک لڑکی کو بلا اجازت چومنے پر چارج کر دیا گیا تھا۔۔ جب اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا تو اس نے انتہائی معصومیت سے کہا۔۔اس لڑکی کی ٹی شرٹ پر لکھا تھا KISS ME تو میں نے سوچا یہ تو کینیڈا ہے، آزاد ملک، یہاں ان باتوں کا کیا فرق پڑتا ہے؟ شائد وہ ایران کے کسی گاؤں سے آیا ہوا سیدھا سادھا جوان بھی اپنی اس جسارت کو good manners ہی سمجھتا رہا اور اسے پتہ بھی نہ چلا اور وہ سزا کا مستحق ٹھہر گیا وہ تو پہلی پہلی بار ایران کے دور دراز گھٹے گھٹے علاقے سے کینیڈا کی کھلی ہوا میں پہلی بار آیا تھا مگر زرداری صاحب ۔۔؟ مگر شائد وہ بھی شریک حیات کی گھٹن سے پہلی بار ہی کھلی ہوا میں باہر آئے تھے۔ ورنہ تو ان کے آگے آگے ایک ایسا تو انا شجر رہتا تھا، جس کے پیچھے آدھی سے زیادہ قوم تھی اور اتنی بھیڑ میں ان تک ہوا پہنچتی نہیں تھی، جب سب بھیڑ بھاڑ چھٹی تو انہوں نے اپنے آپ کو سارہ کے سامنے پایا تو وہ بھی اس ایرانی لڑکے کی طرح اسے آزاد ملکوں کے آزاد سے ادب و آداب ہی سمجھ بیٹھے اور ناحق اتنا ہنگامہ برپا ہو گیا، بھلا وہ بھی مان جاتے کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ یہ آزاد ملک ہے یہاں ایسی باتیں کرنا یا کہنا برا نہیں سمجھا جاتا۔ نہ جانے یہ لطائف کے وقفے میں کالم تھا یا کالم کی بہتی ندی میں سے لطیفے کے جھرنے پھوٹتے رہے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیا تھا؟ مگر اس بات کا یقین ہے کہ یہ بے یقینی بہت وثوق سے ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کہاں اور کب؟ ۔سوچیے ان سوالوں کے درمیان ہم بہے جاتے ہیں اور بس بہے ہی جاتے ہیں۔ اللہ حافظ و ناصر۔

☆☆☆

ایک سی شکلیں ایک سی آواز

نجف بغداد کے شمال 160 کلومیٹر پر واقع ہے، نجف عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں زمین سے اونچی جگہ جہاں پانی نہیں جا سکتا، اس کو امن کی وادی اور وادیٔ اسلام کہا جاتا ہے اور دنیا کا سب سے بڑا قبرستان جس میں 2 ملین قبریں ہیں وہاں پر ہے جہاں مسلمان خاص طور پر شیعہ برادری دفن ہونے کو اعزاز سمجھتی ہے۔ اور عام خیال یہ ہے کہ یہاں دفن ہونے والے جنتی ہیں، سو جنت کی اس لالچ میں مردے دنیا کے ہر کونے سے دفن ہونے آتے ہیں اور اس چیز کی باقاعدہ یہاں انڈسٹری ہے اور یہ corpse traffic کسٹمز اور ہیلتھ منسٹری کے اندر آتی ہے جو مردوں پر ڈیوٹی لگاتے ہیں اور ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ ان کی epidemic سے prevention کی نگرانی کرتا ہے سو یہ ملکی آمدنی میں ٹھیک ٹھاک اضافے کا باعث بنتا ہے یعنی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں لاشوں پر پیسہ بنایا جاتا ہے اور ان کیلئے سب آدمی مر کر ہاتھی ہوتے ہیں یعنی سوا لاکھ کے ہو جاتے ہیں روز کی اوسط 100 لاش۔ اس ملک کی آبادی 5,60,000 ہے۔

19 ویں صدی کا سب سے بڑا اسلامی مرکز ہے۔ یہاں چین، انڈیا، لبنان، پاکستان اور ایران سے ہر سال Half a million لوگ علم کی تلاش میں آتے ہیں۔ امام علی ابن ابی طالب ہمارے چوتھے خلیفہ یہاں امام علی مسجد میں دفن ہیں یہاں اور بھی کئی نبیوں کے مزار ہیں۔ تقدس سے لبریز یہ زمین ہم سے پوچھتی ہے میرا اپنا کون ہے اور غیر کون ہے؟ ہم کبھی اپنا منہ دیکھتے ہیں کبھی ایک دوسرے کا مگر کوئی جواب بن نہیں پاتا ہم ایسے گر چکے ہیں کہ اپنے مذہبی

اثاثوں کو بچاتا تو ایک طرف ہم انہیں احترام تک دینے سے معذور ہیں قومیں جب اپنی شناخت دیتے شہروں اور مقامات کی حرمت بھول کر صرف ذات کی بقا اور شخص کی پیروی میں پڑ جاتی ہیں ان کا کچھ نہیں بچتا پہلے ان کی شناخت ان سے چھنتی ہے پھر ان کی ذات۔

آج ہم کیوں پریشان ہیں اور کس بات کی دہائی ہے؟ نجف پر امریکی فوج کا حصار اس میں کیا انوکھا ہے کیا ہم نہیں جانتے ہم کون ہیں دنیا تو حیران ہو، ہم کیوں ہوں؟ کیا ہمیں نہیں پتا کہ ہم اپنی عزتوں سے پہلے خود کھیلتے ہیں پھر دوسرے کے آگے رکھتے ہیں اور اس کے بعد شور مچا دیتے ہیں ہاہاکار..... بڑی لرزہ خیز ہاہاکار، ہم مظلوم بننے میں ماتم نہیں لگاتے۔ نجف کا محاصرہ کون سی انوکھی بات ہے؟ امام علی مسجد پر کون سی پہلی بار آفت ٹوٹی ہے؟ 1991ء میں صدام نے اس پر حملہ کیا اپنے مخالفین کو عبرت کا نشان بنانے کیلئے اور جو لوگ اس زعم میں تھے کہ ہم نے مسجد میں پناہ لی ہے انہیں بھون ڈالا، اس دن بھی مسجد کا نہ صرف جسم ہی زخمی ہوا تھا بلکہ روح بھی گھائل ہو گئی تھی۔ وہ روح آج تک گھائل ہے مگر اب وہ اتنا حیران نہیں ہوتی پھر بھی کبھی کبھی پوچھ لیتی ہے۔

کون سا دشمن ہے میرا؟
کون سا ہمراز ہے؟
سینکڑوں چہرے ہیں لیکن آشنا کوئی نہیں
ایک سی شکلیں ہیں سب کی
ایک سی آواز ہے

29 اگست کو امن کی وادی میں اسی مسجد کے باہر کار میں بم دھماکہ ہوا، 95 لوگ اور سو گئے۔ اس سے پہلے یہاں سے تھوڑا آگے ایک جگہ جسے صدام کی حکومت نے سکیورٹی زون ڈکلیر کر کے عام پبلک کے لئے بند کر رکھا تھا، وہاں 3 مئی 2003ء کو ایک اجتماعی قبر ملی جس میں عورتوں اور مردوں کو دفن کر دیا گیا تھا..... اے وادیٔ اسلام اے امن کی وادی! دیکھتی جا! اور سہتی جا! پہلے اپنوں کے ہاتھ شامت آج غیر تجھے بے حرمت کرنے نکلے ہیں تو کیا ہمارا شکوہ کرنا بنتا ہے؟

24 مئی 2004ء Mortar Fire سے مسجد کے گنبد کو نقصان پہنچا اور اب اگست 2004ء میں الصدر اس کے اندر پناہ گزین ہے کیا امریکی فوجیں اس مسجد کی حرمت میں اس کو معاف کر سکتی ہیں؟ نہیں اس قوم سے اور اس فوج سے یہ امید...... کیسا دیوانے کا خواب ہے ابو الغریب کی جیلیں کانپ اٹھی تھیں ان کی انسانی تقدس کی حفاظت کو دیکھ کر (ہا) ۔ جنہوں نے عورت کو بے حرمت کر دیا ہو وہ مسجد کی لاج نبھائیں گے؟ کیونکہ میرے نزدیک عورت کی عزت کسی بھی مسجد کی عزت سے کہیں زیادہ ہے جو عورت کی عزت نہ جانے وہ مسجد کو کیا سمجھے؟

اور جو اپنے ہی مسجد کو معاف نہ کریں تو امریکہ جیسے غیر کیسے کریں؟ اس مسجد کو تو اپنے پرائے کسی کی پہچان نہیں کیوں کہ اس سے تو سب کا سلوک یکساں ہے، تو دیکھیں اس لاشوں کا کاروبار کرتے شہر امن کی اس وادی، حضرت علیؓ کی آرام گاہ، آیت اللہ خمینی کی پناہ گاہ اسلامی تعلیمات کا مرکز ہماری اہم شناخت کس طرح ان مردوں کی حفاظت کرتا ہے جو نہ جانے کس کس مان سے یہاں دفنانے کا کہہ کر مرتے ہیں وہ سکون سے مر جاتے تھے یہ سوچ کر کے ہم تو وادی اسلام میں دفن ہوں گے اور اس کے بعد بھی سکون سے اس آخری آرام گاہ میں آرام کریں گے...... کیا اب ایسا ممکن ہے؟ شائد پہلے بھی نہیں تھا مگر اب تو......

کبھی اپنوں کے ہاتھوں سے کبھی غیروں کے ہاتھوں سے نصیب تو ایسے ہی جلتے ہیں پھر ایک مقام پر بے بسی اور بے چارگی کی انتہا پر سب اپنوں سب غیروں کی شکلیں ایک سی ہو جاتی ہیں ۔ کیونکہ ان کے ہاتھ ایک جیسے ہوتے ہیں ...... اور اسی مقام پر اسی نقطے پر تنزلی کا سفر شروع ہو جاتا ہے اور یہ سفر کبھی مکمل تباہی کی منزل کو پکڑتا ہے اور کبھی دوبارہ نقطہ عروج کو چلانا شروع ہو جاتا ہے ہماری مسافت کا ابھی کچھ طے نہیں ہاتھ کھلے ہیں دعا کیلئے اور نظریں آسمان کو تکتی ہیں کیونکہ انسان مایوس کرتا ہے خدا نہیں......

☆☆☆

کون انصاف کرے، حشر بپا کیسے ہو

عراقیوں کے ہاتھ اغوا ہونے والے فلپائنی ٹرک ڈرائیور کی واپسی پر دل دو طرح سے دھڑکا۔ ایک خوشی سے اور ایک احساسِ کمتری اور حسد کے ایک نامعلوم جذبے سے۔ خوشی تو ظاہر ہے اس بات کی تھی کہ ایک بے گناہ جو کہ آٹھ بچوں کا باپ تھا جس کی محنت سے نہ صرف اس کے گھر والے مطمئن تھے بلکہ وہ اپنے ملک کو سالانہ کئی لاکھ ڈالرز زرمبادلہ کی صورت بھیجتا تھا ایسے محنتی انسان کیلئے سارا ملک تڑپ اٹھا۔ اس کا اغوا ایک قومی مسئلہ بن گیا اور بچنے کے بعد، اپنے survival کے بعد وہ ایک ہیرو کا رتبہ پا گیا اس ساری کہانی میں بظاہر کوئی حسد کرنے والی یا دکھ والی بات نہیں، مگر غور کریں تو بہت کچھ محسوس ہو گا، جس میں ہماری بے وقعتی، ہمارا حد سے زیادہ ارزاں ہونا، ہماری لاشوں کے بے معنی، بے مول ڈھیر، بہت کچھ نظر آئے گا، صرف دیکھنے والی آنکھ ساتھ رکھیں اپنے سارے وجود کو آنکھ بنا کر دیکھیں وہ سب نظر آئیگا جو میں دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے لگا وہ فلپائنی GULLIVAR ہے اور ہم مسلمان، ہم پاکستانی بونے ہیں، جن کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں، کبھی ہم آپس میں ایک دوسرے کو کاٹ پھینکتے ہیں معمولی معمولی اختلافات پر، روٹی کیلئے، زمین کے بے جان ٹکڑے کیلئے، بے حس نظریوں کے لئے، کسی کو خوش کرنے کیلئے، کسی کو ناراض کرنے کیلئے اور کبھی ہم ایک دوسرے کے سودے کبھی ملکی مفاد اور کبھی مذہبی مفاد کے نام پر کرتے ہیں۔ مگر

ہماری تاریخ ہمارا کل اور ہمارا آج ایک ہی بات ثابت کرنے پر تلا ہے کہ انسان اس معاشی نظام کی منڈی میں بکنے والی سب سے سستی جنس ہے منرل واٹر سے سستا انسانی لہو اور روٹی کے ٹکڑے سے سستی انسانی بوٹی ہمارے ہاں ملتی ہے کسی کو چاہیے تو بولو۔

اس فلپائنی ڈرائیور کے پاس کون سا خاص خون تھا کون سی خاص جلد تھی، کون سا خاص دماغ تھا، کون سے نرالے بچے تھے؟ کون سی قیمتی بیوی تھی؟ کون سا آسمان سے اترا ملک تھا؟ کون سا ایسا دل تھا؟ کیا تھا اس کے پاس؟ جو اس کا ملک پورے کا پورا ملک اسے سر دھڑ کی بازی لگا کر موت کے منہ سے بچا لے گیا۔ امریکہ صاحب کے منہ در منہ ہو گیا انہوں نے اپنی خارجی پالیسی، اندرونی حالات سب کو پس پشت ڈال دیا ساری دنیا کو محسوس ہوا کہ ایک انسان اغوا ہوا تھا ایک پوری کائنات اغوا ہوئی تھی، انسان کی اہمیت سب کو پتہ چلی۔ پتہ لگا انسان ہوتا کیا ہے ورنہ ہم تو یہ سمجھنے لگ گئے تھے انسان شرف اور بش کے بلٹر ڈ ٹیبل پر پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے گیند ہیں جنہیں وہ گھما گھما کر پھینکتے ہیں۔ یہی احساس رہ گیا تھا کہ انسان وہ جنس ہے خاص کر کے مسلمان کہ جب جی چاہا کسی کردہ یا نا کردہ گناہ کی پاداش میں توپوں کے دہانوں پر، جہازوں کے مقابل کبھی صحرا میں تو کبھی پہاڑوں میں لقمہ بش بنتی رہے۔

وہ دہشت گردی جو ہو چکی وہ دہشت گردی جو ہونے کو ہے سب کا ایک ہی مجرم اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہوا ایک مسلمان ...... کسی بھی ملک کا، کسی بھی خطے کا۔ ایک ڈونٹ کی طرح ایک برگر کی طرح شاہ بہادر بش کی مرغوب غذا۔ اور اس کا REASON ہمارا خود کا کمزور ہونا ایک دوسرے کو گرا کر تخت نشینی ہماری تاریخ ہوئی اور اسی بدولت ہم نے امریکہ صاحب کا ہاتھ تھاما اسے افغانستان تباہ کرنے میں بھرپور مدد دی اس کا بم جب مظلوم، نہتے شہریوں پر گرا ہم نے آنکھ بند کر لی اور اسی جہاز نے جب روٹی کی بھیک اونچائی سے لوگوں کو پھینکی تو ہم نے مداری کے اس تماشے پر خوب ڈگڈی بجائے، تالی بجائی اور دل کو تسلی دی ...... کیا رحم دلی ہے؟ واہ بھئی واہ ...... آج اس افغانستان میں PROSTITUITION کا ادارہ بن گیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے آزادی

...... طالبان سے آزادی ۔ عورت کی آزادی ۔ اور اسامہ جو کرے وہ دہشت گردی ، امریکہ وہی کرے تو دہشت گردی کا قلعہ قمع ۔ فرق کی لائن کون کھینچتا ہے یہ تمیز کس نے کی ہے؟؟؟؟ ایک TWIN TOWERS گرنے میں اور پورا افغانستان اور عراق تباہ ہونے میں ہمیں کون بتائے گا کہ کیا ہے دہشت گردی؟ کون سچا؟ کون جھوٹا ۔ کون انصاف کرے گا اس حشر کے سامان میں؟؟؟؟

انہی عراقیوں نے اب پاکستانی مسلمان کو پکڑ لیا ہے اس زعم میں کے اس کا والی وارث ملک بھی ان کے حق میں قدم اٹھائے گا فلپائن نے اپنی فوجیں اپنے جوان کو بچانے کیلئے واپس بلا لی تھیں اس طرح سوچا یہ گیا کہ اب پاکستان اپنی ممکنہ آنے والی فوجوں کو روک دے گا مگر اے معصوم لوگو کس بھول میں ہو اس دفعہ تمہارا ہاتھ صحیح نہیں پڑا جیسا کہ امریکہ نے فلپائن پر دباؤ ڈالا تھا کہ اپنی فوجیں واپس نہ بلا ؤ ورنہ ان لوگوں کے ہاتھ یہ آسان نسخہ آجائے گا اور اس طرح ایک ایک کر کے یہ مختلف قوموں کے مختلف ملکوں کے لوگ پکڑتے رہیں گے تو ہماری دکان پر سجانے کیلئے کیا سودا بچے گا؟ فلپائن نے ایک نہ مانی سب کچھ داؤ پر لگا دیا مگر اس دفعہ عراقیوں نے غلط ہاتھ مار دیا ہے اب ان کا نسخہ آسان نہیں رہے گا کیونکہ امریکہ کے عشق نے آگے ہی مشرف کو نچایا ہے کر کے تھیاہ تھیاہ۔

ہاں اختتام پر ایک دو باتیں اور کہہ دوں ۔ شکریہ فلپائن کا کرنا ہے کہ اس کی بدولت پھر سے ایک بھولی بسری بات یاد آ گئی کہ انسان بھی انسان ہی ہوتا ہے ۔ دوسرا عراقیوں سے افسوس کرنا ہے کہ اس دفعہ جیت کی امید نہ رکھیں یہ اغوا ضائع ہوا (اللہ کرے اس ٹیکسی ڈرائیور کی طرح اس پاکستانی کو بھی کوئی بچا لے جائے) ۔ تیسرا کوئی ہمیں بتلائے کہ دہشت گردی اور جنگ میں کیا فرق ہے؟ کیا امریکہ جتنے لوگ جس بھی بات کیلئے مارے گا وہ جنگ کے بارے ہونگے ؟ کوئی اور کسی کو بھی مارے گا امریکہ کی مرضی کے خلاف تو وہ دہشت گردی ہوگی ؟ لکیر کس نے لگائی اور لکیر کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ امریکہ کی جیلوں میں عراقیوں کے ساتھ شرمناک سلوک ، عورتوں مردوں

کے ساتھ جنسی بدسلوکیاں ایک FUN اور وہاں سے باہر کسی اور ملک میں کسی اور جگہ کسی اور کے ہاتھوں وہی فعل RAPE ۔ واہ ستم ظریفی زمانہ تیرے کیا کہنے؟

کئی سال پہلے امریکہ نے فلپائن کو محکوم کر کے آج کے افغانستان کی طرح اسے بھی رنڈی بازی کا کوٹھا بنا دیا تھا۔ آج اگر فلپائن امریکہ کے منہ پر آ کر گستاخی کر سکتا ہے اس کی ٹھوکر پر رکھ سکتا ہے تو وہ وقت دور نہیں جب ہر پسماندہ ملک، ہر ہارا ہوا ذرہ پکارے گا حق سچ ...... اللہ ہو، حق سچ اللہ ہو ...... سوئی ہوئی قومیں بیدار ہونے کا لگتا ہے وقت آ گیا ہے میں تو اس ایک جلتے چراغ کو دیکھ کر حوصلے بلند کر بیٹھی ہوں ...... کیا آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہے؟ کیا واقعی ہی ایسا ہونے کو ہے؟ کوئی تو منصف ہو کوئی تو امید دلائے۔

☆☆☆

وہی آسمان وہی پرندے

ہجرت کی داستان جتنی پرانی ہے اتنی ہی نئی بھی۔ انسان کہتا ہے میں روٹی کیلئے، مارا مارا پھر رہا ہوں اور پھر وہ کہتا ہے میں تو اعلیٰ تعلیم کیلئے ملک بدر ہوتا ہوں اسی زبان سے کہتا ہے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنا ہے سو ایک ہجرت کے پیچھے لاکھ حیلے ہیں کئی بہانے ہیں مگر یہ ہجرتیں ہوتی ادھوری ہی ہیں..... بڑی تشنہ تشنہ سی بڑی پریشان پریشان سی کیا کبھی کوئی ہجرت مکمل ہوتے کسی نے دیکھی ہے میں نے تو مہاجروں کو دو دھڑوں میں ہی بٹے دیکھا ہے۔ کسی مہاجر کا میں نے ایک جسم نہیں دیکھا انسان جب خودکشی کرتا ہے تو وہ اکتاہٹ کی اس سٹیج پر ہوتا ہے جہاں سے اس کو اپنی جان بھی غیر اہم نظر آتی ہے وہ ایسی ہی اکتاہٹ ہوتی ہوگی جو انسان کو اس کے تن سے بیزار کر دیتی ہے اور وہ مرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی طرح وہ ملک سے کیسی اکتاہٹ ہوتی ہے جو لوگوں کو اپنا جسم دو حصوں میں کاٹنے سے زیادہ خوفناک لگتی ہے، لوگ اپنے دو ٹکڑے کرتے ہیں اور ہجرت کر جاتے ہیں ایک ٹکڑا ماں کے پاس چھوڑ کر دوسرا ٹکڑا سمیٹتے ہوئے کہیں کے کہیں نکل جاتے ہیں۔ شدت کی یہ سٹیج ہم تیسری دنیا کے باسیوں کا مقدر ہے ہم بہت شدید لوگ ہیں۔

مجھے پاکستان کے تعلیمی نظام سے اتنی ہی چڑ ہے جتنی کہ ہونی چاہیے ہمارے پیارے ملک کا تعلیمی ڈھانچہ کسی آکٹوپس کی طرح ایسے شکنجے میں کس لیتا ہے کہ انسان خود حیران ہوتا ہے کہ اچھا! تو میں نے یہ کرنا تھا، اوہ ہو تو یہ میرے مقاصد تھے؟ اپنی ڈگری پکڑ کر خود حیران رہ جاتا ہے، جس نے دل میں ایک آرٹسٹ بننے کے خواب دیکھے ہوتے ہیں وہ لا کالج سے نکل رہا ہوتا ہے، جس نے ڈاکٹر بننے کا شوق پالا ہوتا ہے وہ انٹرویو میں کہتا پایا گیا نظر آتی ہے آج اگر میں اداکار

نہ ہوتی تو ڈاکٹر ہوتی یا ہوتا ۔اس نظام کے ڈسے ناکامیاب لوگ اپنے بچوں کو اس سے بچانے کیلئے ملک چھوڑ کر نکل پڑتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے ۔بہت سے مظالم بہت سی ناانصافیاں ، بہت سی حسرتیں کہی ان کہی خواہشیں، بدنظمی، غنڈہ گردی اور بہت کچھ جو ہم کو درد دیتا ہے۔ آنسو دیتا ہے آپس کی خاندانی دشمنیاں اردگرد کا گھٹا گھٹا ماحول حبس آلود ہوا میں سانس بند کرتی حدت،غربت کا جال، سفارش، رشوت کی مکڑی حساس لوگوں کو یہ سب کچھ مجبور کرتا ہے کہ کسی ایسی سرزمیں پر جا بسیرا کریں جہاں سکون کی فضا ہو، پرسکون پرندے ہوں متوازن معاشرہ ہو دردمند دل ہوں، قابلیت کی عزت ہو ٹیلنٹ رل نہ جاتا ہو، انسان کو لگے کہ وہ انسان ہے پیسے کی نہیں انسان کی اپنی عزت ہو جو اس کے کردار، اس کی تعلیم کی ہو۔ حساس انسان ایسی نیلی جھیل میں کھو جانا چاہتا ہے جہاں اس کو انصاف کی جل پری ملے اور اعتدال کا ٹھنڈا پانی ملے۔

ہم مہاجر دو ٹکڑوں کو سنبھالتے کسی پرستان میں کھو جانے کو یہاں آجاتے ہیں۔ احساس ہوتا ہے شائد ٹھنڈے پانی کی، نیلے رنگ کی، خوبصورت پھولوں اور معصوم پرندوں سے بھری جھیل یہی ہے مگر کیا ایسا ہی ہے کیا اب بھی ایسا ہی ہے؟ بہت کچھ بدل گیا ہے۔بہت کچھ بدل جاتا ہے ایک ہجرت کیا انسان بہت حساس ہوتا ہے اس کو ماں کی یاد، مٹی کی یاد، اپنے چھوڑے ہوئے بند گھر کی یاد، اپنے قبیلے کے لوگوں کی نفرتیں محبتیں، سب چیزیں مل کر اس کو تپا ہوا لوہا بنا دیتی ہیں جو ذرا سی اور آنچ سے ٹوٹ پھوٹ ہی جائے۔ اب جب اڑتے، پناہ لیتے، حساس ہوتے لوگ بہت سی امید کے ساتھ آئے مگر ان لوگوں کو یہاں بھی وہی کچھ مل جائے جس کیلئے وہ اپنا جسم کاٹے پھرتے ہیں تو سوچا نہیں اس المناک دکھ سے کون جائے گا ......شائد کوئی بچا بھی نہیں سکتا۔

ایسا ہی دکھ مجھے یہاں پاکستانی لوگوں کو آپس میں دست وگریبان ہوتے دیکھ کر ہوا ایک دوسرے پر پھر اسی طرح کیچڑ اچھالتے دیکھ کر ہوا۔ ایک معروف بزنس مین کا بیان جسے ایک اخبار نے بڑے خضوع وخشوع سے چھاپ رکھا تھا کچھ یوں کے فلاں کو فلاں کہنے والوں کو ہم اینٹ کا

جواب پتھر سے دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر یوم آزادی کے میلوں پر ایک دوسرے کی LEG PULLING اور ایک دوسرے پر ناحق برتری جتانے کا بھونڈا انداز ...... یہ سب دیکھنے کی پاکستان میں تو عادت ہوگئی تھی جو (اب دکھ سے مبرا ہوگئی تھی) مگر یہاں ناقابل بیاں اذیت۔ اور بھی بہت کچھ لگتا ہے

پچھلے کچھ سالوں میں SUB-CONTINENT کی ساری سائیکی ادھر ہجرت کر آئی ہے۔ وہی complexes وہی شو بازیاں، وہی زبان دانیاں، اب کیا رہ گیا ہے۔ پاکستان میں بہت سال پہلے ایسے اکا دکا لوگ جب دبئی یا سعودی عرب جاتے تھے تو پریشان رہتے تھے کہ وہاں تو ان کے پاس کار آجاتی تھی پاکستان میں وہ صاحب موٹر سائیکل یا سائیکل ہوتے تھے تو وہ پریشان ہی رہتے تھے کہ کس طرح پاکستان والوں کو اپنی گاڑی میں بیٹھ کر 120 کی سپیڈ پر چلا کر دکھائیں مگر یہاں اب چونکہ خاندان کے خاندان آباد ہو گئے ہیں اس لئے وہی دوڑ وہی پاگل کر دینے والا جنون ادھر بھی لوگوں پر سوار ہوگیا ہے ہم سے بڑا گھر کسی کا نہ ہو ہم سے بڑی گاڑی کسی کی نہ ہو ہم سے زیادہ چیزیں کسی کے پاس نہ ہوں ہم سے زیادہ عزت کسی کی نہ ہو۔ ہم ہم ہوں کوئی اور نہ ہو، وحشت زدہ یہ سوچ مہاجروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ادھر آ پہنچی ہے۔ اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے ایک دوسرے پر بیان بازی، نفرت اگلتی کہانیاں ایک دوسرے کے خلاف کدھر کو جاتی ہے ہماری کمیونٹی ؟؟؟؟؟ کس لئے ہم یہاں تک آئے تھے؟ جسم کاٹنا آسان نہیں ہم نے ایسا کیا اور کیسے اس اذیت کو بھلا دیا اپنے مقصد کو بھلا دیا؟ کیوں ہم نے یہاں بھی وہی نفرت، وہی تعصب، وہی ناانصافیاں، وہی دھوکہ دہیاں اور وہی مکروہ الفاظ جو انسانوں کو توہین کیلئے نکالے جاتے ہیں، پھیلا دیے ہیں۔

یہ تو کمیونٹی کی بات ہے ایک یونٹ کو دیکھوں ایک گھر کو دیکھوں تو بھی کیا پاتے ہیں ہم؟ شوہر کدھر کو بیوی کدھر کو؟ گھر میں دو بچے ہیں تو وہ بھی east , west کسی کی سمت کسی کی طرف نہیں جاتی ہر کوئی ادھر ادھر کو نکلا جاتا ہے گھر میں بیٹھ کر اکٹھے کھانا ...... یہ خیال، خواب بن گیا

ہے۔ مصروفیت کے اس جال میں ملتا کیا ہے؟ بڑے گھر کی بڑی MORTGAGE چھوٹے گھر کی چھوٹی۔ بڑی گاڑی کی زیادہ اور چھوٹی کی چھوٹی۔ ہر کوئی interest , loan کے چکر میں اور اس چکر میں بھی بڑا چھوٹا بننے کے چکر میں۔ تو یہ سائیکی جو sub continent کی ہے ہمارے ساتھ ہی ہے ہماری ذات کا حصہ۔ نیچا دکھانے کی سائیکی، leg pulling کی عادت، دھڑوں میں بٹنے کے مشغلے، پیٹھ پیچھے چھرا گھونپنے کی رسم ...... یہ سب چیزیں ہمارے ساتھ ہیں۔

اب شائد ہماری ہجرت تو ادھوری نہ لگے، سب کچھ تو ساتھ لے آئے ہم۔ کوئی بیٹھے اور ہمیں بتائے کیا ہم نے نیلی جھیل کے ٹھنڈے پانی، اڑتے پرندے، اور جل پری سے مل لیا ہے کیا ہم نے قدرت کے اس حسن کو اور اس سے نکلتے سکون کو پا لیا ہے؟ نہیں نا؟ ہم جھوٹ کیسے بولیں...... روز کی ایک گولی ڈپریشن کی، یہ جھوٹ شائد بولنے نہ دے۔ ہم کب ایسا کہیں گے۔

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی، بدل چلا رنگ اب آسمان بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے، جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

☆☆☆

Every thing is under control:

میں نے اپنے بیٹے سے پوچھا، ہوم ورک کر لیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلکا سا بدلا پھر بڑے اعتماد سے بولا۔۔۔mama every thing is under control۔۔۔ میں نے سوچا کیوں نہ چیک کر لوں۔ یہ جواب غیر معمولی تھا۔ جواب یا ہاں میں ہونا چاہیئے تھا یا نہ میں سو میں نے اس کا ہوم ورک فولڈر چیک کیا تو ایک تباہی کا منظر تھا، ساری شیٹس فولڈر سے باہر تھیں، ایک بڑا mess up تھا۔ میں نے اس سے پوچھا اس سارے گند خانے میں کیا چیز انڈر کنٹرول ہے۔۔۔ تو سپاٹ آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اور بولا میں سب ہینڈل کر لوں گا۔۔۔ یہ بات مجھے کیوں یاد آئی؟ جب میں نے پیپلز پارٹی کے راجہ پرویز اشرف، کو ایک ٹاک شو میں کہتے سنا۔۔۔everything is under control، اور ہماری حکومت کا یہ کنٹرول بھی کچھ ایسا ہی ہے جیسا میرے بیٹے کا اپنے ہوم ورک فولڈر پر تھا اور پھر ہمارے جیسے سیدھی سیدھی بات کرنے والے لوگ یا ہاں میں یا نہ میں جواب سننا چاہتے ہیں اور ہمیں سنائی دیتا ہے سب کچھ کنٹرول میں ہے۔ اور جب ہم تحقیقی نظروں سے کھوجتے ہیں کہ اگر سب کنٹرول میں ہے تو میرے ملک کی فضاؤں میں بارود اور آگ کیوں بھری ہوئی ہے۔

میرے ملک کے معصوم بچے جن کی حفاظت کرنے والی حکومت نے ہاتھوں میں غلامی کی چوڑیاں، گردن میں جی حضوری کا طوق اور پاؤں میں بے غیرتی اور ضمیر فروشی کی پازیب پہن رکھی

ہے اس لئے میرے ملک کے معصوم بچے غیر ملکی گولیوں کا نشانہ یوں بن رہے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں کھلونے، اور آنکھوں میں پریوں کے دیس جانے کے خواب ہوتے ہیں، اور ان کے جسم انہی خوابوں اور کھلونوں کے ساتھ توڑے پھوڑے جا رہے ہیں کہ لگتا ہے۔۔۔۔ everthing is under control۔ میں اس کنٹرول پر قربان۔۔۔ وہ ایک تصویر ظاہر کرتی ہے اس کنٹرول کو جو ہمارے حکمرانوں کا ہے اسی فولڈر کی طرح جس میں کوئی چیز جگہ پر نہیں تھی، جس کا ہر صفحہ ادھڑ چکا تھا، میں اس تصویر کو دیکھ نہیں پائی۔ وہ باجوڑ میں اتحادی فوجوں کی بمباری کے بعد کی تھی وہ میرے بچے جتنا بچہ تھا جس نے ابھی زندگی کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا جس نے ابھی موت اور اپاہجی کا نام بھی ٹھیک طرح سے سن نہیں رکھا تھا۔ وہ موت کے منہ میں اپاہجی کی حالت میں بستر پر پڑا تھا۔

میں نے تصویر میں دیکھا اس خوبصورت بچے کی ایک ٹانگ نہیں تھی اور دونوں ہاتھ بھی کٹ چکے تھے۔۔ وہ امریکیوں کے بچوں جیسا بچہ تھا، وہ ایک انسان کا بچہ تھا، جس کو اس کی ماں نے اسی طرح جنم دیا ہوگا جس طرح امریکیوں کے بچوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کا دل، اس کی آنکھیں ، اس کا چہرہ، اس کی روح، اسکے پاؤں اور اس کا دماغ۔ کہاں سے لگا اور کہاں سے لگتا ہے کہ یہ بچے بچے نہیں ہیں۔ یہاں ان معاشروں میں بچوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے، جب ہم کینیڈا آئے تو لوگوں سے سنا کہ یہاں سب سے زیادہ اہمیت بچوں کو دی جاتی ہے، پھر ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ یہ واقعی سچ ہے یہاں بچوں کو بہت پیار، بہت توجہ اور بہت حفاظت دی جاتی ہے۔ مگر وہ بچے۔۔ جو میرے ملک کے ہیں اور بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی بچے ہیں۔۔۔ وہاں انسانی حقوق، بچوں کے حقوق، عورتوں کے حقوق جا کر کیوں مٹی میں مل جاتے ہیں۔۔ صرف اس لئے کہ وہ اس ملک میں پیدا ہوئے جن کے حکمران صرف تھا تھیا کرنا جانتے ہیں۔ ہمارے اوپر مرد نہیں عورتیں نہیں بلکہ کوئی درمیانی مخلوق حکومت کر رہی ہے۔۔

لوگ کہتے ہیں، انسانی حقوق کی تنظیمیں چیخ رہی ہیں۔۔ پاکستانی میں عورتیں ماردی

گئیں، پاکستان میں فلاں فرقے کے دو لوگ مار دیئے گئے اور فلاں کے چار۔۔۔۔ پاکستان میں انسانی حقوق کی پاسداری نہیں۔ تو میرا سوال یہ ہے ہر اس شخص سے جو دنیا میں کہیں بھی بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ پاور ہے، انسانی حقوق کی تنظیموں سے۔۔ ہمارے گھر کے اندر کوئی لڑائی ہے کوئی ناانصافی ہے تو آپ سب مل کر چیختے ہیں۔۔ عورتوں کو حقوق دو، چائلڈ لیبر پہ پابندی لگاؤ، بزرگوں کو سہولتیں دو۔۔ مگر جب گاؤں کا بدمعاش چوہدری آ کر ہمارے کھیلتے بچوں کو یا مار دیتا ہے یا اپاہج کر دیتا ہے ہماری عورتوں کو قیدی بنا کر اس پر کبھی تشدد کرتا ہے اور کبھی انہیں گولی سے مار دیتا ہے، ہمارے بزرگوں پر طبعی موت نہیں آنے دیتا، اپنی گولیوں سے انکی زندگیوں کا فیصلہ کر رہا ہے۔

مذہب کو دہشت کی علامت بنا رہا ہے۔ لوگ بچوں کو یہ نصیحت کرنے لگے ہیں بیٹا کہیں پکا سچا مسلمان نہ ہو جانا۔۔۔ تب تب سوال اٹھتا ہے تب کہاں جاتی ہیں انسانی حقوق کی آواز اور کہاں جاتی ہے مذہبی آزادی۔ اور ہمارے حکمران وہ کہتے ہیں۔۔ سب اچھا ہے آپ اچھا دیکھیں، یہ تو ایسے ہی ہے ہمارا سر تندور میں گھسا کر اور آنکھوں میں جلتے ہوئے کوئلے ڈال کر کہا جائے بڑا بدتمیز ہے ابھی بھی تجھے ٹھنڈی ہوا نہیں آتی۔ بڑا ناشکرا ہے۔۔ یقین کیوں نہیں کرتا کہ ہوا بہت ٹھنڈی ہے۔ میں جو کہہ رہا ہے، تو تو بھی کہہ۔۔ تو جناب آپ کو خوبصورت اے۔سی والے محلوں اور گاڑیوں سے تو ٹھنڈک ہی آئی ہے۔ ہم جو تندور میں جل رہے ہیں اور میرے بچے جو سڑکوں گلیوں میں کٹ رہے ہیں اور ہم جو زندگی کی دوزخ میں جل رہے ہیں، ہم کیسے آپ کی زبان میں کہہ دیں کہ ہوا بہت ٹھنڈی اور تازہ ہے۔ میرا تو سر دم گھٹ رہا ہے میں کیسے کہہ دوں کہ میری روح تازہ ہے؟۔

باہر کی دنیا نے ہمیں انسان سمجھنا اس دن چھوڑ دیا، جب ہمارے حکمرانوں نے انہیں یہ یقین دلایا کہ یہ سودا سلف ہیں، آپ انہیں خرید بھی سکتے ہیں اور انہیں کوڑے کے ڈبوں میں پھینک بھی سکتے ہیں۔ یہ خریدنے کی چیز ہیں، آپ انہیں خریدیں، پھر آپ کی مرضی آپ ان سے جو

مرضی میں آئے سلوک کریں بس ہمیں ڈال دے دیں۔۔آج کی حکومت میں اور کل کی حکومت میں میرے لئے کوئی فرق نہیں۔۔اپوزیشن میں جا کر سب سچی باتیں کرتے ہیں اور حکومت میں ایک سٹیج ڈرامہ تھا جس میں ایک آفیسر، ایک آدمی کو جوتے مارتا جاتا ہے، اس کی بے عزتی کرتا جاتا ہے اور وہ آدمی بار بار کہتا ہے، پھڑک مارتا ہے۔۔اب مارا نہ تو لڑائی ہو جائے گی، وہ افسر پھڑک سن کر پھر طیش میں آجاتا ہے حالانکہ وہ پھڑک ساتھ کھڑی لڑکیوں کو متاثر کرنے کیلئے لگاتا ہے تو وہ افسر پھر ٹھیک ٹھاک اسے مارتا ہے، اس کے منہ تک پر جوتی مار دیتا ہے اور وہ لڑکیوں کی طرف منہ کر کر کے فقط یہی کہتا رہتا، باز آجاؤ، کوئی فائدہ نہیں ایویں لڑائی ہو جائیگی۔ یہی حال ہماری حکومت کا ہے ہماری طرف منہ لگا کر نعرہ لگاتے ہیں سب کنٹرول میں ہے، ہم ایک خود مختار ملک ہیں، کسی کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہماری سرحدوں کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے وغیرہ وغیرہ اور وہ جواب میں کیا کرتے ہیں رکھ کر ہمارے منہ پر طمانچہ رسید کرتے ہیں۔۔اور پھر ایک اور جوتا ہمارے منہ پر۔۔۔۔اور سب کچھ کنٹرول میں ہے۔

☆☆☆

سوہنی دھرتی اللہ رکھے!

14 اگست کا موقع ہے۔ٹی وی پر دیکھتی ہوں لوگ جن کو کھانے کو آٹا نہیں مل رہا، پہننے کو کپڑا تھوڑا پڑ رہا ہے اور مکانوں کی چھتیں جو کبھی بارش میں بہہ کر گر جاتی ہیں اور کبھی دھوپ میں جھلس جاتی ہیں۔ وہ لوگ جھنڈیاں خرید رہے ہیں، جھنڈے گھروں پر لگا رہے اور جشن آزادی منانے کا عزم بہت پکا رکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جن کے چہرے خوشی سے تمتا رہے ہیں اور میرے کان سنتے ہیں کہ وہ کہہ رہے ہیں آزادی کا دن بھی عید کا دن ہوتا ہے۔ہم 14 اگست کو عید کی طرح منائیں گے۔ یہ سنتے ہی دل کے اندر ایک آری سی چل گئی۔یا خدا مجھ سے میرا بچپن کیوں چھین لیا۔بھول پن کیوں کھو گیا اور زمانے کی تختی کی سمجھ کیوں کر میرے اندر اتر آئی ہے۔تبھی تو میں جشن آزادی کی خوشی کی نعمت سے محروم ہو گئی ہوں اور سوچتی ہوں اس میں منانے جیسا کیا رہ گیا ہے؟ کس بات کی خوشی؟

جب آزادی ملی تو بہت جانوں کا، مالوں کا اور عزتوں کا نقصان ہوا جس کا ازالہ ممکن نہیں، مگر روحانی اور جسمانی طور پر کٹے پھٹے لوگ یہاں پہنچتے تھے،تو ان کا دل اس بات پر مطمئن ہونے کی کوشش کرتا تھا کہ کل کا دن اتنا کالا نہیں ہے۔وہ سوچتے تھے ایک نئی امید کے ساتھ ایک نئی صبح میں وہ داخل ہو رہے ہیں۔وہ سوچتے تھے رات تو اب پیچھے رہ گئی۔آگے تو اجالا ہی اجالا ہے۔غلامی کی کہانی پیچھے چھوڑ آنے کا انہیں یقین تھا۔آزادی کی صبح روشن لگ رہی تھی۔آدھے کٹے، آدھے جڑے جب دھرتی پر آ گرتے تھے تو ان کے لب کہتے تھے سوہنی دھرتی اللہ رکھے۔اپنے ملک کا،

ملیت کا احساس سب غموں، سب لاشوں اور سب عصمتوں پر چھا جاتا تھا۔

چلیں آج ایک آزادی کے کارکن کو پکڑ کر لاتے ہیں اور وہ ہمیں صرف اتنی تسلی کرا دے کہ آج کا پاکستان ہمیں وہ سب کچھ دے رہا ہے جس کے لئے قربانیاں دی گئیں اور جس کا نشان قائداعظم نے رکھا تھا۔ مگر آزادی کا کارکن خاموش ہے، اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی ہیں اور اس کے منہ سے تسلی کا ایک لفظ نہیں نکل رہا۔ وہ کیا بتائے؟ کیا ہم آزاد ہیں؟ نہیں ہم تو نسل در نسل غلام ہیں۔ پہلے برطانیہ کے تھے اب امریکہ کے۔ ہم نے امریکہ دیوتا اور اس کی کالی ماتا کو خوش کرنے کے لئے انکے قدموں میں اپنے پاکستانیوں کی بلیاں چڑھا دیں۔

مسجدوں میں جو قتل عام ہوا آج کے پاکستان میں، آزادی کا کارکن کہتا ہے اس سے زیادہ تو آزادی سے پہلے بھی نہیں تھا۔ رات اتنی گہری تو اس وقت بھی نہ تھی۔ جب کہنے کو ہم غلام تھے۔ عورت کی عزت لٹنے پر دل برباد تو ہوتا تھا مگر اس طرح ماتم کناں نہ ہوتا تھا۔ بہت ساری عورتوں کی عصمتیں پاکستان کے نام پر قربان ہو گئیں۔ یہ سوچ کر لب خاموش اور دل تسلی میں رہا، مگر آزادی کا کارکن پوچھتا ہے مختاراں مائی، ڈاکٹر شازیہ کس نام پر اپنوں سے بے حرمت ہوئیں اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو کس چیز کے عوض غیروں سے بے حرمت کروایا گیا۔ آزادی کا کارکن پوچھتا ہے مزار قائد پر اس کے سکیورٹی گارڈز کے ہاتھوں معصوم عورت کی بے حرمتی، قربانی کے کس کھاتے میں لکھیں۔ ان عورتوں کی عصمتیں برباد ہوئیں۔ تو کیا کہیں۔؟ کس کے اوپر یہ برباد ہو گئیں۔۔ معصوم لوگوں کا خون، اور عصمتیں آزادی کے نام پر جو گئیں، پھر بھی ایک نام پا گئیں اور ایک مقصد پر واری گئیں۔ مگر آج کے آزاد پاکستان میں جو اپنوں سے بے حرمت ہوئیں اور تسلی نہ ہوئی تو غیروں کو بیچ دیں۔ وہ کیسی غریب ہیں جن کا کوئی وطن نہیں، وہ خون بغیر وجہ کے بہہ گیا، نہ کسی سکھ کی کرپان تھی اور نہ ہندو کی بغل میں چھری، میری سوہنی دھرتی پر میری فوج ہی میرے وطن کے بچوں، جوانوں اور عورتوں کو کاٹ کاٹ پھینک رہی ہے۔ ایک دوسرے پر ظلم کرنے میں ہم خودمختار ہو گئے ہیں۔۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں ہمارے صدر اور وزیراعظم خودمختاری کا

نعرہ بے وجہ نہیں لگاتے۔

14 اگست کو آزادی کا کارکن پوچھتا ہے۔۔ مجھے بتاؤ میرے بچوں کا جو خون بہا، میری عورتوں کی جو عزتیں لٹیں ۔۔ اور میں اس صبر کے ساتھ آ کر اس دھرتی کو آباد کرتا رہا کہ یہ میری دھرتی سوہنی ہو جائے گی، اس کے ماتھے سے خون کا اور بے حرمتی کا نشان مٹ جائے گا اور یہ میری کل آنے والی نسل کے سر سے خوف، غلامی، بے حرمتی اور استحصال کے بادل اٹھا لے جائے گی۔ مگر سین وہیں کا وہیں کیوں ٹھہر گیا، ہماری فلم کا منحوس سین کیسے وہیں پر پاز کر دیا گیا ہے اور اس کا پلے بٹن دبایا کیوں نہیں جا رہا۔ آزادی کا کارکن پوچھتا ہے کیا سولہ کروڑ مفلوج ہاتھوں، جن سے پلے کا بٹن دبایا نہیں جا رہا، ان بے جان ہاتھوں کے لئے ہم نے اس لرزہ خیز داستان کی بنیاد رکھی تھی۔

جمہوریت کے نام پر لیا گیا ملک اتنا غیر جمہوری کیسے ہو گیا کہ اسکی سیاسی پارٹیوں کے لیڈر، پارٹیوں کی حکمرانی کسی موروثی بیماری کی طرح، اپنے بچوں میں منتقل کر جاتے ہیں اور پھر وہ ایسی جمہوریت ملک میں لاتے ہیں کہ غلامی کے ان دنوں سے ذرا برابر بھی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ تو ہمارے آزاد ملک میں جمہوریت بھی ایسے آتی ہے جیسے غلاموں کے اوپر سرکار آتی ہے۔۔ آزادی کا کارکن جب یہ سوال پوچھتا ہے تو دل کرتا ہے کہیں سے کوئی بچپن لوٹا دے، معصومیت واپس کر دے اور ہم آزادی کے کارکن کو جواب دینے کی زحمت سے بچ جائیں۔ بازار جائیں، جشن آزادی مبارک کی جھنڈیاں خریدیں، قومی اور ملی نغمے سنیں اور دل میں جوش محسوس کریں۔۔ مگر افسوس ہم آزادی کے کارکن کے آگے شرمندہ ہیں، ہماری آگاہی ہمیں میز ے پر کھڑا کر دیتی ہے اور ہمارا سر جھک کر ہمارے ٹخنوں پر جا لگتا ہے۔۔ اور ہمیں سوہنی دھرتی کا سوہنا پن نظر نہیں آتا۔ بدصورتی بہت گہری ہو چکی ہے اور کیا اللہ سے رکھے گا؟

☆☆☆

اپنے حصے کا کام

کبھی کبھی دل اتنا اوب جاتا ہے کہ قلم ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ خیالات کا بہاؤ وہم کر کونے میں جا لگتا ہے۔ ہر طرف یوں محسوس ہوتا ہے کچھ نہیں بدلے گا، گھٹن بڑھتی جا رہی ہے۔ نفسا نفسی اپنے پاؤں ہمارے معاشرے میں مضبوط کرتی جا رہی ہے۔ جھوٹ کے پاؤں بھی بہت لمبے ہو چکے ہیں۔ اور یہ احساس بہت گہرا ہو چکا ہے کہ بے حسی کوئی جرم نہیں ہے اور ڈپریشن ایک اژدھا ہے۔ حسد، ناکامی کا احساس، بے دردی، خودغرضی اور خودترسی، یہ سب، ڈپریشن کے تحفے ہیں۔ آج ہم دیکھیں تو ہمارے حکمرانوں نے ڈپریشن کی اس مجموعی سائیکی کا انجیکشن بہت غیر محسوس اور مسلسل طریقے سے پاکستانی عوام کو لگا دیا ہے۔ اور وہ اثر ایسا گہرا رنگ پکڑ چکا ہے کہ اترنے کا نام نہیں لیتا۔۔ تو ایسی منجمد کیفیت میں دل ڈوبنے لگتا ہے، اعصاب تھک جاتے ہیں اور غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے اور خواب بھی یہی آنے لگتے ہیں کہ اب کچھ ہونے کا نہیں۔۔۔۔

ایسے میں قلم میز پر پڑا رہتا ہے، اٹھانے کو دل نہیں کرتا۔۔ کچھ اچھا بھی سوچنے کو دل نہیں کرتا۔ اپنی جذباتی فطرت سے، بے وقوفی کی حد تک سچ بولنے سے نفرت ہونے لگ جاتی ہے۔۔۔ اوروں کی طرح بے حس ہونے کو دل کرنے لگ جاتا ہے، صرف اپنی ذات کی فکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔۔ ان سب ہنگاموں کی طرف سے، خودغرضیوں کی طرف سے، ناانصافیوں کی طرف سے سڑے ہوئے نظام سے منہ موڑنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ پورے وجود پر اکتاہٹ چھا جاتی ہے، دل کرتا ہے نہ لکھنے کا کیا نقصان؟ اور لکھنے کا کیا فائدہ۔۔۔۔۔۔ جب کنارہ کشی کا

ارادہ عین عروج پر ہوتا ہے۔

جب وکیلوں کی تحریک جیسی بڑی تحریک کو کھٹائی میں پڑتے دیکھتے ہیں۔۔۔تضاد کا شکار دیکھتے ہیں۔ جب امریکہ کی فوج ہمارے فوجی گھر آ کر مار جاتی ہے اور ہم جا کر ان کو پھر سے یقین دلاتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف ہمارا تعاون آپ سے جاری رہے گا۔ آئیں اور ہمارے اور لوگ مار جائیں۔ جب موجودہ حکومت کی وزیر اطلاعات بھی محمد علی درانی کی دوغلی زبان بولتی ہے اور کہتی ہے کہ جیو پر پابندی ہم نے نہیں عرب امارات نے لگائی ہے۔۔۔ جب رحمٰن ملک جیسے لوگ یہ بیان دیتے ہیں کہ دھمکی دینے والوں کو (اشارہ وکیلوں کی تحریک کی طرف ہے) فوج سیدھا کرنا جانتی ہے۔ فوج کوئی بھی ہو سکتی ہے اپنی یا امریکہ کی؟ جب لیڈر کھلم کھلا یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ ملک کی سلامتی کو خطرہ ہے، خود اور اپنے بچوں کو پاکستان سے باہر رکھتے ہیں، جیسے ڈوبتے جہاز سے چوہے باہر چھلانگ لگا دیتے ہیں، اسی طرح ان لیڈروں نے جو جانتے ہیں کہ پاکستان کس طرح خطرات میں گھرا ہوا ہے نجانے کب سے اس جہاز سے باہر چھلانگ رکھی ہے اور صرف نام کو قوم کے سامنے جہاز کا ایک پائیدان تھامے ہیں، اور دور سے یوں لگتا ہے جیسے وہ جہاز کے اندر ہیں، مگر حقیقت میں وہ اس جہاز سے بہت دور ہیں۔ کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر پاکستان کے ان لوگوں سے کھیل رہے ہیں جو مجموعی طور پر ایک ڈپریشن زدہ، کائی آلود اور ساکت جامد قوم بن چکی ہے۔

ایسے میں فہد خرم جیسا سٹوڈنٹ جو امریکی سفیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے تمھارے ہاتھ سے مجھے کوئی انعام بھی نہیں چاہیے۔۔ اور کوئی ایوارڈ بھی قابل قبول نہیں تو، دل تازگی سے بھر جاتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ اتنی قربانیوں کے بعد، ایک اتنے خوبصورت اور پائیدار نظریے کے تحت حاصل کیے گئے اس ملک کو ساری کی ساری کائی نہیں نگل سکتی۔ اس ملک کی زمین پھول جننے میں بانجھ نہیں ہو سکتی۔ اس کو ڈپریشن اور مایوسی اتنا نہیں کھا سکتی کہ اس کا سینہ پتھر ہو جائے۔ اس میں گھٹن اتنی گہری نہیں ہو سکتی کہ فہد خرم جیسے ٹھنڈے جھونکے آنا بند ہو جائیں۔ فہد

جیسے لوگ اپنے حصے کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ ایک فہد کے سینہ تان کر انکار کرنے سے کچھ نہیں بدلنے والا مگر وہ اکیلا کھڑا ہو کر اپنے حصے کا کام کر گیا۔

اور کبھی کبھی برف جیسی ذہنی کیفیت میں ایک فون کی گھنٹی بجتی ہے جب احساس پختہ ہو چکا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں صرف حکومت کرنے والے چہرے بدل رہے، کرتوت نہیں۔۔۔۔ جب ملک میں کچھ بھی اچھا ہونے کی امید دم توڑ چکی ہوتی ہے۔۔ تو فون کی ایک کال پھر سے توانائی بھر دیتی ہے۔۔۔ وہ کال جو یہ یقین دلاتی ہے کہ قلم کا یہ جہاد روکنا مت۔۔ بس لکھتی رہو اور تمھارا نام میں نے اپنی ڈائری میں ایک مجاہدہ کی حیثیت سے درج کر لیا ہے۔ تحریک پاکستان کے ایک کارکن علم الدین کی آنسوؤں سے لبریز آواز میں شاباشی مجھے لکھنے کی طرف دوبارہ لوٹا دیتی ہے ورنہ تو قلم میز پر کب سے پڑا ہے۔

لاہور میں بم دھماکوں کے بعد بچوں کی حالت دیکھ کر دل اس بری طرح سے مسلا گیا کہ لفظ بے معنی ہو گئے، لکھنا لکھانا بے وقعت لگنے لگا۔۔۔ اس وقت بھی سوچا کیا فائدہ؟ ایسے میں لندن سے عامر غوری جیسے پختہ صحافی کا فون آ گیا۔۔۔ صرف اس لیے کہ لکھتی رہوں، اور صرف حوصلہ بڑھانے کو فون کیا۔۔ میں نے مایوسی سے کہا۔۔ کیا فائدہ؟ ہم کچھ عملی تو کر نہیں سکتے۔ اور کچھ ہونے کا نہیں۔۔ اس نے کہا یہ بھی ایک جہاد ہے۔۔۔ قلم کا سچ سننے اور پڑھنے والے ابھی بھی ہیں۔۔۔ مایوسی اتنی نہیں بڑھی کہ بے قابو ہو جائے، سچی تحریروں کی لوگوں کو ضرورت بھی ہے اور وہ اسے کسی تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح اپنے بدن میں کھینچتے ہیں۔ اپنے پھیپھڑوں کو سچی تحریر سے آکسیجن کی طرح بھرتے ہیں اور جیے جاتے ہیں۔۔۔ بہت سارے ناموں میں ایک معصوم سا نام ہے۔۔ عمر سمیع۔۔ تحریک انصاف کا کینڈا میں ایک سچا اور مخلص کارکن۔۔۔ جو کہتا ہے لفظ جسم میں توانائی بھر دیتے ہیں، اور سچے لفظ تو آگ لگا سکتے ہیں، میرے بس میں ہو تو آپ کی تحریریں پاکستان میں جگہ جگہ پہنچا دوں۔ اور مجھے اس نوجوان کا جذبہ پھر سے میز پر پڑے قلم کو اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سب فطرت کی طرف سے پیغام رساں کرتے ہیں۔

خدا مجھ سے جو کام کروانا چاہتا ہے وہ میرے قلم سے ہے۔۔ اسی لئے تو جب بھی مایوسی حد سے بڑھنے لگتی ہے، اردگرد کا جنگل گہرا ہونے لگتا ہے، قلم میز پر کافی دن پڑا رہتا ہے کوئی بات، کوئی ای میل، کسی کا کوئی عمل، کسی کی چھوٹی سی کاوش، کسی کا جرات مند جواب، کسی کا بڑی طاقتوں کے آگے انکار، کسی بزرگ کی آنکھوں میں مایوسی کے آنسو۔۔۔اور پھر اس چیز کی چمک کہ چلو اگر ہم نے قربانیاں دیں تو بیٹا تمھاری تحریر پڑھ کر لگا۔۔ تمھاری نسل میں سے کوئی تو ہے جو ہمارے درد کو محسوس کر رہا ہے۔۔ ورنہ تو یہاں لگتا ہے کوئی ہماری بات سمجھنے والا نہیں۔۔۔۔۔ تو میرا قلم پھر سے میرے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اس امید سے کہ اتنی گہری رات میں کم از کم میں اپنے حصے کا چراغ تو تھام رکھوں۔

ورنہ تو یہ اندھیرا نگلنے کو تیار کھڑا ہے۔ اگر ایک فہد تن تنہا کھڑا ہو کے اپنے دل کی بات، اپنے سچ، اپنے جذبات امریکہ جیسی بڑی طاقت، جس کے آگے ہمارے حکمران ناک رگڑتے اور ماتھا ٹیکتے ہیں، پہنچا سکتا ہے۔۔ تو ہم بھی اپنے اپنے حصے کا کام کرتے جائیں۔ اور ان اشاروں کو مقدم جانیں جو قدرت ہمیں ڈھکے چھپے انداز میں دیتی ہے۔۔ ان پیغام رساؤں کو مایوس نہ کریں جو قدرت کا وسیلہ بن کر ہم تک پہنچتے ہیں۔

☆☆☆

یہاں بھونکتا کوئی اور ہے، یہاں کاٹتا کوئی اور ہے

جب لوگ منہ میں انگلیاں دابے نئے نویلے حکمرانوں سے پوچھتے ہیں یہ کیا اور وہ کیا؟ تم تو یہ کہتے تھے اور کیا تم نے یہ یہ.........تو بے ساختہ ان بے چارے حکمرانوں کے لئے دل سے نکلتا ہے!

تجھ آدمی ہے یہ قاصی، اسے بے قصور ہی جانئے
یہ تو ڈاکیا ہے جناب من اسے بھیجتا کوئی اور ہے

لوگ آج بھی لائنوں میں کھڑے ہو کر آٹے کے لئے دن رات برباد کر رہے ہیں اندھیرے گھروں میں بجلی کی روشنی ڈھونڈ رہے ہیں، اپنے بچوں کو گرمی سے بچانے کیلئے گندی نہروں میں پکنک منانے لے جاتے ہیں، خودکشیاں کسی طور کم نہیں ہوئیں، زیادتیاں اور ظلم رکے نہیں، لوٹ مار اور دنگا فساد میں کوئی کمی نہیں آئی، پیٹ بھوکے، دل بجھے ہوئے اور دماغ بہکے ہوئے سب کچھ ویسا ہی ہے۔

تعبیروں کی حسرت میں کیسے کیسے خواب ہے
دولت اک دن برسے گی، اب تو اپنی باری ہے
اللہ جب بھی دیتا ہے چھپّر پھاڑ کے دیتا ہے

اس امید پہ ساری عمر چھپّر تلے گزاری ہے

اطہر شاہ جیدی کی اس شاعری میں پاکستانی قوم کے صبر کی وجہ سمجھ میں آئی ہے اور یہ کوئی مذاق کی بات نہیں حقیقت ہے یا اور بات ہے کہ پاکستانی قوم خود ایک مذاق بن چکی ہے اور یہ مذاق ہی ہماری حقیقت ہے۔ ہم لوگ ایسے عجیب و غریب ہو چکے ہیں کہ اچھا کام کرنے والے کا مذاق اڑاتے ہیں اور برا کام کرنے والے کے سر پہ تاج رکھ دیتے ہیں۔ عمران خان کا میانوالی جیسے پسماندہ علاقے میں اعلیٰ درجے کی یونیورسٹی ایک بہت بڑی کامیابی ہے اور وہ شخص جو بغیر کسی عہدے کے اتنے بڑے بڑے کام کر رہا ہے اس کو بھی لوگ مزاحیہ کہتے ہیں یہ بے چارہ تو لگتا ہے پاگل ہو گیا ہے اور یہ کبھی حکومت میں آ نہیں سکتا یہ کبھی وزیر اعظم نہیں بن سکتا، اور یہ مذاق ہے۔ یہ ساری قوم ایک گھناؤنے مذاق میں پھنسی ہوئی ہے جب لوگ نیک کام کرنے والوں کا مذاق بناتے ہیں دوغلے اور منافق لوگوں کی واہ واہ کرتے ہیں تو اس قوم کو جتنا خدا دے رہا ہے اس لحاظ سے وہ بھی بہت زیادہ ہے اور پھر یہ قوم بڑی صابر ہے، آخر کیوں نہ ہو ان کے اوپر جو بھی ہے ان کی اپنی منشا سے ہے۔ آج اگر مشرف اسی طرح دندناتا پھر رہا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ صاف ہے اس کے ساتھ وہ لوگ بیٹھ کر ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں جنہیں اس قوم نے اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہ مشرف جیسے آمر سے ان کی جان چھڑا دیں گے، انصاف کی رسی کو مضبوط کریں گے، آٹا، دال اور چاول سستے کر دیں گے۔ بجلی اور پٹرول کے مسئلے حل کریں گے، قبائلی علاقوں سے فوجیں واپس بلا لیں گے، لاپتہ لوگوں کو برآمد کرا لیں گے، ڈاکٹر قدیر جیسے ہیرو کو وہی عزت دیں گے جس کے وہ مستحق ہیں مگر ہوا کیا...... نہ روٹی سستی ہوئی نہ عزت مہنگی ہوئی، نہ پانی لوگوں کو ملا اور نہ خون پانی کی طرح بہنا بند ہوا، نہ گھروں میں بجلی پہنچی اور نہ گلیوں کا اندھیرا کم ہوا، نہ ہی اس قوم نے انصاف اور امن کی فاختہ کا دیدار کیا، اور نہ ہی بے گناہوں کا خون بہنا بند ہوگا۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے افسانے ......درخت...... میں کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں مسافروں کے چہرے دھوپ کی شدت سے پہلے بھی سیاہ تھے اور اب بھی ہیں اس درخت نے انہیں کیا دیا ہے ہاں دھوپ سے بچانے کا سر

اب دکھایا مگر بچایا نہیں کیونکہ!

جو گرجتے ہیں وہ برستے ہیں؟ کبھی ایسا ہم نے سنا نہیں

یہاں بھونکتا کوئی اور ہے یہاں کاٹتا کوئی اور ہے

ہمارے ملک کی تقدیر ہمارے حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہوتی تو اور بات تھی اور ہمارے حکمرانوں کی اپنی تقدیر بھی ان کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوتی تو پھر بھی کوئی بات تھی ہمارے صحافیوں کا قلم ان کی اپنی زبان ہی لکھتا تو کوئی اور بات تھی، ہمارے حکمران تو جلسوں میں، لوگوں کے سامنے بولنے کیلئے اچھے اچھے الفاظ ڈھونڈتے ہیں۔ جلسہ کامیاب بناتے ہیں اور لوگوں کو یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے، پہلے ہم پرانے حکمرانوں کی بدکاریوں سے نپٹ لیں، ان کی کرپشن کی سزا دے دیں اور ایسے میں ان کے محلوں میں کامیابی کے جشن ہوتے ہیں، گویئے گاتے ہیں، رقاصائیں رقص کرتی ہیں، جام چھلکتے ہیں اور عوام اس جلسے کی یادیں سینے سے لگائے اچھے دنوں کے خواب سجائے یا تو خودکشی کر رہے ہیں اور یا...... اپنے جسم کے اعضا فروخت کر رہے ہیں اور یا اپنی بیٹیوں اور چھوٹے بچوں کو عین چوک میں بیچ رہے ہیں اور پوچھنے کیلئے اگلے جلسے کا انتظار بھی نہیں کرتے کہ شراب کی قیمت پٹرول سے کم کیوں ہے، ایک رقاصہ پر نچھاور کرنے کیلئے جو رقم ہے وہ میرے گھر پڑے آٹے کے ڈبے میں ڈلوانے کے لئے آٹے سے کم کیسے ہے؟

میرے گھر جو تاریں بجلی لاتی ہیں وہ تمہارے گھر بجلی لانے والی تاروں سے مختلف کیسے ہے؟ تمہارے جھوٹ اتنے سچے اور میری سچی زندگی اتنی حرام کیوں ہے؟ وہ اگلے جلسے کا انتظار نہیں کرتے اور یونہی کچھ نہ کچھ کر بیٹھتے ہیں ...... کبھی بچہ مار دیتے ہیں، کبھی خود مر جاتے ہیں، کبھی اپنا گردہ بیچ دیتے ہیں اور کبھی اپنے جگر کا ٹکڑا، مگر اگلے جلسے کا انتظار نہیں کرتے۔ جھوٹ اگلنے والی زبان نہیں کاٹتے، اکڑی گردن میں دھنسا ہوا گریبان نہیں پھاڑتے، بس یونہی زندگی گزار دیتے ہیں اور ایسے میں جب کوئی اچھا کام کرنے والا آگے آنا چاہے تو ساری عمر کی فرسٹریشن کے دباؤ

میں اس پر ان کا قہقہ مارنے کو دل کرتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ اس مذاق کے عادی ہیں جو یہ ملک انہیں دے رہا ہے وہ اسے اسی طرح لوٹانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور یہ زندہ دلان پاکستان ہیں اور بڑے سکون سے کہتے ہیں!

دھوکہ فریب اس میں ہیں بس اس کے علاوہ
اس شہر میں کوئی بھی برائی نہیں ہوتی

اس لئے بڑے سکون سے ہم کبھی 30 اپریل تک کی گنتی گنتے ہیں اور کبھی 12 مئی تک کی کوئی یہ نہ سوچے کہ ہمیں گنتی آتی نہیں ہمیں 12 مئی سے آگے بھی گنتی آتی ہے بس آپ وعدہ کرتے جایئے ہم گنتے جائیں گے، چاہے الٹی سن لیں یا سیدھی حساب ہمارا کچا نہیں۔

آصف زرداری بھی سوچ رہے ہونگے کیا ساری عمر گھوڑے سدھارنے میں اور بھگانے میں ضائع کی، جو مزا گدھوں کو بھگانے میں ہے اور سدھارنے میں وہ اور کہاں اور نواز شریف کہہ رہے ہونگے کہ بوتل میں سے انصاف کی دہائی کا جن باہر تو نکال دیا ہے مگر اس کو اندر ڈالنے کیلئے امریکہ کا مہاجناتی ہاتھ چاہیے اور ایم کیو ایم 12 مئی اور 9 اپریل کا آسیب ہضم کر کے حکومتی سیٹوں پر براجمان ہو کر سوچتے ہونگے جب تک ان لوگوں کو گولی نہ مارو، زندہ نہ جلا دو یہ بات سمجھتے نہیں۔فضل الرحمان سارے ججز کو فارغ کرنے کا مشورہ دے کر دل دل میں کہتے ہونگے یہ قوم اس قابل ہے کہ اسے انصاف ملے؟ اور اس کی گواہی الطاف حسین دیتے ہیں کہ کیا دانشمندانہ بیان دیا ہے مولانا صاحب نے کہ سب ججز کو گھر بٹھا دو اور مجھے پہلی دفعہ خواجہ کا گواہ ٹٹو۔کیا محاورہ ہے کی سمجھ آتی ہے۔شیر افگن سرعام مار کھا کر ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں چاہے جو بھی ہو میں آج بھی مشرف کے ساتھ ہوں۔مشرف سے پوچھ لو وہ بھی آپ کے ساتھ ہے کہ نہیں کیونکہ چوہدریوں کے سر سے تو ہاتھ اٹھ چکا ہے اور چوہدری برادران بھی تو ن تراڑ پر اترے بیٹھے ہیں۔پہلے کہتے تھے سو دفعہ بھی ہو تو صدر مشرف صاحب کو ہی منتخب کروائیں گے اب کہتے ہیں مشرف کون ہے جو ہماری پارٹی کی قیادت کو بدلنے کا فیصلہ کرے۔دیکھو کب مشرف چھٹہ کو بغل میں

بٹھاتے ہیں اور کب چوہدری شجاعت مشرف سے او ئے شرفو پکارتے ہیں۔کل کے لٹیرے آج کے حکمران ......آج کے حکمران کل کے لٹیرے......تو عوام کس کھاتے میں؟......عوام تو دیکھے گی کب اس حکومت کا پچھلی حکومت سے انتقام پورا ہوتا ہے، کب سب کی جنگ ختم ہوتی ہے؟ عوام تو تماشائی ہیں......مہنگائی، غربت، قتل وغارت یہ سب مسئلے تو صدیوں سے ہیں، ان کا کیا مسئلہ اصل مسئلہ تو انتقام کا ہے وہ پورا ہو جائے باقی کی بعد میں دیکھی جائے گی۔خواب دکھا کر سراب دینا، کون سا جرم ہے اور اس کی کیا سزا ہے سزا تو اس بات کی ہے کس نے کس کو حکومت سے گرایا، کس نے کس کا تختہ الٹایا اس سازش میں شریک ہوا، کس نے پیشی سنی اور کس نے ٹال دی......یہ ہیں مسئلے ......انہیں حل ہونا ہے اس کے لئے حکومتیں بنتی ہیں۔معذرت کے ساتھ۔اے میرے وطن کے سوئے ہوئے لوگو! یہ حکومتیں آپ کیلئے نہیں ہیں، آپ لوگ چھپڑ کو ہی زندگی سمجھو، کبھی نہ کبھی تو اللہ اسے پھاڑے گا ہی۔اوران چھپڑ تلے زندگی گزارتے لوگوں سے حکومت مہلت اور وقت مانگتی ہے ۔ججز کو بحال کرنے کیلئے وقت، معطل کرنے کیلئے کس نے وقت مانگا تھا؟ مہنگائی کم کرنے کیلئے وقت۔حدیقہ کیانی اور جواد احمد کو وزیر اعظم ہاؤس پہنچنے میں کتنا وقت لگا تھا؟ بجلی کے بحران پر قابو پانے کیلئے وقت۔مشرف کیساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے اور عوام کے مینڈیٹ کا مذاق اڑانے میں کتنا وقت لگا تھا؟ تو اس حساب سے کتنا وقت اور مہلت چاہیے۔

☆☆☆

خود سے شرمندہ اور دوسروں پر ناز

منور ظریف ایک لیجنڈ، ایک عظیم فنکار جس کی وفات کو تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے ہماری جنریشن جس نے اس وقت ہوش سنبھالا جب یہ ہنستا بولتا لفظوں کا جادوگر، ایکشن کامیڈی کا بے تاج بادشاہ یہ دنیا چھوڑ چکا تھا مگر آج بھی ہماری نسل میں یہ ایک جیتے جاگتے انسان کی طرح سانس لیتا ہے کیونکہ وہ ہمیں کبھی بھی چھوڑ کر نہیں گیا اس کے تقلید کاروں نے اسے ہمارے درمیاں سے اٹھنے نہیں دیا، اسکے نقالوں نے، پیروکاروں نے اسے اس جہاں سے کبھی جانے ہی نہیں دیا۔ وہ زندہ ہے اتنی ساری بے حسی کے باوجود وہ زندہ ہے...... اس عظیم فنکار، اس جادوگر کی برسی اتنی خاموشی سے آئی کہ خبر بھی نہیں ہوئی۔ ہمارے لوگوں کے رویے کی ایک اور بدترین مثال وہ لوگ جو اپنے کارناموں سے لوگوں کے دلوں میں زندہ ہوتے ہیں، انہیں بھی ہم چھوٹی سی خبر سے مردہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ منور ظریف کی برسی کی بہت چھوٹی سی خبر بہت بڑی بڑی ہالی ووڈ اور

بالی ووڈ کی خبروں اور تصویروں کے نیچے دبی ہوئی نظر آئی تو دل نے سمجھا کے کیوں ہم ہر فیلڈ میں پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم اپنے ہنر پر، اپنے ٹیلنٹ پر فخر کرنے کا انہیں یاد کرنے کا کام عرصہ ہوا بھول چکے ہیں۔

منور ظریف کی قابل دید فلمز میں سے چند ایک، ضدی، بجن بے پرواہ، باؤ جی، شریف بدمعاش، ملنگی، عشق دیوانہ، نوکر ووہٹی دا، عشق، ہیر رانجھا، بنارسی ٹھگ، شرارت، رنگیلا اور منور ظریف، زینت اور سب سے بڑھ کر جیرا بلیڈ۔ ان فلموں میں ادا کار کی اداکاری ایسی ہے کہ خود بخود ہنسی آجاتی ہے، مزاح اور بے ساختگی کا مطلب سمجھ آتا ہے ظرافت کا انکشاف ہوتا ہے ......بغیر کسی فحش کلامی کے، لچر جگت بازی کے، بے ہودہ اشاروں کے بھی کامیڈی ہو سکتی ہے اور یہ منور ظریف کی جاندار اداکاری کو دیکھ کر سمجھ آتا ہے۔ میں نے ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو کر دیکھا اور سوچا مگر مجھے اس فنکار کے پائے کا ایک بھی کامیڈین پورے ہندوپاک میں نظر نہیں آیا اور اس کی برسی پر ایک چھوٹی سی خبر نے دل کو اور بھی اداس کیا......ہم اپنے ٹیلنٹ کو، اپنے لوگوں کو چھوڑ کر اندھا دھند دوسروں کے پیچھے پاگل ہو رہے ہیں یا پھر اپنے لیے ایک خود ساختہ پستی منتخب کر چکے ہیں۔ آج جو کامیڈی کے نام پر ہمارے سٹیج ڈراموں میں ہو رہا ہے اس سے زیادہ پستی شاید اور کوئی نہ ہو میں نے زبانی کلامی فحش گوئی کی ایسی مثال کسی زبان اور کسی کلچر میں نہیں دیکھی سنی۔

منور ظریف کی ایک فلم کا سین ہے کہ وہ کسی دوست کے گھر جاتا ہے اور اسے کہتا ہے مجھے اپنا دولت خانہ تو دکھاؤ۔ دوست کہتا ہے دولت تو رہی نہیں تو منور ظریف اٹھتے ہوئے انتہائی سادگی سے کہتا ہے۔ خانہ جے خراب نہیں تے او تے دکھا (اگر خانہ خراب نہیں ہوا تو وہ تو دکھا دو) اور مجھے لگتا ہے اب ہر فیلڈ میں ہمارا خانہ ایسے خراب ہو چکا ہے کہ دکھانے جوگا بھی نہیں رہا۔ گلوکاری کا حال دیکھ لو بڑے بڑے سنگرز کی کوئی قدر نہیں، کہیں ریشماں برے حال میں ہے تو کہیں مہدی حسن کو ہم بھول چکے ہیں، کہیں غلام علی نظر انداز ہو چکا ہے تو کہیں تصور خانم گمشدہ ہیں، نہ نیرہ نور

کی خبر ہے نہ نیلما ثانی کا کچھ پتہ ہے، مسرت نذیر غائب اور نبیلہ رعنانہ جانے کب سے حالات سے مفرور ہو چکے ہیں۔ کس کس کا نام لوں جو زندہ ہیں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں، جو گزر گئے انہیں تو تاریخ کے صفحوں سے مٹانے کیلئے ہم خود بے قرار ہیں۔

انڈیا کا ایک شو ہے کے فار کشور جس میں سب مقابلے میں حصہ لینے والے کشور کے گانے گاتے، اس کے حصائل وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ اس طریقے سے وہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ کشور سے بڑا گلوکار کوئی نہیں، ہمارا ایک نوجوان وہاں حصہ لینے پہنچا تو کہنے لگا کاش میرا نام (میں بھول رہی ہوں) فرض کرتے ہیں ظفر علی کی بجائے ظفر کشور ہوتا۔ وہاں بیٹھے ججز میں سے ایک (کشور کے بیٹے) نے اسے ٹوکا اور کہا جس دھرتی سے تم آئے ہو وہاں ایسے نام ہیں جنہیں کشور دا بھی پوجتے تھے اور ان میں سے ایک غلام علی ہیں۔ تم اپنے نام کے ساتھ علی پر ہی فخر کرو مگر ہمارے نوجوانوں کو ایسا سکھایا نہیں گیا شاید اس لڑکے کو تو یہ بات سمجھ ہی نہ آئی ہو۔

ہم جس ماحول میں بڑے ہوئے ہیں اس میں ہم صرف اپنے پر شرمندہ ہوتے ہیں، اپنے سیاست دانوں پر، اپنے سٹیج ڈراموں پر، اپنے کھلاڑیوں پر، اپنے سنگرز پر، اپنے اداکاروں پر۔ ہماری نسل کو آمریت اور گھٹن کھا گئی۔ جوانی کے وہ سال جب ٹیلنٹ پنپتے ہیں، جب کونپلیں پھول بنتی ہیں، ہماری نسل کے وہ سارے سال جنرل ضیاء الحق کھا گیا، اس نے تو ہمارے کلاس رومز میں ٹھنڈی ہوا بھی نہیں پہنچنے دی۔ اور اب کی جوان ہوتی نسل کو دوسری حد یعنی بے شرمی اور بے حیائی کا ایسا سیلاب زدہ سمندر ملا کہ وہ اس کے تھپیڑوں میں بے بس ہو جاتے ہیں۔ انتہائی اندھیری کال کوٹھڑی سے ایک دم چکا چوند کرنے والی روشنی میں قدم رکھنے والی نسل کو اپنا آپ بچانا بھی نہیں آتا اپنی پہچان ہی نہیں کرا آتی ...... کیوں، کیسے، کب ...... ان سوالات کا جواب دینا تو دور کی بات ان سوالوں کا من میں اٹھنا ہی مشکل ہے۔

آمریت کے زیر سایہ ہمارا ملک صرف سچے سیاستدان ہی پیدا کرنے میں بانجھ نہیں ہوا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم سچائی سے محروم اور نقالی میں ماہر ہو گئے ہیں۔ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہے کہ

ہم اپنی آدھی عمر یہ تعلیم لینے میں برباد کر دیتے ہیں کہ باقی کی عمر کیسے برباد کرنی ہے۔ ہماری کھیل کا یہ سٹینڈرڈ ہے کہ سوائے سکینڈلز کے اور کچھ کھلاڑیوں کو بنانا نہیں آتا۔ ہماری سیاست کا معیار بدمعاشی ہے جو جتنی بھی کر لے۔ ہماری گلوکاری کا یہ حال ہے کہ جو جتنی پبلک ڈیلنگ کر لے، اداکاری میں جو جتنا انویسٹ کر لے جس کے جتنے تعلقات ہوں، کامیڈین وہ کامیاب جو جتنی زیادہ جگت بازی اور فحش گوئی کر لے ایسے مصنوعی ماحول میں اصل اور خالص لوگ کہیں کھو گئے ہیں۔ اور ہم ان پر فخر کرنا بھول گئے ہیں۔

منور ظریف جیسے لیجنڈ کی برسی کے موقع پر اسی فیلڈ کے اداکاروں سے درخواست ہے جس میں سرفہرست سہیل احمد ہے جس نے ماضی میں بہت کلاس کے کامیڈی سٹیج ڈرامے تخلیق کیے کہ وہ اپنے سفر کی منزل نہ بھولیں...... اصلاحی اور کامیڈی ڈرامے دوبارہ سے بنانے شروع کریں۔ پیچھے کھڑے ہو کر ڈانس کرتی فحش اشارے کرتی، اداکاراؤں کے پرموٹر نہ بنیں۔ سٹیج ایک ادبی سلجھا ہوا میڈیا ہے اسے کوٹھوں میں تبدیل نہ کیا جائے۔ جو جہاں کھڑا ہے وہیں سے اپنے ملک کو بچانے کی کوشش کرے تو ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے کا رجحان بھی ختم ہوگا۔ اور ہر کوئی اپنے حصے کی ذمہ داری نبھائے تو ہمارا ملک تب کہیں جا کے ہر فیلڈ میں ایک معیار قائم کر سکتا ہے۔

☆☆☆

بارش روٹھ بھی جائے

ایک بیٹے کو باپ کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ ایک بیٹی کو باپ کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ بیٹا جب چھوٹا ہوتا ہے تو اسے باپ کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے اچھی باتیں سکھائے جو اس کے باپ نے اسے سکھائی ہوتی ہیں، اسے پلے گراؤنڈ میں لے جائے جہاں اسے کھیلنا سکھائے اس کے ساتھ کھیلے اور اسے کھیل کھیل میں زندگی کے کھیل کے مشکل گر سکھاوے اور جب وہ بچہ بڑا ہونے لگتا ہے تو اس لمحے بھی اسے ایک باپ کی، ایک دوست کی ضرورت ہوتی ہے اس پر جب ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ گھبراہٹ کا گھٹن کا شکار ہوتا ہے جب اس کی زندگی میں حوصلہ کم پڑنے لگتا ہے تو اسے کندھے پر ایک ہاتھ محسوس ہوتا ہے جو اسے یہ احساس دلاتا ہے کہ دنیا بھلے ہی تمہارا ساتھ چھوڑ جائے، میں تمہارے ساتھ ہوں اور وہ ہاتھ ایک باپ کا ہوتا ہے جو مصیبت میں ہمت بندھاتا ہے، اعتماد لوٹاتا ہے اور زندگی میں وہ رسیاں دکھاتا ہے جسے تھام کر اس کا بیٹا خوف اور

مایوسی کی دلدل سے باہر آ جاتا ہے اور وہ بیٹے خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں ایسے باپ ملتے ہیں اس لئے باپ کے یا باپ کی توجہ کے بغیر بیٹوں کی شخصیت ادھوری رہتی ہے ان میں احساس کمتری ہر دم رہتا ہے۔

اسی طرح ایک بیٹی کو ایک باپ کی ضرورت ہے وہ جب چھوٹی ہوتی ہے تو باپ اسے گودوں میں کھلاتا ہے اس کے منہ میں کھانا ڈالتا ہے اور ماں جب بیٹی کو ڈانتی ہے تو وہ تڑپ کر کہتا ہے میری بیٹی کو کچھ نہ کہو۔ یہ میرے آنگن میں مہمان ہے اس لمحے بچی خوفزدہ ہو جاتی ہے، وہ اس خیال کو سوچ نہیں سکتی کہ جو ساری دنیا میں ایک اپنا لگتا ہے وہ بھی اس کے لئے غیر ہو جائے گا۔ وہ یہ بات سوچ نہیں سکتی اور اس کا دل کانپتا رہتا ہے اور وہ باپ کے آنگن کے پرائے ہونے کے خوف سے سارا بچپن لرزتی رہتی ہے اور اس کا باپ اس خیال سے وحشت زدہ بیٹی کو پروں میں چھپانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، دن بھر محنت مزدوری کر کے جب وہ لوٹتا ہے تو انتہائی تھکاوٹ کے باوجود بیٹی کو سینے پر ڈال لیتا ہے۔ آنکھوں میں اس کے لئے سنہرے مستقبل کے خواب سجاتا اور دل ہی دل میں اس خوف سے کانپتا ہے کہ یہ خواب جھوٹے نہ پڑ جائیں، راستے کھوٹے نہ ہو جائیں۔ میری بیٹی کی منزلیں دھندلی نہ ہو جائیں۔ بیٹی باپ کے مضبوط ہاتھوں میں اس سوچ سے بہت دور چلی جاتی ہے کہ زندگی کبھی کڑوی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ مضبوط ہاتھ کبھی اس کے سر سے اٹھ بھی سکتے ہیں۔ یہ بادل کبھی پرایا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سدا سمجھتی ہے کہ باپ کی محبت ایسا دریا ہے:

کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔

ایک بچے کو اپنا باپ دنیا کا خوبصورت ترین انسان نظر آتا ہے اور فادرز ڈے پر ان سب باپوں کو سلام جو دن رات اپنے بچوں کے لئے محنت کرتے ہیں جن کی صبح اس امید سے شروع ہوتی ہے کہ آج سورج کی حرارت سے اپنے بچوں کا حصہ کمانا ہے، آج کی ہواؤں سے اپنے بچوں کے لئے کل سے بھی زیادہ حصہ لینا ہے۔ معاشرے میں ان کو اونچا مقام دلوانے کے لئے ایک جنگ ہے جو سپاہی کی طرح لڑنی ہے۔ اپنی خوشیوں کو قربان کر کے اپنے بچوں کے لئے ایک نئی منزل کی

بنیا د رکھتی ہے، پڑھائی میں، کھیل میں، دین میں، دنیا میں ہر جگہ انہیں وہ مقام دلواتا ہے جو سب سے بہتر ہے۔ حفاظت کرنیوالے، اچھی پرورش کرنے والے باپ بچوں کی ایسی ضرورت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں جو گھر میں سکون کی روشنی پھیلاتے ہیں اور اپنے بچوں کو سرد گرم سے بچاتے ہیں جن کے پسینوں سے ان کے بچوں کے مستقبل چمک جاتے ہیں ایسے باپ محبتوں، عزتوں اور سلاموں کے مستحق ہیں۔

اکثر عورتیں کینیڈا میں آ کر طلاق کی بات کرتی ہیں، شوہروں سے تنگ عورتیں مجھ سے جب کوئی مشورہ لیتی ہیں تو میرا ان سے ایک ہی سوال ہوتا ہے کیا تمہارا شوہر تمہارے بچوں کیلئے اچھا باپ ہے اور جن کا جواب ہاں میں ہوتا ہے تو میں ان کی منت کرتی ہوں کہ تمہیں تو دوسرا محبت کرنیوالے شوہر شاید مل جائے مگر ان بچوں کو تم اس جیسی محبت کرنیوالا باپ نہ لا کر دے سکو گی اور ساری عمر پچھتاؤ گی۔ بچوں سے ان کا باپ نہ چھینو اور خاموشی سے زندگی اسی آدمی کے ساتھ گزار دو اور اگر باپ بچوں سے بھی بے پرواہ ہے تو پھر انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ باپ کے نام پر کون ہے؟ پھر اپنی زندگی کی خوشی دیکھو۔ بچے مرد کو باپ بنا کر خوبصورت بنا دیتے ہیں اور باپ اپنا نام، اپنا ہاتھ بچوں کی پشت پر رکھ کر انہیں طاقت دیتے ہیں۔ بڑا ہی خوبصورت رشتہ ہے اور ذمہ داری کا احساس اسے اور بھی حسن بخش دیتا ہے۔

☆☆☆

محبت آزادی مانگتی ہے؟

آزادی اظہار......اس کا تانا اپنے عالم فاضل بھائی بندوں کا اسلام اور پاکستان کے خلاف زہر اگلنے پر ہی کیوں ٹوٹتا ہے؟

آزادی اظہار پر یقین رکھنے والے سب محققین کو میرا ایک عاجزانہ چیلنج ہے۔ Holocaust پر تحقیق کریں، مغربی ممالک کے دور نئے معیارات پر اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائیں، جگہ جگہ پھیلی ہوئی تعصب کی لہر کو کھوجیں۔ ان انسانیت دوست عالموں سے، دانشوروں سے التجا ہے کہ ان معصوم بچوں کی زندگیوں کو بدلنے کے لئے کوئی ایسا کام کریں جو دنیا کے غربت زدہ ممالک میں اس لئے ہر کسی کی ہوس کا نشانہ بن جاتے ہیں کہ ان کے پیٹ کو روٹی چاہیے ہوتی ہے۔ اگر ان کی روح بہت پیاسی ہے، بہت متجسس ہے تو دنیا میں بہت دکھ ہیں، بہت آہیں ہیں، ان کی تہہ تک جائیں، ان کے حل دنیا کو پیش کریں، مگر یہ آزاد خیال، بڑے بڑے دانشور، انسانیت نواز، اپنی عقل سے دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کا دل دکھانے کا باعث بنتے ہیں اور پھر کہتے ہیں ہم انسانیت سے محبت کرتے ہیں، ہمارا مذہب ہی انسانیت ہے، یہ کیسی انسانیت ہے کہ جب جب آپ کا منہ کھلے لوگوں کا دل اندر سے ہل جائے کیونکہ کبھی تو آپ ان کے پیارے مذہب کو، ان

کے نبی کو، ان کے رب کو، ان کی ثقافت کو اور کبھی ان کی دھرتی ماں کو کوسیں ...... تو یہ کہاں کی انسانیت دوستی ہے اور کہاں کا انسانوں سے پیار ہے۔

پیار، محبت اور عشق یہ کسی عقیدے سے جڑ کر، کسی مذہب کی بازو تھام کر، کسی کلچر کا حصہ بن کر، کسی رسم کی رسی پر چڑھ کر آتے ہیں۔ مجھے ترس آتا ہے ان لوگوں پر جو کسی بھی رشتے کے بغیر، کسی بھی عقیدے پر یقین رکھے بغیر مارے مارے آوارہ بنجارے سے پھرتے ہیں، ان کی آنکھوں کے خالی پن پر بہت ترس آتا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ محبت کیا ہے؟ اپنی دل کو سرنڈر کرنے میں کیا مزہ ہے، انہیں بتانا پڑتا ہے، اپنی انا کو، اپنی عقل کو تھالی میں سجا کر ان کے ساتھ محبوب کے قدموں میں ڈھیر کر دو، اس میں تکمیل کا کیسا گہرا احساس ہے یہ بتانا پڑتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے اس کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے میں کیسی لذت ہے، خاموش ایمان کی کیا طاقت ہے، ان دیکھا درد کیا ہے، اور یہ محبت کا کیسا معجزہ ہے کہ محبوب کی کوئی بات آپ کو بری نہیں لگتی، لیلیٰ کالی ہی کیوں نہ ہو، سسی عقل سے پیدل ہی کیوں نہ ہو...... عشق تو چیز ہی ایسی ہے۔ محبت کی تعریف ہی یہ ہے کہ محبوب کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔ اس کی ہر برائی اچھائی لگتی ہے۔ اس کا ہر عیب ہنر لگتا ہے۔ جو لوگ محبت کی اس چاشنی سے آشنا ہوتے ہیں وہ بلاشبہ خوش قسمت لوگ ہیں۔

تاریخ کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اسلام کو، پاکستان کو ایسے ہی عاشقوں کی ضرورت ہے، جو صرف اپنے محبوب پر فخر کریں، اور ہمارا محبوب ہمارا رب ہے، ہمارے رسول پاکؐ ہیں، ہمارا کلچر اور ہمارا پاکستان ہے۔ جب ساری غیر مسلم دنیا ایک بڑے گہرے تعصب کے ساتھ ہم پر کالی نگاہ کیے ہوئے ہے تو ایسے میں ہماری، اسلام اور پاکستان کے لئے محبت کی شرط ایک خالص محبت کی ہونی چاہئے ...... اسلام پر انگلی، پاکستان کی تعمیر میں کیڑے، قائداعظمؒ بہت اچھے تھے یا برے، اقبالؒ کیا کرتے تھے کیا نہیں ......

کس دا دوش سی کسی دا میں سی

اے گلاں ہن کرن دیاں نہیں

وہ جو کر گئے دنیا میں اپنا آنے کا مقصد پورا کر گئے، آپ بھی کچھ مثبت سوچیے، صرف ان کی ذات پر کیچڑ اچھال کر اپنے آپ کو دانشور، محقق اور انسانیت دوست ثابت نہیں کر پائیں گے۔ زندگی میں بہت سے حال کے دکھ ہیں، ہمارے باعزت بچاؤ کے دکھ ہیں، ہم ہماری کشتی کو سوراخوں سے بچانے کے المیے میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں اس وقت بہت خالص عاشق چاہئیں......جن کو اپنے محبوب کی ہر بات اچھی لگے، اور جو اپنے محبوب کی ہر ادا پر قربان ہو جائے۔

بچے تھے تو محلے میں سے جب بھی کوئی کھانے کی چیز بھیجتا، ہم اپنی امی سے کہتے کتنا اچھا کھانا آیا ہے، آپ ایسا کیوں نہیں بناتی؟ بعد میں پتہ چلتا اس گھر کے بچوں کی ماں یہی دہائی دیتی نظر آتی کہ آپ کے کھانے کے میرے بچے دیوانے ہیں۔ بڑے بہن بھائیوں کو اکثر اپنے بہن بھائیوں سے زیادہ دوسرے چھوٹے بچے اچھے لگتے ہیں۔ پھر سنا اکثر کچے دماغ والے آدمیوں کو دوسرے کی بیوی زیادہ اچھی لگتی ہے...... یہ سوچ بڑی بچگانہ اور غیر متوازن ہے کہ دوسرے کی چیز کو للچائی نظر سے دیکھنا......مگر اب پتہ چلا یہ سوچ پھیل کر انسان دوست اور دانشوری کی شاخ پر جا بیٹھی ہے......اور یہ اپنے ہی عالم فاضل لوگ کہتے ہیں۔ گاندھی، قائداعظم سے بڑا لیڈر تھا اور بدھ ازم اسلام سے بڑا مذہب ہے۔ میں تو سمجھتی تھی صرف بچے اور کچے دماغ کے لوگ ہی اپنی چیزوں کو کمتر اور دوسروں کی چیزوں کو برتر خیال کرتے ہیں، مگر یہاں تو بڑے بڑے کئی کئی کتابوں کے مصنف اپنا دامن نوچتے نظر آتے ہیں۔ اپنے سر میں خاک ڈال کر مشہور ہونے کا ڈھنگ تو پہلے وقتوں میں پاگلوں کو آتا تھا۔ اس ہنر نے بھی ماڈرن ازم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور اپنے انہی کھوٹے سکوں کی شہ پر جب مغربی دنیا کبھی ہمارے محبوب پیغمبر کے کارٹون چھاپتی ہے تو کبھی کوئی زہر آلود فلم ریلیز کر دیتی ہے......جیسے پوری دنیا میں تحقیق کے موضوع رک گئے ہوں، جیسے آزادی اظہار صرف ایک جذبے کا نام رہ گیا ہو......نفرت، اسلام کے خلاف نفرت اگلنا، آج کا آزادی اظہار صرف ایک یہی لباس اوڑھے ہے۔ غیروں کو پوچھیں یا اپنے کھوٹے سکوں کو الزام دیں...... جو بھی ہے آج اسلام کو سچے عاشقوں کی ضرورت ہے......آج میرے پاکستان کو ایسی سچا پیار کرنے والی ہیر کی

ضرورت ہے جو رانجھا راضی کر دی آپ رانجھا ہوئی اور کوئی سوال نہیں، کوئی انگلی نہیں اٹھائی...... جو کہے یہ لو میرا سر، میری انا، میری عقل سب اس پلیٹ میں ہیں..... تو چاہے جیسے مرضی استعمال کر۔ اور ایسے سرنڈر کر دیں:

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

عقل اور دماغ کو دوسرے بہت سے موضوعات ہیں ان میں بھی لگایا جا سکتا ہے..... اپنی چیزوں پر، اپنی شخصیات پر، ہیروز پر، اپنے عقیدوں پر، اپنی سرحدوں پر فخر کر کے تو دیکھو..... دنیا میں کوئی عملی، مثبت کام بھی کر کے دیکھو۔

☆☆☆

سوشلزم کی الف لیلوی داستان

وینز ویلا کو لمبس نے 1498ء کو دریافت کیا۔ 1821ء کو اس نے آزادی لی۔ 1830 کو ری پبلکن سٹیٹ بنا 1946ء میں جمہوریت اس ملک میں پروان چڑھی۔ یہ ملک جنوبی امریکہ کے شمال میں ہے، مشرق سے یہ گیانا کو چھوتا ہے، مغرب سے کولمبیا سے باہیں ملاتا ہے، جنوب میں برازیل اور شمال سے North atlantic ocean کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس ملک کی بات میں کیوں کر رہی ہوں، کیونکہ اس ملک میں ایک صدر ہے جس کا نام ہوگو شیوز ہے جو اس ملک کی قسمت کے ساتھ 1998ء میں داخل ہوا۔ جس نے لوگوں سے تین وعدے کیے غربت کا خاتمہ، صرف دو ہی سیاسی جماعتوں کا سیاست میں عمل دخل نہیں ہوگا اور تیسرا وعدہ تھا کرپشن کا خاتمہ۔ پہلا سال اس نے پولیٹیکل نظام جو صرف دو سیاسی جماعتوں کے درمیاں میں ہی پنگ پانگ بنا ہوا تھا، اس کو ٹھیک کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ اس نے غربت کے خاتمے کے لئے سوشلزم کا انتخاب کیا۔ سب بنک، ریلوے لائن، سکول، یونیورسٹیز، بجلی، گیس اور سب سے بڑھ کر آئل ریفائیزی، ان سب کو نیشنلائز کر دیا یہ تھا، دولت کی مساوی تقسیم کا ایک راستہ جو اس صدر نے چنا۔ 2000ء میں اس کا دھیان اس شعبے کی طرف گیا جو سب سے مہنگا، اور سب سے زیادہ ملک کے ذرائع کھانے والا ملٹری کا ڈیپارٹمنٹ تھا مگر کام کیا کر رہا تھا؟ سو اس نے بجائے اس کے کہ اپنی ملٹری کو دوسرے ملک پر چڑھائی کرنے بھیجے یا پھر اس کا دھیان حکومت کرنے کی طرف جانے دے اس نے کہا بھائی میروں کمریں کسو اور لوگوں کی خدمت کرو۔ تو اس نے آرمی، جس میں نیوی، ایئر فورس، سب شامل تھے، ان سے لوگوں کے گھر بھی بنوائے، ان سے ان غریبوں کو جو ملک کے

ایسے حصوں میں تھے جہاں غربت انتہا کو پہنچی تھی، وہاں سے migrate کروایا۔ آرمی کو لوگوں کی فلاح کیلئے استعمال کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مفت کی روٹیاں توڑتے ان کو فائدہ مند کاموں میں جوت دیا اور یہ تھا Plan Bolivar 2000 جس میں آرمی کے ہر شعبے سے کام لیا گیا۔ اس میں مخالفت بھی تھی اور کرپشن کا گمان بھی ہوا، مگر پھر بھی اس کے تحت لاکھوں گھر، سکول، پارک، چرچ اور شفا خانے بنے۔ دو ملین سے زیادہ لوگوں کو طبی سہولتیں فری فراہم کی گئیں۔ کیوبا سے ایک معاہدہ کیا گیا، کیوبا کو بہت سستے داموں تیل دے کر (چونکہ وینزویلا تیسرا یا چوتھا بڑا تیل پیدا کرنے والا ملک ہے) اس سے 25000 ڈاکٹرز منگوائے گئے۔ لوگوں کو مفت طبی سہولتیں دی گئیں۔ لاکھوں بچوں کو ویکسینیشن مفت کی گئی اس پلان کے تحت بہت سے ناممکن کام ممکن ہوئے۔ 2001، 2002 غربت کے خاتمے کے سال تھے جس میں Inflation کا خاتمہ معیشت کو مستحکم کرنا اور NON OIL ذرائع سے revenue پیدا کرنا۔

ارادے اور پروگرام شیوز سے پہلے والی حکومتوں کے بھی تھے مگر ان کو پایہ تکمیل تک کوئی نہ پہنچا پایا تھا، مگر اس حکومت نے بڑے دلیرانہ طریقے سے ان کو Implement کرنا شروع کیا مگر وہی جو ہوتا آیا ہے آرمی ایکشن اور بزنس مینز کی بغاوت، ہوگو شیوز کو حکومت سے فارغ کر دیا گیا مگر یہ کیا پورے کا پورا وینزویلا ایوان صدر کے باہر دھرنا مار کر بیٹھ گیا، مجبوراً گورنمنٹ پھر ہوگو شیوز کے پاس آ گئی۔ وہ دفعہ منتخب ہونے والا صدر ایک دفعہ پھر پوری عوامی طاقت کے ساتھ ایوان صدر میں جلوہ گر ہوا۔ امریکہ کے پہلو میں بیٹھ کر اپنے طریقے سے حکومت کرنے والا بہادر صدر، جہاں جہاں امریکہ کے ظلم موجود ہیں اس صدر کی ان ان مظلوم ملک کے صدر کے ساتھ تصویر اور ہاتھ ملانے کا عمل جاری ہے۔ اس کو اپنے عوام کی طاقت حاصل ہے جس طاقت کے آگے امریکہ بے بس ہے سو اسی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے یہ صدر لبنان کے حماس سے بھی ہاتھ ملاتا ہے اور ایران کے صدر احمدی نژاد کے ساتھ بھی تیل کے معاہدے کی بات کھل ڈل کر کرتا ہے کیونکہ اس کے عوام وہ فگرز دیکھتے ہیں جو ان کو امریکہ جیسے ملک سے بھی بالاتر لگتی ہے۔ وہ دیکھتے

ہیں کہ اس صدر کے سوشلزم نے انہیں غربت کی لائن سے اوپر لا کھڑا کیا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا ہیلتھ سسٹم فری ہے اور امریکہ جیسے بڑے ملک میں جہاں Capitalism کا بول بالا ہے وہاں آج بھی مہنگے مہنگے ہیلتھ انشورنس بک رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ملک کی Poverty line گزشتہ سال سے 8% کم ہو گئی ہے جبکہ امریکہ جیسے ملک میں 12.3% زیادہ ہو گئی ہے۔ ان کی معیشت ترقی کر رہی ہے دوسری طرف امریکہ میں معیشت کا حال برا ہے۔ بیروزگاری کی شرح وینزویلا میں دن بدن کم ہو رہی ہے دوسری طرف امریکہ میں بڑھ رہی ہے۔ آبادی کا تناسب بھی امریکہ میں وینزویلا سے زیادہ ہے۔ وینزویلا میں تعلیم بھی بہت عام اور سستی کی جا رہی ہے ہائر ایجوکیشن کیلئے گرانٹس دھڑا دھڑ دی جا رہی ہیں۔ یعنی کون سا ترقی کا کام ہے جو ڈھائی کروڑ کی آبادی کے اس ملک میں نہیں ہو رہا۔ سو سرمایہ دارانہ نظام کے منہ پر اس کو ایک طمانچہ بھی سمجھا جا سکتا ہے اور امریکہ کی بغل میں بیٹھ کر اتنی گستاخیاں کرنا ایک معجزہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر معجزے کرنے کے اہل وہی سربراہان مملکت ہو سکتے، امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرات وہی حکمران کر سکتے ہیں جن کے دامن صاف ہیں اور جو اپنی عوام کو خوش کرنے میں کامیاب ہیں، ہوگو شیوز اپنی غریب عوام میں اس قدر پسند کیا جاتا ہے اور اس کی یہ پسندیدگی کسی خوشبو کی طرح اس کے اڑوس پڑوس کے ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہے کہ جہاں بھی اس کے پڑوس کے جس بھی ملک میں الیکشن ہوتے ہیں اور جس نمائندہ کو ہوگو شیوز کی حمایت حاصل ہوتی ہے وہی اپنے ملک میں جیت جاتا ہے۔ کیسی بات ہے اور یہ بات کیونکہ ممکن ہوئی؟ یہ الف لیلہ کی داستان کیسے حقیقت بنی کیونکہ ہوگو شیوز نے اپنے لوگوں کو عملی طور پر اتنا مالا مال کر دیا ہے کہ وہ اپنے اس حکمران پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں۔ چنانچہ نہ کوئی آرمی، نہ کوئی محلاتی سازش اور نہ امریکہ کا گہرا جال آج تک اس کی گرد کو چھو سکا، جس نے کوشش کی وہ ناکام ہوا۔ ہوگو کے پاس اس کے عوام کی سچی طاقت ہے اور یہ طاقت اسے اس کے خلوص کے ساتھ کئے گئے عوامی کاموں کے بدلے ملی۔ سو یہ انگوٹھی کا وہ نگ ہے جو الف لیلی کی داستانوں میں پڑھتے ہیں کہ ایک بزرگ بہادر

شہزادے کو دیتا ہے کہ اسے اپنی انگلی میں پہنے رکھو گے تو کوئی جادو کام نہ کرے گا۔ سوہوگوشیوز کی بہادری کو لوگوں کی طاقت کے نگ نے چار چاند لگا دیئے ہیں اور اسی طاقت نے سوشلزم کو کامیاب اور کیپٹلزم کو ناکام ثابت کر دیا ہے۔ اور اسے لوگوں کو اس نگ کو پانے کے لئے اپنے آپ کوئی امتحانوں سے گزارنا پڑا اپنے ذاتی مفاد سے دور، کرپشن سے دور اور لوگوں کے حق میں کئے گئے بہتری کے کام کا یہ انعام ہے، جسے ہم عوامی طاقت کہتے ہیں، جو آج کل کسی حکمران کو میسر نہیں اور جس کو میسر ہے اس کے نزدیک اس سے بڑی دولت اور کوئی نہیں۔ اس دولت کے سہارے اسے کسی کے آگے سر جھکانے کی نوبت نہیں آتی۔

اور سمجھو تو اس سے بڑی دولت اور کیا ہو سکتی ہے اور شان کیا ہو سکتی ہے اور عزت کیا ہو سکتی ہے اور یہ ہمارے مفاد پرست حکمرانوں کے نصیب میں ہو نہیں سکتی کیونکہ ہمارے پاس کسی بزرگ کی انگوٹھی کا نگ نہیں بلکہ کسی چڑیل کے ڈھیر سارے لوٹے ہیں۔ جو ہم جہاں بھی جاتے ہیں ہمارے نمائندوں کی شکل اختیار کئے ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں امریکہ کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں اور ہمارا سارا زور امریکہ کو خوش کرنے میں لگ جاتا ہے اور پھر بھی ہم غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، ہماری معیشت برباد اور تقدیر پھوٹی ہے۔

☆☆☆

سلے ہوئے ہونٹ اور فنگر پرنٹس

کوٹ لکھپت کی ایک جیل میں پولیس نے رشوت نہ دینے پر ایک قیدی کے ہونٹ سی دیے۔ بڑی لرزہ خیز تصویر تھی مگر یہ سمجھ نہیں آئی کہ پولیس اتنی بیوقوف تھی کہ اس قیدی کو اسی حالت میں عدالت لے گئی اور کورٹ نے قیدی بچارے کی حالت دیکھ کر تفتیش کا حکم دے دیا؟ اور سب باتوں کی سمجھ تو آتی ہے مگر یہ سمجھ نہیں آتی کہ پولیس نے اتنی بے وقوفی کیسے کر دی ایک تو ہونٹ سی دیے اور دوسرا اسے عدالت میں لے آئی۔

ہونٹ سینے کی ضرورت کسے ہے آج کل۔۔۔ سب ہونٹ سلے ہوئے ہیں سب زبانیں بند ہیں اور سب گردنیں جھکی ہوئی ہیں آج کل تو کسی کو بد دعا دینی ہو تو اسے کہہ دیا جائے جا اللہ کرے تیرا ضمیر زندہ ہو جائے تیری زبان سچ اگلنے لگے اور تیرے ہاتھ ظلم کو روکنے کے لئے اٹھیں۔۔۔ایک بندے کے لئے یہی بد دعا، یہی دشمنی کافی ہے۔۔۔کیونکہ اس کے بعد دنیا اس کا وہ حال کرے گی کہ زمانہ دیکھے گا۔ ان سلے ہوئے ہونٹوں کی تصویر مجھے بہت کچھ دکھا گئی ہے، یہ تو نظر آنے والے سلے ہوئے ہونٹ تھے۔۔۔ان سب ہونٹوں کی تفتیش کا حکم کون سی عدالت دے گی جو ہر سچ کو دیکھ کر سل جاتے ہیں اور جن کی سلائی نہ نظر آنے والی ہے۔ ہم لوگوں کا مشترکہ کردار ایک سلا ہوا ہونٹ ہے بہت بڑا سا سلا ہوا ہونٹ اور ہم نے اسے خود ہی رکھا ہے اس کے لئے ہمیں کسی پولیس کے ظلم کی یا

کسی بادشاہت کے خوف کی ضرورت نہیں ہم اس میں خود کفیل ہیں اللہ کی مہربانی سے یہ ہنر نہ جانے کب اور کہاں ہم سب میں چپکے سے وودیت کر گیا ہے۔ اس سلے ہوئے ہونٹ کے ساتھ ہم بہت کامیاب ہیں۔ ہمارا سچ ہمارے اندر کہیں مر گیا ہے، ہماری آنکھوں میں خوشامد ہے، سکوں کا لالچ ہے، ہمارے دل میں درد نہیں بچا اور ہمارے دماغ نے غلامی کو چپکے سے قبول کر لیا ہے۔

میں سورہ بقر میں پڑھ رہی تھی منافق کی نشانی، متقی کی نشانی، کافر کی نشانی، میں کانپ اٹھی ہمارے گرد کوئی بھی متقی نہیں اور نہ کوئی کافر، ہمارے گرد صرف منافقین ہے جن کے دل سخت ہو چکے ہیں، جو جھوٹ کو سچ مان کر پھیلا رہے ہیں جو نیک ہونے کا دعوی کر کے برائی کو پورے دل و جان سے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں میں کانپ گئی کوئی متقی نظر نہیں آتا حتی کہ کوئی کافر بھی نظر نہیں آتا ہر کوئی اصلاح پھیلانے والے کے روپ میں فساد برپا کیے ہوئے ہے جو مشکل سے ایک آدھا سچا، معصوم بندہ ہم میں آ گرتا ہے، ہم اس کو وہ سبق سکھاتے ہیں کہ اس کی نسلیں مدتوں یاد رکھیں، میں آپ کو بھی یاد کرواتی ہوں اس خوبصورت سورۃ میں خدا کیا نشانی بتاتا ہے منافق کی۔۔ اس کے بعد اپنے آپ میں جھانکیں، آئینے میں صورت دیکھیں، آپ بھی میری طرح کانپ اٹھیں گے۔۔ پہلی نشانی وہ جھوٹ بولتا ہے، دوسری وہ امانت میں خیانت کرتا ہے، تیسری وہ فساد پھیلانے والا ہے اور کہتا ہے میں اصلاح کرنے والا ہوں، چوتھی وہ علم نہیں رکھتا اور کہتا ہے میں سب سے بڑا عالم ہوں اور وہ جب ایمان والوں کے ساتھ ہوتا ہے تو کہتا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں اور جب شیاطین کے ساتھ ہوتا ہے تو کہتا ہے میں تو ایمان والوں سے مذاق کر رہا ہوں اور اسکا دل بند کر دیا گیا ہے وہ ظلمت میں بھٹک رہا ہے۔۔ کیا آج ہم سب اسی مقام پر نہیں کھڑے؟ کیا یہ ہمارا ہی عکس نہیں ہے؟ کیا ہم سب گمراہ نہیں ہیں۔۔ کہہ دے کوئی کہ منافق کی ان نشانیوں پر ہم پورے نہیں اترتے۔

منافق کے لئے جو ذلت قرآن پاک میں ہے کیا ہم سب وہ نہیں بھگت رہے؟ کاش ہم میں کھل کر کفر کرنے کی ہمت ہو تو منافقوں کے لئے لکھی گئی ذلت سے تو ہم بچ سکیں مگر ہم میں کچھ بھی

کہنے کی جرات نہیں ہے۔ٹونی بلیئر ابھی جہاز پر ہی تھا، ابھی پاکستان پہنچا بھی نہ تھا کہ مرزا طاہر کو نہ صرف رہا کر دیا گیا بلکہ ایک خاص طیارے میں برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔۔ پاکستان کی حکومت کا سزا یافتہ اب برطانیہ میں ایک آزاد زندگی گزار رہا ہے۔۔ ایک نہ نظر آنے والی سلائی سے ہمارے ہونٹ سلے ہوئے ہیں اور ہم بول نہیں سکتے ہم صرف گردن ہلاتے ہیں ہمارے براؤن خون میں گورا صاحب کے آگے دم ہلانا لکھا ہے۔ ہم منافق ہیں اور اس عہدے کے ساتھ ہی ہمارے اندر صرف جھوٹ اور ریا کاری باقی بچتی ہے۔ سچائی کی بے خوفی اور کڑواہٹ ہم کہاں ہضم کر سکتے ہیں۔ ہم جھوٹے لوگوں کو پسند کرتے ہیں اور انہی کو مسند پر بٹھاتے ہیں ہمیں سچ زہر سے بھی برا لگتا ہے اور خوداری ہمارے اندر دور دور تک نظر نہیں آتی۔ اس سب باتوں کے لکھنے کا فائدہ بھی کوئی نہیں کیونکہ یہ لفظ بے معنی ہیں، ایسے ہی خانے بھرنے کے لئے، کاغذ بھرنے کے لئے۔ یہ لفظ بھی بہت کم ذات ہو چکے ہیں، خدا کا فرمان ہے کہ وہ منافقوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ اس لئے ان سب الفاظ تماشوں کا کیا فائدہ۔

مگر کبھی کبھی جی جاگ بھی اٹھتا ہے، کبھی کبھی اندھیرا چھٹتا بھی نظر آتا ہے جیسے آج ایک خبر نے چہرے پر بڑے عرصے بعد ایک مسکان پیدا کی۔ ایران کے صدر نے کہا جو بھی امریکی ایران آئے گا اس کو ایئر پورٹ پر فنگر پرنٹ دینے ہونگے، اس سے ان کی بے عزتی تو ہوگی مگر مسلمانوں کی یہ بے عزتی ہر جگہ ہوتی ہے۔ یہ صدر ڈرتا کیوں نہیں؟ اسے کسی کا خوف کیوں نہیں؟ اس کے پاس ایسا کیا ہے جو ہم پاکستانیوں یا دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے پاس نہیں۔ شائد یہ بے وقوف ہے آج کی تاریخ میں خوداری جیسی بے کار چیز لئے پھرتا ہے امریکہ بہادر سے ٹکر۔۔ جا بچہ تیری اب خیر نہیں۔ کہاں ہونٹ سلے دم ہلاتے لوگوں کے بیچ سے اٹھ کر ایسی آواز لگاتا ہے تو ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا ہے تیرا انجام اپنے ہی مسلمانوں نے وہ کرنا ہے کہ تو ابد تک یاد کرے گا کہ تو نے امریکہ سے ٹکر لینے کا سوچا، اس کی برابری کا سوچا۔۔ ہمارے لوگ تو دل دل میں فیصلہ کر چکے ہیں کہ یہ گورے ہی ہم پر راج کریں گے اور یہ جو مرضی کریں، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، کچھ نہیں کر

سکتے، ان کے پاس میڈیا کی طاقت ہے، ہم مسلمانوں کو آپس میں لڑوانے کی طاقت ہے اتنے طاقت ور سے کوئی عقل والا پنگا لے سکتا ہے؟۔۔مگر یہ ایرانی صدر؟ اس کے تو برے دن آئے کہ آئے۔اس ایرانی صدر کو کوئی بتائے کہ ہم انگریز کی وفاداری میں اتنے آگے ہیں کہ ہم یہاں کینیڈا میں بیٹھ کر کسی مسلمان کو اتنی جرات نہیں دیتے کہ وہ ان کا مقابلہ کر سکے۔جو کوئی چھوٹی سی سیٹ پہ بھی آگے جانے کی کوشش کرتا ہے ہم اس کا اتنے برے طریقے سے گھیراؤ کرتے ہیں اور اس کو دیوار میں چنوا کر اس کی جگہ کسی گورے کو بٹھا کر ہی سکون کا سانس لیتے ہیں۔ایسے میں بھائی اتنی مزاحیہ باتیں نہ کیا کرو۔۔۔کہ ہنسی آجائے۔امریکیوں کے فنگر پرنٹس؟ اتنی جرات۔۔ایک مسلمان ہو کر؟ ایک مسلمان ملک کا صدر ہو کر؟ اتنی جرات۔؟۔نہ نظر آنے والی سلائی سے اپنے ہونٹ سی۔۔اور ہم میں شامل ہو جا۔۔۔سب مل کر غفلت کی نیند سوتے ہیں، بے غیرتی کی روٹی کھاتے ہیں اور اپنی اپنی خودداریوں کا انگریز بہادر کے در پر رقص دیکھتے ہیں۔ہمیں ایسی باتوں سے تنگ نہ کر ہمیں بس تو سونے دے۔۔۔۔۔

☆☆☆

غربت۔ عادت۔ امارات

غربت موت اور زندگی کی طرح خدا کی طرف سے تحفہ نہیں ہے۔ غربت ہمارے اعمال سے، ہماری عادتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی سے ختم ہو سکتی ہے۔ غریب مظلوم نہیں بلکہ ظالم ہے اور اس کا ظلم اپنے آپ پر ہے۔ آپ اتنی دیر تک غریب رہ سکتے ہیں، جتنی دیر تک آپ چاہتے ہوں۔ کیا انسان کی طاقت اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ سے اپنے حالات بدل لے۔ غربت میں فطرت کا اتنا ہی ہاتھ ہو سکتا جتنا حادثات کا ہوتا ہے۔ طبعی درختوں پر اچانک کوئی کائی چڑھنے لگ جائے۔ اور کوئی تدبیر سے اس کائی کو دور نہ کر سکے تو وہ غریب ہے۔ اور جو اس پر قابو پالے وہ امیر ہے۔ خیرات سے غربت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ غربت کا خاتمہ دو چیزوں پر ہے حالات کے مطابق فیصلہ کرنا اور اگر ان حالات کے ساتھ آپ کی فطرت میل نہیں کھاتی تو اسے اس کے مطابق ڈھال لینا اور اس سب کے لئے ضروری ہے آپ کی اپنی نیت۔ ایک طرف بہتے پانی میں لڑھکتی چیزیں اس کے ساتھ بہتی جاتی ہیں، ہوا کے رخ سب اڑتے ہیں، یہ آسان ہے۔ بہتے پانی میں لڑھکتے لڑھکتے کوئی ایک دم احساس کرے۔ نہیں۔ میں یونہی بہتا گیا تو پستی میں جا گروں گا اور پھر اٹھ نہ پاؤں گا، اور وہیں سے سارا زور لگا کر اپنے سر کو اٹھا لے، وہ سکندر ہے۔ ہوا اپنی مرضی سے ایک سمت جا رہی ہے، اس کے سنگ اسی کی سمت میں اڑنا آسان ہے مگر ایک دم احساس ہوتا ہے کہ اس سمت میں موت ہے، شکست ہے اور تباہی ہے، احساس کی لہر اڑتے پرندوں میں سب میں پھیل جاتی ہے۔ کچھ سن کر بھی اپنے دھیان اپنی غفلت اور سستی میں اڑتے جاتے ہیں، اور جو ہوا

کے مخالف پوری طاقت لگا کر اڑ جاتے ہیں، وہی پرندے سنہرے گھونسلوں کے مستحق ہو جاتے ہیں ۔تاریخ ایسے لوگوں کے ناموں سے بھری پڑی ہے جو ہوا کی مخالف سمت میں اڑ گئے، یا جنہوں نے بہتے پانی کے دباؤ کو چیلنج کیا اور اپنا بہاؤ کی سمت کا تعین خود کیا۔

ابراہم لنکن بڑھئی کا بیٹا تھا، اور اس کی اڑان نے اسے امریکہ کا سولہواں صدر بنا دیا۔۔جس گھر میں خدا نے اسے پیدا کیا وہاں اسے ایک کسان یا بڑھئی ہی بننا تھا، مگر وہ فطرت سے بھڑ گیا۔تھامس ایڈیسن جس نے اس دنیا میں تبدیلی لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اپنی سکول ٹیچرز کے حساب سے ایک بے وقوف بچہ تھا، جس کو سننے میں بھی مسئلہ ہوتا تھا، قدرت نے تو شائد بظاہر اسے بہرا اور بے وقوف بنا کر بھیجا تھا اور وہ اگر اسی پر قناعت کر کے بیٹھا رہتا تو ایک نا معلوم گمنام موت مر جاتا، مگر وہ تو دنیا کو جینے کا ساماں دے گیا، اپنی عقل سے اور اپنی اس طاقت سے جو قدرت کے انعامات کے حقیقی کھوج میں رہی اور اس نے اپنی تقدیر بدلنے کا فیصلہ کیا۔

قائداعظم محمد علی جناح اپنے سات بہن بھائیوں کے درمیاں سے اٹھے، اور ایک ہی گھر میں تربیت پانے والے باقی بچوں سے مختلف تقدیر بنانے میں کامیاب ہو گئے، اللہ وسائی اپنے گھر میں سکون سے باقی بہنوں کے ساتھ بیٹھ کر ماں باپ کی ہدایت پر ریاض کرتی رہتی، اسی تقدیر پر شاکر ہو جاتی تو۔۔۔ ملکہ ترنم نور جہاں سے پاکستان محروم رہتا اور وہ شہرت اسے کبھی نصیب نہ ہوتی جو اس نے حاصل کی۔فتح علی خان کے بچوں میں ایک موسیقی کے میدان میں نئے نئے تجربے نہ کرتا تو نصرت فتح علی خان ایک عام گویے کی زندگی جیتا، ہیلن کیلر اپنے اندھے اور بہرے پن کو قسمت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیتی تو شائد ایک بھکارن کی زندگی گزارتی اور دنیا ایک اعلیٰ مصنف اور خوبصورت مقرر سے محروم رہتی، paradise lost کا ملٹن اگر اپنے اندھے پن کو اپنی معذوری بنا لیتا تو شائد تصور کے پر لگا کر کبھی نہ اڑ سکتا۔ خدا ایک جیسے حالات اور ایک جیسی قسمت دے کر شائد تقدیر بنانے میں اپنا ہاتھ یوں رکھتا ہے، کہ انسانوں کی الگ الگ فطرت بنا چھوڑتا ہے۔اور وہ فطرت انہیں وہ فیصلے کرنے پر اکساتی رہتی ہے جو کے دنیاوی حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔

یہ تو چند مشہور لوگوں کی مثالیں دی ہیں، کئی کہانیاں ایسی ہیں جن لوگوں نے شہرت تو نہیں کمائی مگر اپنے حالات سے ایسے پھڑ پھڑاتے ہوئے نکلے کہ وہاں کی زمین پر بھی ان کے ہونے کا نشان نہیں رہا، نئی زمینوں اور نئی منزلوں کو اپنے ارادوں سے فتح کرنے والے لوگ ہمارے اردگرد بکھرے پڑے ہیں۔ کینیڈا میں جو لوگ اپنی اعلیٰ ڈگریوں کو ٹیکسی کے دھویں میں جھونک رہے ہیں اور وہیں پر ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس شکست کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو یہاں کے سسٹم نے آتے ہی ان کی گود میں ڈالنے کی کوشش کی۔ حالات کے مطابق اپنی منزل کا تعین کیا، اور اپنے آپ کو مشقت اور اعلیٰ تعلیم کی بھٹی میں جھونک دیا۔۔غربت موت کی طرح آپ کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔ اسی طرح شہرت اور محبت بھی آپ کے اختیار ہو سکتی ہے۔ ناکامی ان چیزوں کے حصول میں سچی لگن کی کمی کی وجہ سے ہوتے ہے۔ ہماری عادتوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اور کیا پاکستان میں سب غریب ہیں؟ نہیں۔۔ وہاں بھی کامیابی ان کے دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑی ہے جو پاکستان میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ اور وہاں کون کامیاب ہیں جو ہر جگہ کی طرح وہاں کا نظام سمجھ لیں۔ اگر کینیڈا میں آپ کامیاب ہیں تو یہاں اعلیٰ تعلیم اور ایمانداری کا شعار اپنانا پڑے گا۔۔ اور اگر پاکستان میں آپ امیر ہونا چاہتے ہیں تو آپکو قبضہ گروپ کا ممبر، یا سیاسی مفاد پرست یا لوٹ مار کا چیمپئین، جھوٹ میں استاد اور مکاری کا کھلاڑی ہونا پڑے گا۔ امارت آپ کے اعمال ہیں۔۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ اعمال پستی کی طرف جانے کا راستہ ہیں اور پاکستان میں بلندی کی راہ۔ پاکستانی قوم کی یہ فطرت قدرت کی طرف سے ہے تو چلتی ہوا کی مخالف سمت میں کون اڑے گا اور کب اڑے گا؟ قدرت کے اس فیصلے کو معذوری سمجھ کر سینے سے لگائے بیٹھے، بھکاری کی زندگی جی رہے ہیں اور اندھے جیسی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ عادتیں امارت یا غربت کی طرف لے کر جاتی ہیں۔ چاہے وہ افراد کی ہوں یا قوموں کی۔ یہودی قوم جس نے ایک زمانہ دنیا والوں کی طرف سے ملنے والی نفرت کے سائے میں گزارا، اور اسی نفرت سے انہوں نے پر پھیلا کر اڑنے کا فن سیکھا، ایک دوسرے کے پنجے تھامے اور اتحاد کی مضبوط چادر تلے حالات

سے نمٹ کر تعلیم اور تربیت میں اپنے آپ کو مضبوط کیا، یوں جیسے پنڈ کے میراثی کے بچے چوہدریوں کی ٹھوکروں کی مخالف سمت چلتے ہوئے، اپنے آپ کو ان سے اعلیٰ بنا لیں۔ آج یہودی زندگی کے ہر شعبے میں چھائے ہوئے ہیں اور ہم اپنے اندھے، بہرے پن کو غربت کی اور ذلت کی وجہ بتاتے ہیں۔ کالے گورے سے تفرقے سے پیدا ہونے والی ناانصافیوں سے نیلسن مینڈیلا پیدا ہوا تو دنیا کا رنگ ہی بدل گیا۔ آج گورے امریکہ میں نیلسن مینڈیلا کے قبیل کا ایک فرد سب پر حکمران ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ اسے کیسے ایک رخی چلتی ہوا کے مخالف کس قدر زور لگا کر اڑنا پڑا ہے۔

اگر یہ سب کچھ ہو سکتا ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا، تو پاکستانیوں کی حالت کیوں نہیں بدل سکتی، تو کیا یہ ٹھیک ہے کہ، نہ ہو خیال جن کو آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔۔۔؟ تو قصوروار کون ہے۔ ہم خود؟ جو اپنی اپنی منافق، حاسدی، سست، بے ایمان، اور جھوٹی عادتوں کے قیدی ہیں۔ آج فطرت سے لڑنے کا وقت ہے۔ عادتیں۔۔۔ جو ہماری شخصیت کا حصہ ہیں، انہیں جھٹکنے کی ضرورت ہے اور اپنی چاہ سے راہ پیدا کرنا آسان ہوتا ہے اور بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمیں چاہ کس چیز کی ہے۔؟ اور جس دن ہماری طلب، ہماری چاہ۔۔۔ اعلیٰ، باعزت زندگی ہوگئی، اسے ہم حاصل بھی کر لیں گے، افسوس تو یہ ہے کہ ہم جو چاہ رہے ہیں، وہی ہمیں مل رہا ہے۔۔ اگر ہم یہ سب نہ چاہیں، پوری شدت سے نہ چاہیں اور پورے خلوص سے وہ چاہیں جو حق سچ ہے، تو کیا وہ ہمیں نہیں ملے گا۔؟۔ کیونکہ میں نہیں مانتی لگن ہو اور کوئی چیز نہ ملے۔۔ چاہے فرد کی امیری ہے یا قوم کی۔۔ چاہے فرد کی خودی ہے یا قوم کی، چاہے فرد کا اعلیٰ کردار ہے یا قوم کا۔ چاہے محبت ہے یا شہرت۔ ہم اپنی مرضی سے، پورے ہوش و حواس میں رہ کر پاکستان کے لئے اور اپنے لئے یہی حالات چاہتے ہیں۔ جو ہمیں مل رہے ہیں۔ اور اگر نہیں تو پھر کیا ہوا کے مخالف سمت میں اڑنے کی ہمت ایک بھی گروپ کو نہیں؟ ایک بھی لیڈر کو نہیں؟ کوئی ملین کیلر، کوئی مینڈلا۔؟ پورے ہجوم میں کوئی ایک بھی نہیں؟

☆☆☆

یہ ہمارے اندر کی بُو ہے

ملبورن آسٹریلیا میں انڈین طالبعلم کی مقامی گوروں کے ہاتھوں ہلاکت پر دل میں ایک رنج کی لہر سی اٹھی۔ اس طالبعلم کے ماں باپ نے یقیناً بہت محنتوں کے بعد رقم اکٹھی کی ہوگی اور اپنے اور بیٹے کے اعلیٰ مستقبل کے لئے اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ دنیا کی دوسری نکڑ میں بھیجا ہوگا جہاں سورج اس وقت اگتا ہے جب ان والدین کے ہاں شام اترتی ہے۔۔اور اس ہلاکت کے بعد ان کی زندگیوں میں ہمیشہ کے لئے شام اتر آئی ہے۔

بحث مباحثوں کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے۔آسٹریلیا میں ہندو طالبعلموں پر متعصب حملے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ اب روز کا معمول بن چکا ہے۔اس کی وجہ کیا ہے، ہر جگہ خاص کر انڈیا کے پریس میں یہ موضوع بہت زیر بحث آ رہا ہے۔آسٹریلین کو ہندوؤں سے بو آتی ہے یا ان کے رنگ سے گھن آتی ہے یا وہ ایک ترقی کرتی قوم ہے اس بات کو برداشت کرنا مشکل ہے اور یا آسٹریلیا میں مقامی لوگوں کو ان انڈین سٹوڈنٹس کی وجہ سے جاب کی قلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ ایمپلائر کم مزدوری پر نوکری دینا زیادہ پسند کرے گا، جو یہ ہندو طالبعلم بخوشی قبول کرتے ہیں، سو ذرائع کی یہ چھینا جھپٹی اس تعصب کا باعث ہے یا ہندوؤں کا زم، جھلکنے والا رویہ نفرت کرنے والے کو مارنے پر اکساتا ہے یا کیا۔۔؟

ہندو پریس یا ہندو منسٹری یا ان کے فنکار جو بھی نتیجہ نکالیں، اس سے پہلے ایک بات طے شدہ ہے کہ یہ سارا کھیل انسانی رویہ کا ہے۔ ہمارا رویہ طے کرتا ہے کہ ہم کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔اگر انگلینڈ کے رئیلیٹی شو میں انڈیا کی اداکارہ شلپا سیٹھی ساتھ حصہ لینے والی کے چند فقروں کو ایک دم شور مچا کر متعصب رویے کی دہائی نہ دیتی تو شائد وہ اتنی شہرت نہ پاتی۔اور پھر وہیں کے رہنے والے ایک

کروڑ پتی سے اسکی شادی نہ ہوتی۔

متعصب رویہ بڑی نہ سمجھ میں آنے والی چیز ہے۔اس کا دارومدار اس بات پہ ہے کہ رویہ دکھانے والا اور سہنے والا کس نہج پر کھڑے ہیں، جذبات کی کس کیفیت سے گذر رہے ہیں یا جذبات کو استعمال کرنا خوب جانتے ہیں۔کائنات کا نظام ہی خدا نے یوں رکھ چھوڑا ہے کہ ہر بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جاتی ہے تو جب ہم متعصب رویے کی بات کرتے ہیں تو وہ کہاں نہیں ہوگا۔۔ہر بڑے انسان کے پاس ہوگا۔۔اور وہ اس سے اپنے سے چھوٹے انسان کو نگلنے کی کوشش کرے گا۔ اور جو سب سے اونچی سیڑھی پر کھڑا ہے، اسے نچلی سیڑھیوں پر کھڑے باقی انسانوں کے رنگ، بو، جنس، اور زبان۔۔کچھ بھی نظر میں کھٹک سکتا ہے۔بات ساری رویوں کی ہے۔۔ہمارا رویہ اور دوسرے انسان کا رویہ۔جب میں نے پڑھا کہ امیتابھ بچن نے آسٹریلین ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ سارا دن ٹی وی پر اس ہندو سٹوڈنٹ کو ہسپتال میں تڑپتے دیکھتے رہے ہیں، تو اچھا لگا۔۔اپنی قوم کے لئے ایسا ہی درد ہونا چاہیے، کیوں لاوارث چھوڑے کوئی اپنوں کو۔مگر ساتھ ہی ساتھ دل میں یہ سوال اٹھا: جب گجرات میں مسلمان جل گئے تھے، اور جب امیتابھ کے ملک میں ہی کیساؤں میں عیسائی زندہ جلا دیے گئے تھے تو امن کے اس سفیر کے منہ سے ایک بھی بیان نہیں نکلا تھا۔اور جب سکھوں پر ہندوستان کی زمین تنگ ہو گئی تھی تو ان کا ایک بیان ریکارڈ پر ہے کہ۔۔اندرا گاندھی کے قتل کے بعد انہوں نے فرمایا تھا کہ سکھوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے ۔تو اس صدی کے سب سے بڑے فنکار، جنہیں صرف ہندو ناظرین نے ہی یہ اعزاز نہیں دیا بلکہ اس میں حصہ ان سکھوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا بھی ہے جن کے ساتھ شائد بیٹھ کر وہ کھانا بھی پاپ سمجھتے ہیں، اور جنہیں مذہب کی بنا پر اپنے بیٹے کی شادی میں بلانا بھی اشگھن سمجھتے ہیں۔ انہیں ہندوؤں کے خلاف آسٹریلین تعصب پر شعلہ رو ہوتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

تعصب تو وہ چڑیا ہے جو موقعہ محل دیکھ کر ہر دل سے چوں چوں کی آواز نکال سکتی ہے، انسان کے اندر چھپی اس چڑیا کو انتظار ہوتا ہے اپنے وقت کا، اپنے مرتبے کا اور اپنے علاقے کا۔ایک آسٹریلین سٹوڈنٹ کا کسی پوسٹ پر بیان پڑھ رہی تھی کہ ہندوؤں سے گائے کے پیشاب کی بو آتی

ہے اور چند ماہ قبل کینڈا میں ہندوؤں کے ایک ریڈیو سٹیشن سے ایک میزبان کہہ رہی تھی انڈیا میں جس محلے میں زیادہ بچے اور بو ہو گی۔۔ وہ مسلمانوں کا محلّہ ہوتا ہے۔۔ یہ بو کا بھی عجیب سلسلہ ہے انسانوں کو انسانوں سے کس بنا پر آتی ہے،،؟ ان کے کھانوں کی وجہ سے، ان کے اوڑھنے پہننے کی وجہ سے یا پھر ان کی محبتوں اور نفرتوں کی وجہ ہے؟ ان کے عقیدوں اور مذاہب کی وجہ سے۔۔؟ ایک انسان کو دوسرے سے بو کب آنا شروع ہوتی ہے؟ کیا کسی فلاسفر نے، سکالر نے اور سائکلوجسٹ نے اس کی کھوج لگانے کی کوشش کی۔۔؟ گھر میں ہونگے تو کسی ایک بہن یا بھائی کے خلاف تعصب پال لیں گے،، تھوڑا باہر محلے میں نکلیں گے تو کسی ایک ہمسائے کو تعصب کے لئے چن لیں گے۔ تھوڑا اور باہر کو نکلیں گے تو لاہور اور کراچی کے شہریوں کو تعصب کی سولیاں پر چڑھا لیں گے۔۔ وہ لاہوری ہے اس لئے موٹا اور غیر اخلاقی ہے، وہ کراچی کا ہے اس لئے کمزور ٹانگوں اور کنجوس دل کا مالک ہے، ملتانی ہے تو جھوٹا اور سانولا ہو گا، سندھی ہے تو چور ہو گا اور اگر پٹھان ہے تو سود خور اور نمازی ہو گا، سیالکوٹیا ہے تو لڑاکا ہی ہو گا۔۔ پھر ہمیں شہروں کی بو آتی ہے۔ ملکوں سے بو آتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں فرقوں سے نفرت ہوتی ہے۔ ایک فرقے کو دوسرا کافر، منافق اور مکار لگے گا۔۔ اور ساتھ بیٹھ کر کھانے میں بو آئے گی۔۔ اور یہ تعصب اس وقت اور بھی وسیع ہو جاتا ہے جب بات مذاہب کی آتی ہے۔۔ کیا پاکستان میں تعصب انتہا کی بلندیوں کو نہیں چھوتا۔ اسی تعصب کی وجہ سے دوسرے مذہب والوں کے برتن الگ رکھے جاتے ہیں۔۔ آسٹریلیا میں اگر گورے عیسائی کو ہندو سے بو آتی ہے تو ہندوستان میں ہندو کو مسلمان سے اور عیسائی سے آتی ہے۔ پاکستان میں مسلمان کو عیسائی سے اور ہندو سے آتی ہے، اور پھر غضب اس وقت ٹوٹتا ہے جب سعودی عرب میں مسلمان کو مسلمان سے آتی ہے۔۔

اور یہ بو نہ جانے کیوں آتی ہے؟ مذہب کی وجہ ہے؟ فرقے کی وجہ ہے؟ عقیدے کی وجہ ہے؟ رنگ کی وجہ ہے اور یا پھر یا پھر۔۔۔ غربت کی وجہ ہے۔۔ جب اوپر والی سیڑھی پر بیٹھے انسان کو یوں محسوس ہوتا ہو کہ نیچے والی سیڑھی پر بیٹھا۔۔ جانور نما انسان۔ اس کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے یا اس کے حصے کا کھانا کھا رہا ہے، یا اس کے حصے کے ذرائع پر اس کا حق بھی بنتا جا رہا ہے اور یا اس کی

بیٹھنے کی جگہ پر وہ بھی گھس گھس کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے تو۔۔ حسد، کم ظرفی اور احساس برتری کے مارے انسان کے آگے تعصب کی شدید دھند چھا جاتی ہے۔۔ اور اسے سوائے اپنے آپ کے دوسرا کوئی چہرہ نظر نہیں آتا۔

جب ہم نچلی سیڑھی پر بیٹھے ہیں اور اوپر بیٹھا انسان ہمیں حقیر سمجھ کر ہم سے نفرت کر رہا ہے اور ہم اسے دل میں بری طرح محسوس کرکے، احتجاج کرتے ہیں، جلسے جلوس نکالتے ہیں اور میڈیا میں آکر بڑی لعن طعن کرتے ہیں۔۔ ہم اس وقت تعصب کے خلاف بہت اچھی تقریر کر سکتے ہیں اور ہمارا پوائنٹ کوئی مائی کا لال چیلنج نہیں کر سکتا اور ہم حق پر ہوتے ہیں۔۔ مگر جب قسمت ہمیں اوپر والی سیڑھی پر بٹھاتی ہے اور تب ہمیں تعصب کی نہ تو تقریریں یاد آتی ہیں اور نہ ہم اپنے نفرت آلود اور احساسِ برتری والے رویئے کو متعصب سمجھتے ہیں۔ اس وقت تو ہمیں تعصب اور انتہا پسندی کی تعریف ہی بھول جاتی ہے۔۔ اور اگر اس وقت ہم دوسرے اعلیٰ لوگوں کا رویہ اپنے لئے یاد کر لیں تو اپنے سے نیچے والے کو اس رویے سے بچا سکتے ہیں۔۔ تعصب ہر دل میں ہے کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔۔ بات ہے اس سے نبرد آزما کیسے ہوا ہے، کیسے اسے چاروں شانے چت گرا کر، ایک دوسرے انسان کو چاہے اس سے کیسی ہی بو کیوں نہ اٹھ رہی ہو۔۔۔ گلے لگاتا ہے۔ اور جب ہم اس کھیل کو سمجھ جائیں گے، اس پر قابو پالیں گے تو تب ہمیں سمجھ آئے گی کہ وہ جو بو اٹھ رہی تھی، وہ ہماری اپنی ہی نیت کا کوئی بٹن کھلا رہ گیا تھا۔ ورنہ کسی رنگ، کسی فرقے، کسی مذہب، کسی علاقے ،کسی زبان، کسی عقیدے یا کسی مسلک سے کبھی کوئی بو نہیں اٹھتی۔۔

یہ ہمارا اپنا رویہ ہے۔۔ ہمارے اندر کی بو ہے جو دوسرے انسان سے نفرت کرنے کے بعد چار سو پھیل جاتی ہے۔ اور اپنی بو سے بچنا سیکھئے۔ تو ہر مذہب کے مرنے والوں کے لئے آپ کا دل اتنا ہی دکھی ہو گا۔ اور خدا ہماری رہنمائی کرتا رہے۔

☆☆☆

یہ تو نہ ختم ہونے والا نوحہ ہے

کینڈا سے ایک عالم فاضل دوست جاوید چوہدری صاحب لکھتے ہیں۔۔

روبینہ صاحبہ ! عراق میں ہونے والی بلیک واٹر کی دہشت گردی کو یاد رکھیں۔اب یہ سب پاکستان میں ہو رہا ہے۔انکل سام کا شکریہ جنہوں نے پیپلز پارٹی کو یہ موقعہ دیا کہ وہ ملک کو عراق کی طرح برباد کر دیں۔جب زی یا بلیک واٹر ایک عام آدمی کو 1000 ڈالر روزانہ کا دے گی تو کوئی بھی اپنا ضمیر بیچ کر اپنے ہم وطنوں کو مار دے گا۔اگر ملک پر غدار قابض نہ ہوتے تو آپکو۔۔نوحہ لکھنے کی نوبت نہ آتی۔آپکا کالم سمندر میں صرف ایک قطرہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے بڑی طاقت پاکستان، مڈل ایسٹ اور ساؤتھ امریکہ میں کیا کر رہی ہے اور اگر سی آئی اے کے یہ کارندے پاکستان میں ایسے ہی سرگرم رہے تو ایسا خون خرابہ اور کثرت سے ہوگا۔امریکہ کا یہ جال اس وقت ہٹے گا جب یہ والی حکومت ہٹے گی اور اس کی جگہ کوئی مخلص، سچی اور نڈر قیادت آگے آئی گی۔

پرویز صلاح الدین ایک ویڈیو مجھے ای میل کرتے ہیں اور حیرانگی سے پوچھتے ہیں کیا ایسا ممکن ہے؟ وہ ویڈیو ایک ٹی وی پروگرام کے کسی ٹاک شو کی ہے جس میں میزبان ہمیں بتا رہا ہے کہ مون مارکیٹ میں مرنے والی خواتین کی ننگی لاشیں ان کے لواحقین کے حوالے کی گئیں۔ان 54 مرنے والیوں کے جسم پر ایک کپڑا تک نہ تھا جب انہیں ان کے مرد لواحقین کے حوالے کیا گیا۔۔کوئی بہن تھی،کوئی ماں تھی اور کوئی بیٹی تھی۔اور اسی روز آئی جی پنجاب کی لاشوں سے بھرے ہسپتال سے نکلتے ہوئے ہنستے ہنستے کی وڈیو۔۔۔کیا ایسا ممکن ہے۔لوگوں کو کیا ناممکن لگ رہا ہے؟ پولیس کی خواتین لاشوں کے ساتھ بے حرمتی یا اس سانحے کے بعد آئی جی پنجاب کا ٹھٹھے لگاتے ہوئے ہسپتال سے باہر نکلنا؟

پھر ایک اور خبر ۔۔اسی مون مارکیٹ سے ایک خبر اور آتی ہے۔ جہاں بچپن اور جوانی کے دن جل گئے اور ان کی راکھ اڑ رہی ہے۔اس اڑتی راکھ کے درمیاں سے ایک خبر آتی ہے۔۔اور لوگ پھر پوچھتے ہیں کیا ایسا ممکن ہے۔۔؟ خبر یوں ہے کہ وہاں کی ایک مقامی بیوٹی پارلر میں دو دلہنیں تیار ہو رہی تھیں ۔وہ تیار ہوتے ہوتے آئینہ دیکھتی تھیں اور سوچتی تھیں آج رات ان کی زندگی بدلنے جا رہی ہے۔آج کی رات وہ محفل کی جان ہونے جا رہی ہیں ۔اور سب نظریں کہیں گی کیا خوبصورت دلہنیں ہیں اور سارے خواب آنکھوں میں سج جاتے ہیں اور پارلر والی کہتی ہیں دلہنوں کو بیحد روپ چڑھا ہے اور انکا حسن آئینہ کو شرما رہا ہے۔اور جب آگ نے دلہنوں کے حسن کو اور انکے خوابوں کو جلایا تو دیکھنے والی آنکھ کوئی بھی باقی نہ بچی ۔۔سج دھج اور روپ راکھ کا ڈھیر ہوئے ۔ماں باپ سجی دلہنیں لینے آئے اور جلی بدنما لاشیں لے کر چلے گئے ۔اور افسوس تو وہاں سے شروع ہوا جب لوگوں نے ان کے بدن سے زیور نوچ لئے ۔۔تو یہاں لوگ حیرانگی سے پوچھتے ہیں کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسی بے حسی ممکن ہے؟

اس کا جواب وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے جاوید چوہدری کہتے ہیں ۔۔لوگ 1000 ڈالر دہاڑی پر اپنی روح کا سودا کر کے اپنے کسی بھی ہم وطن کو ذبح کر سکتے ہیں۔پھر اس کا جواب وہاں بھی ہے۔لاشوں سے بھرے ہسپتال سے آئی جی پنجاب ہنستے ہنستے نکلتے ہیں اور اس کا جواب وہاں بھی ہے جب عورتوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنے والے اسے روٹین کا کام سمجھتے ہیں ۔۔جو قوم پیسے کے لئے اپنے جیسے انسانوں کو مار سکتی ہے،اس کا مرے ہوئے انسانوں کے اوپر سے کپڑے اتارنا یا زیور اتارنا ۔۔کیا ناممکن ہے اس میں ۔جس قوم کو بھوک سے نڈھال کر دیا ہو ۔۔جنہیں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے رہتے ہیں ان میں اخلاقیات بچتی کہاں ہے۔کچھ ہم لوگ اخلاقی طور پر پہلے ہی کمزور ہیں اور اوپر سے حکمرانوں کے پے در پے ظلموں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے۔اخلاق اور اخلاقیات کہاں سے منگوائیں ۔۔پیٹ بھریں ہوں تو سارے چونچلے ہوتے ہیں ۔۔

یہاں کینیڈا میں ایک خبر پڑھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی ۔ آخر اتنا بھی کیا انسان اخلاقی طور پر مضبوط ہو کہ پیسے کو ہی ٹھوکر مار دے ۔ میرے اندر حسد اور غصہ بھر گیا ۔۔ ہم لوگ موتوں پر قہقے مارتے ہیں اور لاشوں کے سودے کرتے ہیں اور یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اخلاق کا دامن تھامے رکھتے ہیں ۔۔ خبر کچھ یوں تھی کہ toronto transit commission(TTc) نے dating website کا ایک بڑا زبردست کمائی والا اشتہار بسوں کے اوپر لگانے سے انکار کر دیا ۔۔ اشتہار کچھ یوں تھا : ترجمہ ۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے سو ایک affair ضرور ہو ۔۔ ٹی ٹی سی کا کہنا تھا چونکہ وہ اسے اخلاقی طور پر کوئی ایسی چیز نہیں سمجھتے جس کا پرچار کیا جائے اور لوگوں تک یہ پیغام پہنچایا جائے لہذا وہ یہ اشتہار لینے سے انکار کرتے ہیں ۔ حالانکہ اس اشتہار کے عوض ان کی مالی حالت کافی سنبھل سکتی ہے ۔ بھرے پیٹ والی قوموں کی اخلاقیات بھی زندہ ہوتی ہے خالی پیٹ والی قوم تو اپنے بچے بیچ بھی رہی ہے اور دوسروں کے کاٹ بھی رہی ہے ۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ کون کرے؟ قوم کے اخلاق پر کیا اثر ہو گا یا قوم کو کیا پیغام جانا چاہیے کیا نہیں ۔۔ یہ سوچنے کی فرصت کسے؟

موت کے سانحے سے بڑا دکھ اس پر موت کی سی خاموشی ہے ۔۔ اور اس سے بھی بڑا دکھ اس پر ڈاکے ہیں، چوری ہے ۔ کبھی زیور کی تو کبھی کپڑوں کی اور کبھی اپنی ناموس کی اور تہذیب کی ۔ یہ تو نہ ختم ہونے والا نوحہ ہے ۔ کہاں ہیں لیڈر؟ جو لیڈر ہے وہ آج ابھر کر سامنے آئے اور ننگی لاشوں کو کپڑوں سے ڈھانپ دے ۔۔ بس آج اتنا ہی کر دے ۔ اتنے بڑے بڑے سورما لیڈر یہ بھی نہیں کر سکتے؟

☆☆☆☆

میں وہ بھائی بننا چاہتا ہوں

وہ بچہ چمکتی دمکتی گاڑی کو دیکھتا جا رہا تھا۔۔اس میں بیٹھے نوجوان نے بچے کو پاس بلایا اور کہا تم اس گاڑی کی سیر کرنا چاہتے ہو۔۔ بچے نے اقرار میں سر ہلایا، نوجوان نے اسے ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا، خوب سیر کروائی اور کہا جانتے ہو یہ گاڑی مجھے میرے بھائی نے گفٹ دی ہے، بچہ خاموش رہا۔نوجوان نے کہا اب تم سوچ رہے ہو کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں جسے خدا نے ایسا بھائی دیا ہے۔اور اب تم دل دل میں خدا سے یہ کہہ رہے ہو کہ خدا نے تمھیں ایسا بھائی کیوں نہیں دیا ۔۔بچے نے کہا۔۔نہیں میں ویسا بھائی بننا چاہتا ہے جس نے تمھیں گاڑی گفٹ کی۔۔

یہ پڑھ کر میری آنکھوں کے آگے ہلکا سا اندھیرا چھا گیا۔میں ساری عمر اپنی ماں سے لڑتی رہی کہ آپ نے میرے لئے کیا کیا؟ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں نے اسکے لئے کیا کیا ؟ میں باپ سے ناراض رہتی تھی کہ اس نے مجھے کیا دیا۔کبھی نہیں سوچا میں نے اسے کیا دیا۔بہن بھائیوں سے شکایتیں اس نے یہ نہیں کیا اور اس نے وہ نہیں کیا۔میں نے ان کے لئے کیا کیا؟ دوستوں سے ناراضگیاں فلاں وقت یہ نہ دیا اور فلاں وقت وہ نہ کیا۔میں نے کیا دیا۔؟ میں نے کیا کیا؟

ملک کو کوسنے ہمارے ملک نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ہم نے ملک کو کیا دیا؟ دیکھا جائے تو ہم لوگ

ہمیشہ ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں۔ مانگنے والا ہاتھ، دینے والا ہاتھ کبھی نظر ہی نہیں آیا۔ ہم نے ملک کے لئے کیا کیا؟ جو اندر ہیں وہ اس کا کلیجہ چبا رہے ہیں اور جو باہر ہیں وہ اپنی تن آسانی کے ہاتھوں اتنے مجبور ہیں کہ واپس جانے کے نام سے ہی جسم میں جھرجھری آجاتی ہے۔ ہمیں ملک کیا دے سکتا ہے اور کیا دے گا۔

دینے والے ہاتھ 23 اکتوبر 2009 کی اس خبر میں دیکھئے۔ جرمنی کے امیر ترین لوگوں نے چانسلر انجلا کو ایک درخواست دی ہے جس پر 66 امیر ترین لوگوں کے دستخط ہیں اور وہ درخواست میں کیا کہتے ہیں۔ وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس چونکہ دولت ہماری ضرورت سے بہت زیادہ ہے لہذا اس پر ٹیکس 5% بڑھا دیا جائے۔ تا کہ ملک میں جو بے روزگاری سماجی نا انصافی اور غربت بڑھ رہی ہے اسے کسی حد تک کم کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں چندہ دینا ایک عارضی حل ہے اور اس سے ملک مضبوط نہیں ہوگا۔ ملک میں معاشی بحران کو کم کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا جائے۔ اپنے ہی لئے ٹیکس کی کٹوتی میں اضافہ؟ نہ دیکھا نہ سنا۔ پھر ہم کہتے ہیں یہ قومیں جہنمی ہیں اور جنت ہماری ہے۔ جنت ہماری کیسے ہے؟ اس کی بات بھی سن لیجئے۔

پھیلے ہوئے ہاتھ کیسے ہوتے ہیں۔۔۔ پھیلے ہوئے ہاتھ ایسے ہوتے ہیں کہ ٹی وی پروگرام میں سعد رفیق نواز شریف کی وکالت کرتے ہوئے ہوئے بہت غصے سے فرماتے ہیں۔۔ کہ بریگیڈیر امتیاز نے نواز شریف پر 35 لاکھ لے کر بے نظیر کے خلاف الیکشن لڑنے کا الزام کیا سوچ کر لگایا ہے۔ الزام لگاتے وقت وہ یہ تو دیکھ لیتے کس بندے پر کیا الزام لگا رہے ہیں۔۔ اس بندے پر جس کا روز کا خرچ پینتیس لاکھ ہے۔۔ اس نے اتنی سی رقم کے لئے بکنا تھا؟ سو ہم نے سن لیا، دلیل اچھی تھی مان لی۔ آگے چلتے ہیں۔ آگے انکم ٹیکس کا دفتر ہے اور نواز شریف کی جو ٹیکس ریٹرن وہاں جمع ہے اس کے حساب سے نواز شریف اپنے گھر کے ہر بندے کا مقروض ہے اور ریٹرن میں انکم فقط 5000 روپے دکھائی گئی ہے۔۔ کیا سعد رفیق بتائیں گے کہ روز کا پینتیس لاکھ خرچ کرنے والے کی کمائی فقط پانچ ہزار روپے ہے۔۔ اور وہ کون سا حساب کا فارمولہ ہے جو پانچ ہزار کمانے والے

اور بے انتہا مقروض شخص سے روزانہ کے پینتس لاکھ خرچ کروا سکتا ہے۔کیا وہ یہ فارمولہ پورے پاکستان میں سپلائی کروا سکتے ہیں تا کہ مہینے کے پانچ پانچ ہزار کمانے والے اور مقروض اشخاص اس قابل ہو جائیں کہ روز کے پینتس لاکھ خرچ کر سکیں۔۔

تو مانگنے والے ہاتھ دیکھے آپ نے۔۔ جو ٹیکس بچانے کے لئے اپنی اربوں کھربوں کی رقم کو قرضوں میں بدل دیتے ہیں۔کہیں اس ملک کا غریب سانس نہ لے لے۔کہیں ان کی ٹیکس میں دی گئی رقم ملک میں غربت یا بے روزگاری کو روک نہ دے۔کہیں سماجی ناانصافی کا خاتمہ نہ ہو جائے۔کہیں معاشی بحران سے ملک باہر نہ آ جائے۔اور کہیں ان کے اربوں کھربوں میں چند سکوں کی کمی نہ ہو جائے اپنے ملک میں لوٹ مچا کر اپنے ملک کے غریب کو ہی مار دیا ہے کاش کوئی ایک بھی امیر زادہ اپنے حصے کی کچھ رقم جائز طریقے سے حکومت کو لوٹا تا اور کچھ سسٹم کو ٹھیک کرنے کی بات کرتا۔ کوئی ایک امیر زادہ اپنے ہاتھ بڑھاتا۔مانگنے کے لئے نہیں دینے کے لئے۔خیرات نہیں۔۔ٹیکس۔۔۔۔۔تو یہ ملک ضرور غیرت اور عزت کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر دیتا۔۔

☆☆☆

شاعروں کی آپس میں لڑائی

ساتویں آسمان سے پرے ایک آسمان ہے جہاں پھولوں کے فرش بچھے ہیں، گھنے سایہ دار درخت ہیں، ہر طرف رم جھم خوشبو پھیلی ہے۔ دھوپ کہیں نظر نہیں آتی۔ رات کا کہیں نشان نہیں۔ بد بو کا کوئی امکان نہیں، ہر طرف اجلی اجلی نکھری نکھری بستی ہے۔ جس کے چاروں طرف میٹھی میٹھی ندیاں بہہ رہی ہیں، پرندے درختوں پر اپنے گھونسلے بناتے ہیں، انڈے سینچتے ہیں اور ایک دوسرے کی چونچوں میں چوگا ڈالتے ہیں۔ خرگوش، بکری اور ہرن قلانچیں بھرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت انسانی بچے قلقاریاں مارتے پھرتے ہیں۔ آسمانوں سے قہقہوں کی بارش مسلسل ہوتی جاتی ہے۔ ایک شاعر ہے اس کی گود میں ایک کتاب ہے اور وہ ستاروں کو دیکھ کر باتیں کرتا ہے۔ اس کی دنیا میں بچے، معصوم جانور، آزاد پرندے، بہتی ندی، گرتا جھرنا، ٹھنڈے شجر، خوبصورتی میں مگن پھول، چارسو پھیلی محبت اور وفا کی خوشبو ہیں۔ میرے شاعر کی دنیا میں نفرت نہیں، خودغرضی نہیں، منافقت نہیں، جھوٹ نہیں، مکاری نہیں، دھوکا نہیں، تہمت نہیں، فریب نہیں، مفاد پرستی نہیں۔۔۔ ہر طرف محبت ہے، خوشبو ہے، بے غرضی ہے، ایمانداری ہے، جاں نثاری ہے اور عشق کی بیلیں ہیں جو اس کے گرد اٹھی سب دیواروں پر پھیلی ہیں۔۔۔

وہ شاعر ہے۔۔ شاعرہ ہے۔ جو محبتوں کے مسافر ہیں۔۔ جو انسانوں کی دنیا کی خودغرضیوں سے، دنیا داریوں سے بہت اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر چھپا تخلیق کار، نازک انسان اور حساس دل کیسے ان دنیاوی کاموں میں الجھ سکتا ہے۔ اور دنیاوی کام بھی ایسے جو عام انسان بھی کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔۔۔ لالچ، خودغرضی، دھوکہ دہی اور بناوٹ۔۔ نہیں نہیں میرے تصور کا شاعر اور شاعرہ کیسے ان کاموں میں الجھ سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ لوگ ساتویں آسمان سے پرے

ایک اور آسمان ہے جس کا رنگ تو نیلا ہی ہے مگر اس میں ایک رنگ محبت کا، خلوص کا اور اعتماد کا ہے

۔۔ یہ اس آسمان کے باسی ہیں ۔۔ یہ زمینی سیارے کے نہیں ۔ یہ ان سات آسمانوں کے بھی نہیں

۔۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا یہ شاعر ہیں؟ کیا یہ شاعرات ہیں ۔۔ تو میرے خوابوں میں رہنے والے

تخلیق کار کون ہیں ۔ کیا وہ صرف ایک خواب ہی تھا یا یہ فیس بک کی لڑائی ایک خواب ہے؟ میں تو یہ

سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شعر بھی کسی سے لکھوا کر مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھا جاتا ہے اور

کتابوں میں اپنے نام سے چھپوایا جاتا ہے ۔۔ میرے نزدیک شعر کسی بھی سورہ کی طرح شاعر یا

شاعرہ کے دل میں اترتا ہے اور وہ اسی کی امانت ہوتی ہے اور لوگ اسی کے نام سے اسے پڑھتے

اور اس کی دل کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہیں ۔۔ یا ایک شعر ایک انسان کا اپنا درد، اپنا آنسو اور اپنا

قہقہہ ہوتا ہے ۔۔ کیا کوئی کسی اور کے درد کو، جذبات کو، اور محبت کو اپنا سکتا ہے ۔؟

محبت اور نفرت ایسے جذبے ہوتے ہیں جو جس کے دل میں اترتے ہیں وہی اسے جان سکتا ہے ۔

کوئی چاہے آپ کی سگی ماں یا باپ ہی کیوں نہ ہوں ۔ آپ کے جذبوں کی شدت کو دیکھنا تو دور کی

بات ہے محسوس تک نہیں کر سکتے ۔۔ محبت بھی اپنی ہوتی ہے اور نفرت بھی ۔ کوئی کسی کی نہ محبت اپنا

سکتا ہے اور نہ کسی کی نفرت میں حصہ ڈال سکتا ہے کہ آدھی محبت تم کر لو اور آدھی میں ۔۔ تو شعر جو

جذبوں کی شدت اور حرارت سے جنم لیتے ہیں ۔۔

کوئی کیسے کسی کے حصے کا بچہ جن سکتا ہے ۔۔ adoption ایک اور کہانی ہے مگر اس میں جن کا بچہ

ہوتا ہے ان کا نام بتانا ضروری ہوتا ہے، ورنہ بڑا ہو کر وہ بچہ ہی آپ سے منہ پھیر کر جا سکتا ہے تو

میرے ساتویں آسمان سے پرے بسنے والے شاعر کیسے کسی دوسرے کو شعر لکھ کر دے سکتے ہیں؟ یا

کوئی کیسے کسی سے شعر لکھوا سکتا ہے؟ شعروں کی چوری تو ایک ہنر مانا جا سکتا ہے مگر پیسے دے کر یا

محبت کے بدلے یا کسی سفارش سے، کسی رشوت سے شعروں کا کاروبار ۔۔ بات سمجھ سے بالاتر ہے

۔ اور اگر یہ صرف الزام تراشیاں ہیں تو الزامات لگانے والے کا منہ کالا ہی کیا جا سکتا ہے ۔ سفید تو ہر

گز نہیں ۔

میں فیس بک کی اس چوری سینہ زوری کی لڑائی سے یہ سوچ رہی تھی کیا ہمارے ملک میں فن بھی خالص نہیں رہا۔۔شاعر اور شاعرات بھی دو نمبر ہیں ۔لکھوانے والی شاعرات اگر مجرم ہیں تو لکھ کر دینے والے شاعر کس مجبوری کا شکار ہیں ۔کیا اسی مجبوری کا جو پاکستان میں ہر محکمے میں مردوں کو عورتوں کو دیکھ کر درپیش ہوتی ہے۔

اسی لڑائی میں ایک صاحب نے کیا خوب لکھا تھا۔۔کہ عورتیں کبھی اچھی شاعری نہیں کر سکتیں ۔یہ عورتوں کے بس کا روگ ہی نہیں ۔۔ مجھے ان سے اتفاق ہے۔۔بلکہ کچھ زیادہ ہی اتفاق ہے ،جناب عورتیں شاعری کیا، کچھ بھی نہیں کر سکتیں ۔۔ان کے ذمے مرد حضرات صرف ایک ہی کام لگانا چاہتے ہیں انہیں خوش کرنے کا اور بس ۔اگر وہ کام جو عورتیں کر دیں وہ اچھی وزیر بھی ہیں، آفیسر بھی ہیں، شاعرات بھی ہیں اور دانشور بھی ہیں ۔۔ میرٹ پر کون بات کرتا ہے؟میرٹ کو کون دیکھتا ہے؟ ٹیلنٹ کی کہاں قدر ہو رہی ہے؟پاکستان میں کون سا ایسا محکمہ ہے جہاں عورتوں کو دل بہلانے کا سامان نہیں سمجھا جا رہا ۔۔جہاں انہیں ایک شخص کے طور پر دیکھا جاتا ہے نہ کہ عورت کے طور پر ۔۔؟کون سی ایسی جگہ ہے جہاں عورت کو دوسروں کی طرح سمجھا جاتا ہے۔۔یا تو اسے تفریح کا ذریعہ سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے،کوشش کامیاب تو عورت کامیاب ۔۔کوشش ناکام تو عورت بد دماغ، نک چڑھی اور ناکامیاب ۔جہاں عورت اپنے دماغ کے زور پر آتی ہے، المیہ تو دیکھو۔۔وہاں بھی اسے ایک جسم سمجھا جاتا ہے۔میرے اس بھائی نے ٹھیک کہا عورت کبھی اچھی شاعری نہیں کر سکتی ۔عورت مردوں کے اس بازار میں کچھ بھی نہیں کر سکتی ۔۔جب تک آپ لوگوں کی آنکھیں اس کے دماغ تک نہیں جائیں گی ۔۔وہ انہیں بھول بھلیوں میں کھوئی رہے گی ۔اور کچھ نہ کرنے کی اہل ہی رہے گی ۔اور جب یہ مرد شاعر حضرات ان عورتوں کو شاعری لکھ کر دینا چھوڑ دیں گے،ہو سکتا ہے اس دن کوئی شاعرہ سچ مچ پیدا ہو ہی جائے۔

جب اسے پتہ لگے گا کہ وہ ایک عام شخص ہے جس نے اپنے دماغ سے آگے جانا ہے اور وہ کوئی دیوی نہیں جس کے ارد گرد پجاری پوجا کرتے پھرتے ہیں اور وہ کسی کے پوجا کا پھول اٹھاتی ہے

اور اپنے بالوں میں لگاتی ہے اور لوگ کہتے ہیں دیکھو دیوی کے بالوں سے پھول جھڑ رہے ہیں ۔۔

جب اتنا سارا جھوٹ ختم ہو گا تو ایک سچ پیدا ہو گا۔ سچی تخلیق کا سچ ۔۔ الزام تراشیوں سے پرے کھڑا سینہ تانے ایک سچ تب میری شاعرہ اور میرے شاعر اس باغ کے باسی ہوں گے جہاں دنیا کے رنگ نہیں، ساتویں آسمان سے پرے کے رنگ ہوں گے ۔۔

جہاں اپنی محبتیں اور اپنی نفرتیں اور ان کی شدتیں اور حدتیں ہوں گی۔ جہاں پھول رنگ اور خوشبو میں ڈوبے ہوں گے، جہاں پرندے ایک دوسرے کے منہ میں چوگا ڈالے مسکراتے مسکراتے زندگی گذار دیں گے ۔ جہاں کی جھیل اور جھرنا چاندنی کی روشنی میں نہایا بیٹھا رہے گا ۔۔ جہاں آخری حد تک پھولوں کی نگریاں ہوں گی ۔ میرا شاعر اور میری شاعرہ تو اس جنت کے رہنے والے ہیں ۔۔ یہ کون لوگ ہیں جو مرتبے کے لئے لڑ رہے ہیں ۔۔ جو نمبروں کی دوڑ کے لئے ایک دوسرے کے سروں پر راکھ اڑا رہے ہیں ۔۔ یہ کون لوگ ہیں جن کے اندر منافقت سے بھرے ہوئے ہیں، جھوٹ کا میک اپ اور دھوکہ دہی کا لیپ جن کے چہروں پر ہے۔ جو مسکراتے نہیں ۔۔ اور جن کے ماتھوں پر تیوریاں ہیں ۔۔ یہ کیا تخلیق کرتے ہیں اور کیسے؟ میرے معاشرے میں جب سب کچھ کھوتا ہو چکا ہے تو محبت کے یہ مسافر تو اجلے رہیں ۔۔ ایک دوسرے پر کیچڑ پھینکیں گے تو اجالا سب چہروں سے مٹ جائے گا۔

سیاہی جو ہر شعبے سے نکل کر پورے ملک میں پھیل رہی ہے، اس ایک شعبے سے نکلی تو اتنی گہری ہو جائے گی کہ سب آنکھیں اندھی ہو جائیں گی ۔ لوگوں کی آنکھ، اور دل نکل گیا تو خالی جسم کب تک پھڑکتا رہے گا ۔؟ تو معاشرے کی آنکھوں سے اور دلوں سے کہنا ہے ۔ دیکھنا تڑپنا، اور محسوس کرنا نہ چھوڑو ۔۔۔ ورنہ تو کچھ بھی نہیں رہ جائے گا ۔۔ ایک بڑا سا برف کا تودہ اور اس میں دفن سب کے مفادات، خود غرضیاں، دھوکے اور جھوٹ ۔ اور اتنے بڑے جھوٹ میں کوئی کتنے دن جئے گا؟

☆☆☆

صحافت میں لیڈر

22 جون 2007 کو پاکستان کے ایک نجی چینل کا ٹاک شو تھا، جس میں ایم کیو ایم کے بابر غوری صاحب کے ہاتھ میں ایک بچی کی تصویر تھی اور وہ اچھل اچھل کر اسے عمران خان کے چہرے کے پاس لے جاتے تھے اور پھر ایک باآواز بلند نعرہ بلند کرتے تھے اور کہتے تھے بچی کی شکل ہو بہو عمران تمھارے سے ملتی ہے۔۔اور پھر استفسار کرتے تھے کہ چلو چلتے ہیں، چل کر تمھارا ڈی این اے ٹیسٹ کرواکر آتے ہیں۔ سیتا وائٹ کو انصاف نہ ملا تو کیسی تحریک انصاف اور کہاں کی تحریک انصاف؟ دوسری طرف عمران خان چہرے کی سرخی چھپاتے ہوئے ان ملکی مسائل اور گناہوں کا حساب اس سے پوچھنے کی کوشش کر رہے تھے جن کا ذمہ دار وہ غوری کی جماعت کو سمجھتے تھے۔ ان کے پاس اس جماعت کی دہشت گردی، غنڈہ گردی، قتل وغارت کے معاملے تھے اور دوسری طرف غوری صاحب کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی جس کی شکل عمران خان سے ملتی تھی اور وہ اسے اپنانے کو تیار نہیں تھے۔۔تیسری طرف مقبول پروگرام کے اینکر پرسن کے چہرے پر شادابی اور گلابی تھی، ایک آنکھ کبھی کھلتی اور کبھی بند ہوتی اور شرارتی مسکراہٹ چھپائے نہ چھپتی۔۔

اس طرح کی چٹپٹی گفتگو ہو تو پروگرام ہٹ کیسے نہ ہوگا اور انٹرنیٹ کے اس زمانے میں یہ لنک ہوتا ہوتا نہ جانے دنیا کے کس کس کونے میں پہنچے گا اور اب یہ پروگرام مقبولیت کی سب سے پہلی سیڑھی پر ہوگا۔ سرکاری مسائل کی بات اور ملکی دکھ تو نجانے کن کا مسئلہ ہیں۔۔بات تو عمران خان کی اعلی کرداری کی تھی اور اس پروگرام کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اگر لیڈر کا کردار ٹھیک نہیں وہ اپنی ناجائز اولاد کو جائز انصاف نہیں دے سکتا تو وہ عوام کو انصاف کیسے دے گا یا دلوائے گا۔

اور ایسا لیڈر کسی کے محاسبے کی بات کسی صورت نہیں کرسکتا۔ اور نہ اسے سیاست میں حصہ لینے کا حق ہے۔ کہیں پر بابر غوری صاحب کی اس مہم جوئی کی خبریں نہ شائع ہوئی کہ وہ مذمت بن سکتی۔ کوئی ایسا لفظ سننے میں نہ آیا کہ یہ گفتگو ٹی وی پر دکھائے جانے کے قابل تھی یا نہیں؟ وہ قوم جو ابھی چھلے سے باہر نہیں نکل پا رہی اس کا گیلا گیلا سرا یک دم کیسے آپ ٹھنڈی ہوا میں رکھ سکتے ہیں؟

16 ستمبر 2009 کے ایک اور نجی چینل کے پروگرام میں دو سیاسی خواتین کو نہایت غیر سیاسی انداز سے دست و گریباں دیکھا تو 22 جون کا وہی پروگرام یاد آ گیا۔ پہلی حملہ آور خاتون کشمالہ طارق جنہوں نے بڑے تمسخرانہ انداز میں دوسری خاتون کو لوٹا۔ اور نہ جانے کیا کیا کہا۔۔ دوسری خاتون جو کہا جاتا ہے ڈاکٹر ہیں (فردوس عاشق)۔۔ انہوں نے پھر مس کشمالہ کو کچھ یوں آڑے ہاتھوں لیا کہ اینکر پرسن خوش ہو گیا، جس کی اس خواہش کا اظہار اکثر اسی کے کالموں میں پڑھا ہے کہ مہمانوں کو ایک دوسرے کا منہ نوچنا چاہیے۔ ورنہ پروگرام پھیکا ہو جاتا ہے۔ مگر ان دو پروگرامز میں فرق یہ تھا کہ اس شو پر بہت تنقید ہوئی۔ کہ ڈاکٹر فردوس عاشق نے ذاتی حملے کیے ہیں۔ جب میں نے یہ شو دیکھا تو مجھے پرانے کسی بھی ٹاک شو سے کوئی فرق نہیں محسوس ہوا۔ کوئی انوکھا پن، کوئی انفرادیت کچھ نہیں۔ مجھے بالکل نہیں لگا کہ کوئی غیر معمولی بدتمیزی ہو رہی ہے۔۔ اسی طرح دو افراد (کشمالہ طارق اور ڈاکٹر شیریں مزاری) اکٹھے ایک چھت کے نیچے، ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے، قہقے لگاتے ہوئے، آٹے دال اور لوگوں کے دکھوں پر بات کر رہی تھیں، ڈاکٹر فردوس عاشق کو چڑانے میں مصروف تھیں۔۔

اور اسی طرح اینکر پرسن، آنکھ دبائے، کبھی ہنسی چھپائے ہلکا ہلکا روکتا اور پھر کوئی نقطہ ایسا چھوڑتا کہ اس پر پھر منڈیوں والا شور مچ جاتا۔۔ آلو لے لو۔۔ پالک لے لو۔۔ اور پھر ان سب کا نتیجہ جس کو شکار کر کے چھت گرانے کا منصوبہ ہو۔۔ اسے پکڑ لو۔۔ ڈاکٹر فردوس اپنی تمام ڈگریوں سمیت، اپنے اعلی حسب نسب پر ناز کرتیں جب میدان میں کودیں تو پھر وہی نتیجہ نکلا جو اس پروگرام کا اینکر پرسن نکالنا چاہتا تھا فرق صرف یہ کہ عمران خان کے اس شو میں کسی طرف سے یہ شور نہیں اٹھا کہ غیر

پارلیمانی زبان استعمال ہوئی ہے۔مگر اس پروگرام کے بعد ڈاکٹر صاحب کو کافی مسئلے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور سنا ہے کہ شاید کشمالہ کی یوسف گیلانی سے بات کے بعد ڈاکٹر صاحب جو لوگوں کی منتخب وزیر ہونے پر نازاں تھیں، ایک غیر منتخب پارلیمنٹیرین کے ہاتھوں فارغ ہوتی نظر آتی ہیں ۔اگر ذاتیات پر حملے اتنے برے تھے تو عمران خان پر گند اچھالنے کے بعد بابر غوری کو الطاف حسین کی طرف سے نوٹس کیوں نہیں ملا تھا؟

یہ طے کیوں نہیں کر لیا جاتا کہ قانون سب کے لئے برابر ہے۔ ۔اگر ایک سیاست دان کی ذاتی زندگی، اس کا کردار، اس کا بیڈ روم۔ ۔ پوری عوام کی جاگیر ہے تو سیاست میں آنے والا ہر مرد اور عورت اسی ترازو میں تولا جائے گا۔ ۔اور اگر ان کاموں کی پردہ داری ہی مقصود ہے تو پھر سب کی ہو۔ ۔سب حمام میں ننگے ہیں تو کپڑے کس کے اتارے جاتے ہیں؟ سب ایک دوسرے کے کردار سے واقف ہیں ۔۔صحافی ، سیاست دان ، بیوروکریٹ ۔ ۔۔اگر بدکرداری ہمارے معاشرے میں جرم نہیں رہا، یا یہ اپر ہائی کلاس کا ٹریڈ مارک بن چکا ہے تو وہائی کیا ہے اور کیوں ہے ۔ ۔میڈیا کے ان کھیل تماشوں میں فائدہ تو میڈیا کا ہو رہا ہے مگر کبھی یہ سوچا کہ نقصان کس کا ہو رہا ہے ۔ ۔؟ جب وصی ظفر، شیر افگن اور شیخ رشید جیسے سورما لائیو شوز میں آ کر گالیاں تک دے جاتے تھے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟

ایک طرف تو یہ فلمی ستاروں جیسی خوبصورت اور زبان دان سیاست دان خواتین اور دوسری طرف اصلی فلم سٹار میرا۔ ۔نجی ٹی وی کے نیوز کاسٹر نے جس طنز سے اور جس تعصب سے اس کی خبر سنائی ۔۔اور انٹرویو کرنے والے نے جس طرح اسے ہراساں کیا تو مجھے یہ فرق یاد نہیں رہا کہ یہ میں کوئی investigative documentary دیکھ رہی ہوں یا ٹی وی کا عام سا خبرنامہ سن رہی ہوں جس کے مطابق جتنی کو جرنلزم میں نے پڑھی ہے کہ مطابق اگر انٹرویو دینے والا اسے آف دی ریکارڈ کہہ دے تو آپ اسے آن دی ریکارڈ نہیں کر سکتے ۔ ۔مگر وہاں تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ بقول میرا کے پنجاب کی بیٹی اور اول درجے کی ہیروئین کیمرا بند کرنے کا کہہ رہی ہے اور کیمرہ مین اور

انٹرویو کرنے والے کسی پولیس کی طرح اس کا گھیراؤ کیے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے بلیک واٹر (زی) کے ساتھ ساتھ پاپائے رازی بھی ہمارے ملک میں گھس گئے ہیں۔ پاکستان کی سیاست اور صحافت دونوں کو سانچے کی ضرورت ہے۔

گو چٹ پٹی خبریں اور مرچ مصالحہ لوگوں کی توجہ بہت جلد اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سب ہوا ایک طرف کو چل رہی ہو تو اپنا وجود، اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لئے جس سمت میں اڑنے سے عظمت کے نشاں نہیں مٹتے ادھر اڑنے کے لئے طاقت کا لگانا ضروری ہے۔ ہماری قوم کچے گھڑے پر سوار ہے۔ غیر متعصب، صاف ستھری اور ایماندارنہ صحافت اس گھڑے کا وہ لیپ ثابت ہو سکتی ہے جو اسے بکھرنے سے بچا سکتا ہے۔ جس طرح ذاتی مفاد پرستی اور انا کی سیاست قوموں کو برباد کر دیتی ہے اس سے کہیں زیادہ ذاتی فائدے اور ذاتی لڑائی کی صحافت قوموں کے لئے بربادی کا باعث بن سکتی ہے۔ قائدے، قانون وضع ہونے چاہییں۔ فرد کو اپنے کندھوں سے آگے ایک پوری قوم نظر آئے تو سیاست اور صحافت دونوں کا قبلہ ٹھیک ہو جائے۔ ورنہ قوم آٹا، بجلی، پانی، چینی اور کاٹن کو بھول جائے اور پیٹ سے بھوکے، پانی کو ترستے، تن سے ننگے اور اندھیرے میں ڈوبے لوگوں کی تفریح فقط یہ گند اچھالتے ٹی وی شو۔۔ اور تھڑکتی پھڑکتی خبروں سے بھرا ہوا خبرنامہ ہو گی۔ اور آج سٹیج ڈراموں کے اندر اترے ہوئے اندھیرے کا الزام رائٹر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر عوام کے مزاج پر لگاتے ہیں اسی طرح کل کوئی ٹی وی ٹاک شو میں اتری ہوئی گندگی اور فحاشی کا الزام بھی عوام کی پسند پر لگا دیا جائے گا اور پھر یہی کہا جائے گا کیا کریں لوگوں کے مزاج کے مطابق پولیٹیکل ٹاک شو میں گند دکھانا اور سنانا پڑتا ہے، ورنہ ہمیں سپونسر شپ کون دے گا اور کون ہمارے شو دیکھے گا؟ لیڈر وہ ہوتا ہے جو عوام کو پیچھے لگائے، نہ کہ خود عوام کے پیچھے لگے تو ہمارے سٹیج ڈراموں میں بھی لیڈروں کی ضرورت ہے اور ٹی وی ٹاک شوز میں بھی۔ وہ دکھائیں جو دکھانا آپ کا مقصد ہے۔ وہ نہ دکھائیں جو فرسٹریٹیڈ لوگوں کی تفریح بن جائے اور وہ اس کے نشے کا شکار ہو جائیں۔

☆☆☆

روٹی کھاتی مورتیاں

ایک کامیاب حکومت کی یا حکمرانوں کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کا اثر، ان کی پالیسیوں کا اثر عوام پر ایسا گہرا ہو کہ لوگ ان کے رنگ میں رنگے جائیں اتنی محبت ہو کہ رانجھا رانجھا کرتے ہیر خود بھی رانجھا ہو جائے سب ایک رنگ ایک ڈھنگ اور ایک ہی سوچ میں ڈھل جائیں...... مجھے یہ چیز پاکستان میں بہت گہری نظر آئی...... اوپر سے نیچے تک دائیں سے بائیں تک سب لوگ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے۔ جس طرح کے حکمران بالکل اسی طرح کی عوام...... آج لاہور کی فضاؤں کو چھوڑے مجھے ہفتہ بھر ہو چکا ہے...... مگر میرے اندر ایک نامعلوم کرب کی جو لہر جنم لے چکی ہے وہ ابھی تک مندمل نہیں ہو رہی میرا دل کر رہا ہے کوئی کبوتر ایسا ہو جو پاکستان کے حکمرانوں تک میرا مبارکباد کا پیغام پہنچا دے ہمارے حکمران کامیاب ہیں، وہ کامیاب ہیں عوام کو اپنے جیسا بنانے میں وہ کامیاب ہیں لوگوں میں اپنی ڈھٹائی اور اپنی بے غیرتی منتقل کرنے میں...... وہ آج فخر سے سر اٹھا کر چل سکتے ہیں کیونکہ پورے پاکستان میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جو جھوٹ کو جھوٹ کہہ سکے...... جھوٹ کو سچ میں منتقل کر دیا گیا ہے...... حکمران فخر سے سر اٹھا کر جی سکتے ہیں کیونکہ پیارے پاکستان میں اب جھوٹ اتنا پنپ چکا ہے کہ وہ سچ لگتا ہے اور سچ جھوٹ لگتا ہے۔ اور اب پاکستان میں ایسا جھوٹ بولنے والے انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں اس لئے حکمرانوں کے فخر میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں۔ ایک ریڑھی والا بھی حکمران جماعت کی زبان بولتا ہے ایک آفس بوائے بھی

حکمرانوں کی سی خوشامد اور جھوٹ میں اتھری گیم کھیلتا ہے، ایک کام والی ماسی بھی پاکستانی سیاستدانوں کی بولی بولتی اور ان جیسی سیاست کھیلتی نظر آتی ہے ایک زمانہ تھا کبھی کرکٹ کا بول بالا گلیوں میں ہوتا تھا اس سے پہلے ہاکی فوبیا تھا...... آج کے حکمرانوں کو مبارکباد کہ آج کے پاکستان کا مقبول ترین کھیل سیاست ہے اور اس کا سارا کریڈٹ حکمران لیگ کے لیڈروں کو جاتا ہے...... جتنی صفائی سے اور جتنی مہارت سے اس لیگ نے اور اس کے شہ جوانوں نے خوشامد، جھوٹ، دغا، دھوکا، بے غیرتی اور بے شرمی عوام میں عام کی ہے اس سے پہلے کسی سیاست دان کے حصے میں ایسی شفاف کامیابی نہ آئی تھی ...... آج لوگ پاکستان میں جھوٹ کو ثواب سمجھ کر بولتے ہیں خوشامد کو ترقی کا راستہ جانتے ہیں، ہڈحرامی کو اپنا حق مانتے ہیں، دغابازی کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اور دھوکے کو اپنی سب سے عزیز متاع سمجھ کر دوسروں کو دیتے ہیں۔ یہ خاندانی اوصاف پر مشتمل کھیل اتنا پختہ ہو چکا ہے، قوم کے رگ و جان میں اس طرح اتر چکا ہے کہ کیا شراب کا نشہ ہوتا ہوگا؟ جتنا اس کھیل نے عوام کو مدہوش کر رکھا ہے۔

میں نے بڑے لوگوں سے پوچھا، انہیں کریدا...... کہ کہیں مجھے زندگی کی رمق نظر آ جائے کہیں مجھے کوئی زندہ انسان مل جائے...... مگر آج کے پاکستان میں 2007ء کے پاکستان میں میری ملاقات صرف مردوں سے ہوئی کسی میں جان کی رمق نہ تھی...... لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ ووٹ ضرور ڈالیں ...... ٹی وی کے ایک پروگرام میں بہت زور دیا جا رہا تھا...... پہلی بات تو ووٹ زندوں کا ہوتا ہے...... ووٹ انسانوں کا ہوتا ہے...... پاکستان میں اب حکمران ایک دفعہ پھر مبارکباد کے مستحق ہیں کوئی انسان نہیں بستا ...... تو ووٹ کا ڈرامہ کیا...... بند ہواؤں میں، لوڈشیڈنگ ...... سوتے ہوئے لوگ چلاتے ہوئے اٹھتے ہیں روتے ہوئے بچے ماؤں کو چمٹ جاتے ہیں بند ہوا، بجلی بند...... آج کے انسان کی بنیادی ضرورت اس سے محروم لوگ...... وہ انسان نہیں ...... انسان ہوں تو انسانوں کے بنیادی حقوق سے کیوں محروم ہوں، اور محروم کیے جانے پر اس طرح خاموش کیوں ہوں...... ان گھروں کو آگ کیوں نہ لگا دیں جہاں اس ملک کے حکمران چین کی نیند سوتے

ہیں جن کی نیند میں کبھی بجلی نہیں جاتی جن کے خواب کبھی نہیں ٹوٹتے اور جن کے بھیانک چہروں پر کبھی پسینے کی بوند تک نہیں آتی اگر پاکستان میں زندہ انسان بستے تو اپنے اوپر اتنا ظلم کیسے برداشت کرتے ان گھروں کو آگ نہ لگا دیتے جن کے بلب کی روشنی کبھی مدہم نہیں ہوتی جن کے بچے نیند میں تڑپ کر کبھی نہیں اٹھتے جن کے سانس کبھی گرمی کی شدت سے بند ہونے کو نہیں آتے......

اگر پاکستان میں زندہ لوگ ہوتے تو وہ ایک منسٹر یا ایک پارلیمنٹ کے رکن کی گاڑی سڑک سے گزرنے کے صدقے جانوروں کی طرح جنگلوں کے پیچھے پندرہ پندرہ منٹ، آدھا آدھا گھنٹہ صبر شکر کر کہ شدت کی گرمی اور حبس میں منہ بغلوں میں دبائے، سر جھکائے کھڑے نہ رہتے......اس جھنڈے والی گاڑی کو اینٹوں سے مارتے......اتنا نہیں تو ہارن بجا بجا کر زمین آسمان ایک کر دیتے......مگر اس سب کیلئے زندہ انسانوں کی بستی ہونا ضروری ہے......ہمارے حکمرانوں کو مبارکباد مجھے پورے پاکستان میں زندگی کی رمق بالکل محسوس نہیں ہوئی......زندہ کیا؟ مجھے تو پاکستان میں انسان کا لفظ ہی استعمال کرنے کا موقع نہیں مل سکا......اگر ہم یہاں بیٹھ کر پاکستان کے ٹی وی چینلوں پر بے شرم سیاست دان دیکھتے ہیں ان کی قلابازیوں پر کڑھتے ان سے نالاں ہیں ان کے کھلے سفید جھوٹوں پر ان کی ڈھیلوں پر اور ان کی ڈیلوں پر حیران ہوتے ہیں تو پاکستان جا کر یہ سب باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں وہاں ہر بندہ ایک عظیم تاف لیگ کا رکن دکھائی دیتا ہے۔ تاف لیگ اس لئے کہ خوشامد، مفاد پرستی اور جھوٹ میں اس فصلی اور موسمی جماعت کو میں سب سے زیادہ نمبر دیتی ہوں آنے والی نسلوں کے بچوں کیلئے ایک کہانی تیار ہو رہی ہے مائیں اپنے بچوں کو کہانی سنائیں گی ایک تھا بادشاہ، نہایت منہ زور اور اکھڑ، فرعون نما، جس کے وزیر خوشامد میں، منافقت میں اور دھوکہ دہی میں ماہر تھے جس کے دور میں بے شرمی، ڈھٹائی، ہڈحرامی، مکر اور فریب کا ایک حسین جال تنا تھا......اس کی بستی میں انسان نہیں رہتے تھے اس بادشاہ کے وزیروں اور مشیروں کے صدقے ان کی کھلم کھلا بدمعاشیوں اور منہ زوریوں کی وجہ سے سب انسان پتھر کی مورتیوں میں تبدیل ہو چکے تھے ان مورتیوں میں نہ دل تھے اور نہ دماغ......جو نہ ظلم کو محسوس کر سکتے

تھے اور نہ بیان ...... ان پتھروں پر جو بھی دھوپ، بارش پڑتی ...... ان کے اندر سے بس ایک ہی آواز نکلتی ...... ہمیں آٹا، روٹی چاہیے ...... اور بس ...... اس حکومت کی کامیابی کا راز بھی یہی تھا کہ مورتیوں کو بھوک کے اس چکر سے کبھی نہ نکلنے دو اگر یہ اس چکر سے نکل گئیں تو اور بھی راگ الاپنے شروع ہو جائیں گی ...... اب سب مورتیاں صرف روٹی کھانے کیلئے حرکت میں آتیں ...... اور پھر پتھر کی بن جاتیں ...... ان کی زندگی صرف روٹی تک محدود تھی ...... اس سے آگے حقوق کی بات تو انسان کرتے ہیں ...... وہ انسان کب تھیں وہ تو مورتیاں تھیں، پتھر کی مورتیاں ...... جن کے پتھر میں بادشاہ سلامت، اور ان کے وزیروں مشیروں کے سب اوصاف شامل ہو گئے تھے ...... بچے پوچھیں گے کیا وہ مورتیاں کبھی دوبارہ انسان بن سکیں؟ کیا ان مورتیوں کو کوئی ایسا شہزادہ ملا جس نے انہیں دوبارہ سے زندگی کی طرف لوٹا دیا؟ کیا ان پتھروں میں کسی خدا نے جان ڈالی؟ کیا ان پتھروں کو کوئی خدا ملا؟ یا یہ پتھر آنے والی ساری نسلوں تک پتھر ہی رہیں گے؟ میری دعا ہے کہ کہانی سنانے والی ماؤں کو اس وقت تک کوئی جواب مل گیا ہو ...... بچوں کے یہ سوال بنا جواب کے کئی صدیوں تک بھٹکتے ہی نہ رہیں۔ ہم تو لگتا ہے پتھر کے ان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائیں گے ہماری آواز بھی سنی نہیں جائے گی ...... مگر کاش آنے والی نسلوں کے بچے ہمارے جیسے مقدر سے کوسوں دور رہیں ...... ان کو وہ ملک ملے جہاں کم از کم انسان تو رہتے ہوں ...... کیا یہ ایک بہت بڑی تمنا ہے؟ کیا یہ میری میرے خدا سے بہت بڑی مانگ ہے؟ صرف اور صرف ...... ایک چھوٹی سی خواہش ...... پاکستان میں رہنے والی عوام کو انسان سمجھا جائے ...... بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں پھر ان سے ووٹ بھی مانگ لینا ...... میری نادان سمجھ کے مطابق ووٹ زندہ انسان ہی ڈال سکتے ہیں ...... چلو صرف ووٹ لینے کیلئے ہی صحیح پاکستانی عوام کو انسان تو سمجھنا شروع کریں۔

☆☆☆

بلوچستان کی آزادی کس سے؟ پنجاب سے؟

چودہ اگست کا دن تھا اور پنجاب پاکستان سے ایک ایس ایم ایس آیا۔۔قائداعظم کی شان میں گستاخی تھی اور انہیں غدار اور بے وقوف کہا گیا تھا۔ میں چونک گئی۔۔ایس ایم ایس بھیجنے والا ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔۔۔ میں نے اسے سنکی اور پاگل سمجھ کر اگنور کرنے کی کوشش کی، اس پیغام کو بھلانے کی کوشش کی مگر وہ میرے دماغ سے چپک گیا۔۔ میں نے ان خطوط پر کبھی کچھ کہنا تو کیا سوچنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی چیزوں پر، رشتوں پر اور اپنی اقدار پر بغیر کسی کمپلیکس کے فخر کرتے ہیں اور انہیں کسی بھیڑ چال میں بہہ کر گنواتے نہیں۔۔ آج کی بھیڑ چال اسلام میں بدعتیں اور پاکستان کے بننے کی وجہ اور نیت پر شک۔مگر وہ ایس ایم ایس میرے دماغ کے اتنے مضبوط ہونے کے باوجود اس میں چپک گیا۔۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میرے پاکستان میں لوگ اتنے تنگ آگئے ہیں کہ وہ پاکستان کے بننے کے مقصد اور اس کے پیچھے دی گئی قربانیوں کو آج محض ایک ڈرامہ اور ایک فرد کی ذاتی انا کا پھل سمجھ رہے ہیں۔ وہ فرد جس کا نام لوگ بھول جاتے ہیں مگر اس کی خصوصیت۔۔۔قائداعظم۔نہیں بولتے۔جس کی پہچان ہی اس کا قائد ہونا ہو۔میرا ماننا ہے کوئی خودغرض شخص کبھی بھی عزت کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جس مقام پر اللہ اپنے بےغرض بندوں کو پل بھر میں پہنچا دیتا ہے۔اس بےغرض انسان پر پنجاب سے آئی ہوئی گالی میری راتوں کی نیندیں اڑانے کے لئے کافی تھی۔۔کہ ایک اور جھٹکا لگا۔۔

آج جو پیغام تھا وہ برسلز سے ایک کشمیری نوجوان کا تھا۔۔اور اسکے پیغام میں اپنا نام تو شامل تھا ہی ایک بلوچستان کی نوجوان میڈیکل کی طالبہ کا انٹرویو بھی تھا۔۔اور اس انٹرویو میں کہا گیا تھا کہ ہم ہر نماز کے بعد دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں پاکستان کی نفرت اور بڑھے۔ہم آزادی لے کر رہیں گے۔اور وہ اس چیز پر افسوس کر رہی تھی کہ ہم پانچویں کلاس تک یوم پاکستان کیوں مناتے رہے ہیں؟اور اب وہ بتا رہی تھی کہ ہماری نئی نسل جان گئی ہے کہ پاکستان ہمارا دشمن ہےاور ہمیں اس سے آزادی لینی ہے۔ اور میں اس انٹرویو کو سن کر سوچتی رہی کہ آزادی کس سے؟پنجاب سے ؟جہاں کا ایک پڑھا لکھا جوان لکھتا ہے کہ پاکستان بننا ہی سب سے بڑی جہالت تھی۔۔یا سندھ سے؟ جہاں کے لوگ مہاجر، پشتون اور سندھی کے چکر میں اپنا اپنا ملک مانگ رہے ہیں۔۔کون ہے جسے آزادی نہیں چاہیئے؟ابھی تو بلوچی، سندھی،اور پشتون مانگ رہے ہیں۔

عنقریب شیعہ، سنی اور وہابی بھی مانگیں گے۔۔پچھلے سال ایک عالم کے فتوی پر جب ایک قادیانی ڈاکٹر کا قتل ہوا تو یہاں ایک قادیانی پاکستانی نژاد کینیڈین خاتون نے نہایت غصے سے مجھے لکھا۔پاکستان میں امریکہ ڈرون اٹیک کر کہ جتنے لوگوں کو مار رہا ہے بہت اچھا کر رہا ہے۔ یہ پاکستانی ہیں ہی اس قابل۔۔اس وقت بھی میرا دل کٹ گیا تھا اس لئے نہیں کہ خاتون نے کسی خاص فرقے کو بد دعا دی تھی بلکہ اسلئے کہ لوگ تو وہاں روز کٹتے مرتے ہیں،کسی فرقہ بندی کے بغیر۔تو ایک فرقہ یا ایک فرد یہ کیوں سمجھتا ہے کہ اسی کا فرقہ اور اسی کے صوبے پر ظلم ہو رہا ہے۔وہاں چند مٹھی بھر کا حکمران طبقہ ہےاور ان کی منہ زور عیاشیاں ہیں۔ جو ایک شراب کی بوتل، ایک خوبصورت عورت، اپنے ڈائننگ ٹیبل کی رونق،اور باتھ روم کی ٹائلز کے لئے ملک کا کوئی بھی حصہ بخوشی الگ کر سکتے ہیں۔افسوس تو مجھے ان لوگوں پر ہوتا ہے جو آپس میں اتحاد کی بجائے اس پاکستان کو اور اسے بنانے والے اس عظیم انسان کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ایک دوسرے کے گریبان پکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں جن کی سزا یہ ہونا چاہیئے کہ ان کی پیٹھ کو ننگا کر کے اس پر کوڑے برسائے جائیں۔۔آپس کے جھگڑوں میں اور پاکستان کو توڑنے

میں ہم لوگ اتنے گم ہیں کہ ان کی زندگیوں کو ہم نے اور پر لطف بنا دیا ہے۔ ہمارے لڑائی جھگڑے ان کی عیاشیوں کا ایندھن ہیں۔

پاکستان کا بننا غلط نہیں، قائداعظم کی وفات کے بعد اس کا غلط ہاتھوں میں ناچنا غلط ہے۔ جس وقار کا، جس عزت کا یہ گھر، اپنا گھر مستحق تھا وہ اسے نہیں ملا اسکے برعکس اسے کسی طوائف کی طرح نچایا گیا، بیچا گیا اور اپنے سے کاٹ کاٹ کر الگ کیا گیا۔

بلوچستان کے حالات ہم سے چھپے نہیں اس کے ساتھ زیادتی آج سے نہیں بہت عرصے سے ہو رہی ہے۔ کون سا حکمران ایسا آیا جس نے انہیں انصاف دلانے کی بات کی ہو۔ کوشش کی ہو۔ اس میں رہ رہ کے آزادی کی تحریکیں اٹھتی گئیں مٹتی گئیں اور پھر ابھرتی گئیں۔ مستقل حل کس نے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قائداعظم نے اپنے آخری دن زیارت بلوچستان میں گزارے، ان کے پاس وقت ہوتا تو وہ اس علاقے کو جو شروع سے متضاد رویوں کا مرکز رہا تھا، متحد کر دیتے۔

ان کے سیاسی تدبر اور پاکستان سے اخلاص پر کس محبِ وطن کو شک ہو سکتا ہے۔ مگر کہا گیا کہ میر احمد یار خان ان سے ذاتی دوستی کی وجہ سے پریشر میں آ گیا تھا اور پاکستان سے الحاق کے راضی نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ بلوچستان کا کچھ حصہ ایران، کچھ افغانستان اور پھر پاکستان بننے کے بعد کچھ حصہ اپنی مرضی سے پاکستان سے آ ملا۔ اس کے پاس تینوں آپشنز تھیں۔ انڈیا، پاکستان یا آزادی۔ اسی نواب آف قلات کے بھائی پرنس کریم نے 1948 میں اس وقت بغاوت کی جب سردار بے خان نچکی کو صوبے کا گورنر بنا دیا گیا۔ یہ پرنس بعد میں اپنے ایک سو بیالیس ساتھیوں کے ساتھ پکڑا گیا۔ سال سزا اور جرمانہ ہوا۔ پھر 1958 میں نواب نوروز (المشہور بابو نوروز) نے بغاوت کی اور جب وہ حیدرآباد مذاکرات کرنے گیا تو اس کے بیٹوں بھتیجوں سمیت اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہ جیل میں ہی مر گیا اور باقیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اور یہ کارنامہ جنرل ٹکا خان کی کتاب میں لکھا جانے والا ایک اور ورق ہے۔ 1963-1969 میں پھر ایک بغاوت کی لہر شیر محمد بجرانی مری کی قیادت میں اٹھی۔ بھٹو نے 1973 میں عطاءاللہ مینگل سے مذاکرات کرنے سے انکار کر

دیا۔ 1973-1977 تک نواب خیر بخش مری نے مسلح جدو جہد شروع کی اور اسے ختم کرنے کے لئے پاکستان کی فوج کے تین چار سو فوجی شہید ہوئے اور سات ہزار تین سو علیحدگی پسند اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نواب اکبر بگٹی بھٹو کے پورے دور میں بلوچستان کا گورنر بنا رہا مگر اس کے منہ سے تب کبھی بلوچیوں کے حقوق کے لئے آواز نہیں نکلی۔

1978 -- 1984 تک رحیم الدین خان ضیا الحق کے زمانے میں مارشل گورنر آف بلوچستان بنا اور وہاں پنپنے والی سب آزادی کی تحریکوں کو اس نے کامیابی سے ختم کیا۔ ترقیاتی کام بھی اس کے دور میں ہوئے اور پہلی دفعہ اس نے نوابوں، ذمے داروں کو صوبائی اسمبلیوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔۔ اسی کے زمانے میں چاغی میں نیوکلیئر تجربے ہوئے۔ یعنی اس نے چاہے ڈنڈے کے زور پر ہی سہی کیونکہ سول اور آرمی دونوں طاقتیں اس کے پاس تھیں، بلوچستان میں علیحدگی پسندی جیسے خیالات ختم کیا اور محب الوطنی کو فروغ دینے کی کوشش کی۔۔ ایک بلوچی کو پاکستانی ہونے کا احساس دلوایا۔ اگست 2006 میں 79 سال کے نواب اکبر بگٹی کو جب موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو وہ بلوچی قوم کا ہیرو بن گیا۔ اور یہی وہ بگٹی تھا جس پر اپنے ذاتی جیل خانے رکھنے کا الزام ہے، قتل و غارت، فیڈرل کے وہ فنڈ کھانے کا الزام ہے جو اسکے صوبے کو مختص کیے جاتے تھے۔ مگر لوگوں کو اعتماد میں لئے بغیر فوج کے حملے، علیحدگی پسندوں کی گمشدگیاں، اغوا۔ جیسے اپریل 2009 میں بلوچ نیشنل موومنٹ کے صدر غلام محمد بلوچ اور اس کے دو ساتھی لالہ منیر اور شیر محمد کا دن دھاڑے کسی دکان کے سامنے سے ہتھکڑیاں لگا کر اٹھا لے جانا اور پھر پانچ دن کے بعد ان کی لاشوں کا ملنا۔۔ لوگوں میں نفرت نہ بھرے تو کیا بھرے؟ اور عام بلوچی اپنے نوابوں، بگٹیوں اور مینگلوں کے ظلم کو بھول کر انہیں تو اپنا ہیرو بنا رہا ہے مگر پاکستان آرمی اور پاکستان کو اپنا دشمن سمجھ رہا ہے۔ ظلم کی انتہا نے اور نا انصافی کی شدت نے ان کے اندر ایسی نفرت بھر دی ہے جو انہیں راستہ دکھا نہیں رہی بلکہ راستے سے بھٹکا رہی ہے۔ اس صوبے کے اندر بغاوت کی چنگاریاں تو سلگیں گی، جیسے 1947-2002 تک صرف billion 152 اور 2002-2008 تک

320 billion کی رقم ذرائع میں سے تقسیم کی گئی ہو۔ وفاق اس کے ذرائع سے اربوں کھربوں بنا رہا ہو اور اسے صرف چند سکوں سے بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور جس صوبے سے 1952 سے گیس نکلی ہو اور اسی صوبے کے لوگ گیس جیسی سہولت سے محروم ہوں تو کیا کہیے گا صاحب۔۔کون روکے دلوں میں نفرت پکنے سے؟ دادا گیری یہاں تک ختم نہیں بلکہ 1980 سے اس گیس کے استعمال کی رائلٹی تک سے صوبہ محروم ہے۔

اور پھر کیا ناممکن ہے کہ اسکے لیڈر پاکستان کے دوسرے کرپٹ لیڈروں کی طرح اپنی سیاست چمکانے کو اور اپنی جیبیں بھرنے کو انہیں ایشوز کو سامنے رکھ کر ہاتھ بلند کر کے نعرے لگاتے ہیں اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ انہی لیڈروں کی نوابی کو قائم رکھنے کے لئے اس صوبے کو حکومت نے ہمیشہ پس ماندہ رکھا ہے۔ وہ ان نوابوں سے الجھنے سے بچنے کا بہانہ مدنظر رکھتے ہیں۔کیوں کہ یہ بہانہ بھی بہر حال موجود تو ہے اور اسے اپنی سستی، ہڈحرامی اور عیش پسندی میں جمع کر لیتے ہیں۔ گوادر پورٹ انہیں سازشوں کا شکار ہو رہا ہے۔ جب چائنیز کو اس کا ٹھیکہ دیا گیا تو چائنیز انجینیرز کے اغوا اور قتل کے شور پڑ گئے۔۔ بلوچی لیڈر کہتے ہیں اسلام آباد ایسٹ انڈیا کمپنی کا کردار کر رہا ہے۔ اور ہم اسلام آباد کی کالونی بن کر نہیں رہ سکتے۔ بلوچیوں کو صرف ملازمتیں ملیں اور کوئی اس سے فائدہ نہ اٹھائے اور حکومت نے جو بھی فیصلے کرنے ہیں اس میں ہمیں شامل کیا جائے۔۔ یوگوسلاویہ اور انڈونیشیا کی مثالیں دی جاتی ہیں۔۔ اور میں یہ سوچتی ہوں اگر مقامی لیڈر اپنے لوگوں کے ساتھ مخلص ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ وفاق سے بات منوائی جا سکتی ہے اگر دل میں خلوص ہو تو۔۔لوگوں کو محروم رکھنے میں وفاق کا کردار تو ہے ہی مگر بلوچی لوگوں کو یہ پچھانے کی ضرورت ہے کہ ان محرومیوں کو دور نہ کروانا اور انہیں ہوا دینا یہ کس کا کام ہے؟

اور جن لیڈروں کو وہ ہیرو کا درجہ دے کر ان کی پوجا کر رہے ہیں اور ان پر اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہیں، ان کے محل، ان کی شان وشوکت، رتبہ، ان کے خرچے کسی طور، کسی طرح کم ہیں؟۔ان میں سے کوئی قائد کے پاؤں کی گرد کو چھوتا ہے؟۔جس کا بل گورنر ہاؤس میں 38.50 روپے آجائے تو

وہ اس میں سے اپنی ذاتی چیزوں کا بل اپنی جیب سے اور اپنی بہن کی چیزوں کا بل اسکے اکاؤنٹ سے دیتا ہو۔۔جو اعلی سرکاری میٹنگ میں بھی چائے کافی نہ رکھتا ہو۔۔جس کی گاڑی کے ساتھ فقط ایک سکیورٹی افسر ہو اور جس کی موت ایک ٹوٹی پھوٹی ایمبولنس میں ہو۔۔اور جس کی آخری سانس میں بھی پاکستان ہو۔ایک بھی ایسا بے لوث اور بے غرض لیڈر اس قوم میں ہے؟اس نے ہمیں ایک گھر۔ایک جسم لے دیا ہے۔اور ہم ایسے مورکھ ہیں غیروں کی سازشوں کو بھی اسکی پلیٹ میں رکھتے ہیں،اس کے خلوص پر شک کرتے ہیں اور اس غصے میں،نادانی میں اپنا جسم چھوٹے چھوٹے حصوں میں کاٹ رہے ہیں۔

استحصال کسی ایک فرد یا فرقے یا صوبے کا نہیں ہو رہا۔۔استحصال سب افراد، سب فرقوں اور سب صوبوں کا ہو رہا ہے۔فلاح پانے والے صرف چند لوگ ہیں، جو دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں (پاکستان) کے بدن کی بوٹیاں نوچتے ہیں اور اپنی ہوس کو رام کرتے ہیں۔ایسے لوگوں پر لعنت ڈالنے کی ضرورت ہے۔۔ایسے لوگوں کو چوک میں الٹا لٹکانے کی ضرورت ہے اور ایسے لوگ سنگسار کیے جانے کے قابل ہیں۔۔نہ کہ وہ ماں جس نے ہمیں اپنے پروں میں چھپا رکھا ہے۔

جو اپنا کلیجہ کاٹ کاٹ کر ہمیں سہلاتی ہے، دلاسہ دیتی ہے اور چپکے سے کان میں کہتی ہے اس ظالم دنیا میں تمھارا میرے سوا کون ہے؟ تم لوگ میرے ہو اور میں تمھاری ہوں۔۔۔تو لوگو۔ایسی ماں سے نفرت کرتے ہو۔۔؟اسے کاٹنے کی بات سوچتے ہو؟ نفرت کرنی ہی ہے تو ان آلودہ ہاتھوں سے کرو جو اس کو نوچ کھسوٹ رہے ہیں،کاٹنا ہے تو ان ہاتھوں کو کاٹو،جن کے گند کی چھاپ اس کے چہرے سے دھلتی نہیں ہے۔

☆☆☆

امریکی دادا، بلیک واٹر

North Carolina based پرائیویٹ امریکی ملٹری سیکورٹی ایجنسی جو 1998 میں معرض وجود میں آئی جو ساٹھ ہزار ایکٹر پر مشتمل ہے اور جس کے بانی کا نام ایرک پرنس ہے جو نہ صرف سابقہ نیوی سیل ہے بلکہ کروڑ پتی خاندان کا چشم و چراغ بھی ہے۔
اس تنظیم کا مقصد ملٹری ٹریننگ اور پرائیویٹ طور پر امریکی حکومت اور فوج کی مدد کرنا ہے۔ اور اس مدد میں شامل ہے جہاں جہاں امریکی حکومت چاہتی ہے کہ امریکی فوج کا نام نہ آئے وہ اسے استعمال کرتی ہے اور ایک بلیک واٹر کمانڈو کی تنخواہ، ایک امریکی فوجی سے 6 گنا زیادہ ہے۔ یہ بہت سیکرٹ تنظیم ہے اور اس کا ہر مشن بہت رازداری میں ہوتا ہے اور اس کے کسی اہل کار کو ٹی وی یا کسی بھی میڈیا میں اپنی تصویر دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے سارے آپریشن ڈھکے چھپے ہوتے ہیں اور بظاہر اس کا مقصد یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ منتخب ملک میں امریکی اعلیٰ عہدے داروں کی حفاظت کر رہی ہے یا کہیں کترینہ جیسے طوفان کا مقابلہ کر رہی ہے اور یا لوگوں کے روٹی پانی کے مسئلے کو حل کر رہی ہے۔

سب سے پہلے لوگوں میں اس کا نام اس وقت سنا گیا جب فلوجہ میں 31 march 2004 کو عراقیوں نے 4 امریکی شہریوں کو بہت بے دردی سے نہ صرف مارا، بلکہ گھسیٹا اور لٹکایا بھی اور آخر میں جلا دیا گیا اور پھر ان لاشوں کے گرد گانے گائے اور ڈانس کیا۔ اس بے درد اور سفاک رویے کے پیچھے کیا چھپا تھا، اس کا پتہ تب چلا جب لوگوں کو یہ معلوم پڑا کہ مرنے والے، گھسیٹے جانے

والے اور زندہ جلائے جانے والے عام امریکی شہری نہیں ہیں بلکہ اسی بلیک واٹر کے کمانڈوز ہیں اور وہ روٹی بانٹتے نہیں پھر رہے بلکہ لوگوں کو گھروں سے نکال نکال کر پر تشدد تفتیش کر رہے تھے تو ان چار لاشوں کی بے حرمتی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ اس تنظیم کے کام کے ساتھ قتل، بچوں سے جنسی زیادتی، عورتوں پر تشدد اور اس طرح کے بہت سے الزامات سامنے آنے لگے۔ اور پھر 16 ستمبر 2007 کو اس تنظیم نے عالمی شہرت یوں پائی کہ اس کے کمانڈوز نے بغیر کسی وجہ کے راہ چلتے سترہ عراقیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا، جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، بغداد کے Nisour square میں ہونے والے اس واقعے نے پوری دنیا کے اخبارات کی ہیڈلائن میں اس تنظیم کے نام کی جگہ بنائی۔ عراق کی حکومت اس کے خلاف کاروائی کرنے کی مجاز نہ تھی اور امریکی حکومت نے تھوڑی سی باز پرس کے بعد معاملہ دبا دیا۔ یہ تنظیم اپنے اعمال کی کس کے آگے جوابدہ ہے اس کا بھی کوئی پتہ نہیں، کیونکہ اس کی accountabilty امریکی ملٹری کی طرح نہیں ہے۔ سو امریکی فوج کے کاموں کو طاقت تو دیتی ہے مگر کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے۔ اور جس کام میں امریکہ یہ چاہے کہ اسکا اور اسکی آرمی کا نام نہ آئے اس تنظیم کو کانٹریکٹ سونپ دیا جاتا ہے۔ 2004 میں 9-11 کے بعد القاعدہ کے لیڈروں کو بھی پکڑنے کا کام اسے ہی سونپا گیا۔

آج تک کوئی اہم کارنامہ تو انجام نہیں دیا مگر بے گناہ لوگوں کی موت کا موجب بن چکی ہے۔ اور اسے BLACK WATER as the frightenening new face of the U.S war machine . کہا جانے لگا۔ اس تنظیم کی خاص بات جو کان کھڑے کرنے کے لئے بہت ہے اس کی یہ تعریف ہے جو انگریزی روزناموں میں ہی چھپی ہے:

Miltary organization " founded by ultra -right-wing christian conservatives

ایرک پرنس نے ری پبلکن پارٹی کو دو لاکھ امریکی ڈالر کا عطیہ بھی دے رکھا ہے اور اسکے علاوہ اس کے جتنے بھی اعلیٰ عہدے دار ہیں وہ سب بنیاد پرست عیسائی ہیں اور جن کا مقصد عراق میں بھی

مسلمانوں کا قتل عام ہو سکتا ہے۔اور جو عیسائیت کے پھیلاؤ اور صلیبی جنگوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو قتل کرنے کو جہاد سمجھتے ہیں۔

Jeremy Scahill جس نے یہ کتاب لکھی -- The rise of the world,s most powerful mecenary army . اس کتاب میں مصنف نے اس تنظیم کے کردار، مقصد اور اس کے بانیوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ظلم وستم کی بھرپور مذمت کی ہے۔

رائٹر لکھتا ہے

:What is disturbing about all this is the issue of the co,s right wing leadership,its proximity to a whole slew of conservative cause and politicians ,its christian fundamentalist agenda and secretive nature and its deep and long standing ties to the republican party ,U.S miltary and intelligence agencies , Black water is quickly becoming one of the most powerful private armies in the world ,and several of its top officials are extreme religious zealots ,some of whom appear to beleive they are engaged in an epic battle for the defense of christiandom.

ترجمہ :جیری لکھتا ہے سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے : کمپنی کی دائیں بازو کی لیڈر شپ اور اس کا کنزرویٹوز کی طرف جھکاؤ، اسکا بنیاد پرست عیسائی ایجنڈا، مخفی رویہ، ری پبلکن پارٹی امریکی فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ساتھ اتحاد۔ بلیک واٹر بہت تیزی سے دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور ملٹری تنظیم بن چکی ہے اور اس کے زیادہ تر اعلیٰ عہدے دار بنیاد پرست عیسائی ہیں اور

ان میں سے چند ایک اس بات پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ عیسائیت کو بچانے کی تاریخی جنگ میں ملوث ہیں۔

اس کردار اور اس آواز کی جماعت جو افغانستان، جاپان، ایران، عراق اور آذربائیجان میں مصروف عمل ہے۔ اور جس کے مقاصد ڈھکے چھپے نہیں۔ سنا ہے وہ اب پاکستان میں بھی اپنے پنجے گاڑ چکی ہے۔ پشاور، کراچی اور اسلام آباد میں اس کے کمانڈو زرہائش پذیر ہو رہے ہیں۔ بیس سے پچیس ایجنٹ سرگرم عمل ہیں۔ یہ مقامی لوگوں کو ہائر کرتی ہے اور انہی کی جاسوسی اور غداری کے صدقے اپنے مشن کو مکمل کرتی ہے۔ اس کے قتل پر کوئی جواب ہی نہیں مانگ سکتا یعنی یہ وہ دادا ہے جو سر بازار دندناتا پھرتا ہے اور کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اب یہ دادا این جی اوز کی آڑ میں، سوشل ورک کے کھیل کی آڑ میں پاکستان میں بھی گھس چکا ہے۔ ان کے پاس ایک خفیہ بیس ہے، جہاں وہ اکھٹے ہوتے ہیں، میزائل داغتے ہیں۔۔ جو کام سی آئی اے کرتی رہی ہے وہی کام اب بلیک واٹر کرے گی۔

اس کی موجودگی کے ثبوت کچھ یوں اکھٹے کیے جاسکتے ہیں۔ امریکی ایمبسی کی حد درجہ توسیع، پکڑے جانے والے امریکی اور اسرئیلی ہتھیار، پولیس والے کی امریکی سکیورٹی گارڈ کے ہاتھوں پٹائی اور ہر طرف خاموشی، ایک دم سے ریٹائرڈ فوجیوں، جرنلسٹوں کا شوروغوغا، سیاستدانوں پر کیچڑ، اور برسوں کے چھپے راز، (اس کا طریقہ واردات یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ پرانے ریٹائرڈ فوجی، بیوروکریٹ اور صحافیوں کو اپنے اندر شامل کرتی ہے اور ان کی معلومات کے زور پر اور ان کی افرا تفری پھیلانے کی خوبی کو خوب استعمال کیا جاتا ہے) ۔۔ آج کل وہ لوگ جو صحافت میں نام بنا چکے ہیں اس قسم کے کاموں کے لئے اپنے دام خوب لینا جانتے ہیں۔ ریٹائرڈ فوجی اور بیوروکریٹ اپنی پرانی معلومات کی پھیری لگا کر اپنا دن بیچتے ہیں اور بلیک واٹر کی یہ خونی تنظیم جواب پاکستان میں پنجے گاڑ چکی ہے امریکہ کے وہ عزائم ان غداروں اور مردہ روحوں سے پورے کرتی ہے۔ اور اس وقت پاکستان کو امریکہ کی بیس بنانے اور خطے میں امریکہ کا راج بٹھانے کے لئے ایک تر نوالہ

بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ پاکستان میں بیٹھ کر ایران، افغانستان، چین روس، جاپان سب پر نگاہ رکھنا آسان ہو سکتا ہے۔ امریکہ اس کالے پانی سے ہمارے ملک کی تقدیر کو کالا کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے بکے ہوئے اور مرے ہوئے سیاستدان اس آخری وقت میں بھی ہچکی لینے کو اٹھتے ہیں یا مرے مرے ہی مر جاتے ہیں۔؟ اور جو مسلمان ہونے پر شرمندہ ہوتے ہیں اور آزاد خیال لبرل بنتے ہیں، یوں نہ ہو کسی بنیاد پرست عیسائی کی نفرت کا نشانہ اسلئے بن جائیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ اسے کیا پتہ کہ صرف نام کے ہیں۔۔ اس کا یقین تو اپنے مذہب کے خلاف جو بھی بات کرے اس سے لڑنا ہے۔ اور یہ بھول ہے کہ طالبان اور شدت پسند صرف مسلمانوں میں ہی ہوتے ہیں۔ عیسائی اور ہندو اس بات میں بھی ہم سے کئی گنا آگے ہو سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کا مقدر اب عراق جیسا لکھا جانے والا ہے یا افغانستان جیسا؟ یا کوئی ہم سے لیڈر پیدا ہونے والا ہے؟ اور ہماری قوم بچنے والی ہے۔۔؟

☆☆☆

کینیڈا میں مختاراں مائی کی ضرورت

مختاراں مائی کی شادی کی خبر کے ساتھ مجھے وہ دن یاد آ ئے جب مائی ایک کرب سے، اذیت سے گذر رہی تھی۔ مگر جس نے خاموش نہ رہ کر ایک ایسی تاریخ رقم کی ہے جسکی مثال مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ وہ اس قسم کے حالات کا شکار خواتین اور نوجوان بچیوں کے لئے ایک مشعلِ راہ بن گئی ہے۔ ہمارے گھٹے ہوئے معاشرے میں جہاں منافقت بڑی عام سی جنس ہے، جو ہر دوسرے گھر اور تیسرے فرد میں پائی جاتی ہے، وہاں اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم اور اپنے جسم کے اوپر ملی گئی سیاہ کاریوں کو نہ صرف منظرِ عام پر لانا بلکہ ایک مکمل احتجاج کا روپ دینا۔۔ یقین مانئے پاکستانی معاشرے میں اس سے بڑی بہادری کی بات ایک، مسکین اور مظلوم عورت کے لئے نہیں ہو سکتی۔ میں مختاراں مائی کی دیدہ دلیری اور نقاب اٹھانے کی طاقت کو سلام پیش کرتی ہوں۔ پاکستانی معاشرے میں منافقت اس قدر رچی بسی ہوئی ہے کہ یہ افراد کی شخصیات کا حصہ بن چکی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسے کوئی برا نہیں سمجھتا۔۔۔ عورت! ایک عورت جو منہ پر نقاب نہیں کرتی اگر کھل کر کسی حساس موضوع پر بات کرے تو اس پر عجیب عجیب الزامات لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ اپنے جسم کی جتنی بھی حفاظت کرتی ہو۔ وہی عورت اگر نقاب منہ پر ڈالے، چھوئی موئی بنی رہے اور آپ کو اس بات کی اجازت دیتی رہے کہ خاموشی سے جو کرنا ہے کر لو تو وہ عورت بڑی مشرقی اور باحیا کہلائے جائے گی۔۔۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ گناہ کرتے جاؤ۔۔ اس پر پردہ ڈالے رکھو۔۔۔ خاموشی سے۔۔۔ رازداری سے۔۔۔ کھل کر بات کرنے والے کو، سینہ

تا نے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق سچ کی بات کہنے والے کو۔۔شر انگیز، بدنیت اور بد معاش کہہ دیا جاتا ہے۔ جسے کہتے ہیں نہ کہ مینے ،لوگ کامیاب رہتے ہیں تو یہی حال ہے۔اور جہاں تک مختاراں مائی کا تعلق ہے میں اس کو اس لئے ایک علامت سمجھتی ہوں ۔۔کہ اس نے اس معاشرے میں اپنے جسم پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کی،جس معاشرے میں اگر کوئی لڑکی کو غلط طریقے سے چھو جائے تو وہ ساتھ چلتی ہوئی دوسری لڑکی کو بتانے سے شرمندہ ہوتی ہے۔ اور اسے لگتا ہے اس سے اس کی عزت خراب ہوگی۔ یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ بچیوں میں اتنا شعور ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی باتوں پر خاموشی میں عزت نہ سمجھیں۔۔کیونکہ شائد اسی طرح وہ مکروہ چہرے پھلنا پھولنا شروع ہو جاتے ہیں، جنہیں یہ پتہ ہوتا ہے کہ ان کے کالے کرتوتوں کا شکار عورتیں یا بچیاں خاموش رہیں گی تو وہ پھیلتے ہی جاتے ہیں رات کے کالے سائے کی طرح۔

کینیڈا میں پچھلے دنوں انٹاریو میں ایک پاکستانی یونیورسٹی سٹوڈنٹ کا گینگ ریپ ہوا۔مگر اس کے ملزمان بری ہو گئے۔۔۔کیوں؟

پڑھتے ہی پہلا خیال یہ آیا کہ شائد لڑکی پاکستانی تھی اور لڑکے گورے۔۔اور تعصب کی وجہ سے یہ سب ہوا۔۔مگر جب کیس کی تفصیل پڑھی تو معلوم پڑا کہ لڑکی پر جب حملہ ہوا تو اس نے فوراً بعد پولیس کو کال نہیں کیا تھا بلکہ کچھ دن ٹھہر کر اس نے یہ جرات کی اور دوسری بات یہ تھی کہ اس نے کورٹ میں ان مجرمان کو ٹھیک طرح سے پہچانا نہیں۔۔اس کے غیر متوازن بیان نے کیس کو مشکوک بنا دیا اور کیس خارج ہو گیا۔

یہاں جو بات قابلِ غور ہے وہ ہے، ہماری ثقافت کا وہ حصہ جسے شرم وحیا بھی کہہ سکتے ہیں اور پردہ داری کی ایک قسم بھی۔۔۔اگر یہی کوئی گوری لڑکی ہوتی تو اس نے سب سے پہلے وہیں شور مچا دینا تھا۔۔اور پولیس کو کال اسی وقت کرنی تھی۔۔نہ کہ سوچ بچار کر کے چوتھے پانچویں روز۔۔۔اور عدالت میں بے دھڑک کسی ڈر خوف کے بغیر بیان دینے تھے۔۔یہاں ضرورت ہے بچیوں کو اس بات کی آگاہی دینے کی کہ خاموش رہ کر، یا ڈر کر وہ ایک ایسے گناہ کا حصہ بن رہی ہیں جو مستقبل

میں کسی اور ان ہی جیسی معصوم بچی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ایک خاموشی گناہ کو بہت طول دے سکتی ہے۔۔۔اور بچیوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اس میں ان کی بے عزتی کہیں سے بھی نہیں ہے اور نہ یہ چیز ان کے لئے شرمندگی کا باعث ہونی چاہیئے جیسے مختاراں مائی نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو اپنی بے بسی اور شرم نہیں بنایا۔بلکہ اسکے خلاف آواز اٹھا کر عورتوں کے لئے ایک آگاہی کی شمع روشن کی ہے۔۔اور میرے خیال میں اس شمع کی روشنی کی ضرورت یہاں، کینڈا میں، اتنے روشن اور آزاد ملک میں بھی ہمارے مشرقی گھرانوں میں اسی طرح ہے۔کیونکہ میں نے یہاں بھی محسوس کیا ہے کہ منافقت کی وہی گہری، دبیز چادر۔۔جو بہت سیاہ ہوتی ہے، جو نظر نہیں آتی۔۔ بہت ہی غیر محسوس طریقے سے سرایت کر رہی ہے۔۔۔

اور ہم لوگ وہی سات پردوں میں گناہ کو چھپانے والا کلچر اپنے بچوں کو سکھا رہے ہیں۔گناہ خاموشی سے سہ جاؤ اور بس۔۔۔ایک اور بات جس پر میرا دل بہت اداس ہوا۔۔۔۔۔۔اتوار کی شب اپنی فیملی کے ساتھ یہاں کے مقامی ریسٹورنٹ میں ڈنر کر رہی تھی۔ساتھ کی ٹیبل پر ٹین ایج بچے بچیاں تھے۔۔۔۔جو کہ سب کے سب دیسی تھے۔۔۔لڑکیوں میں سے اکثر کے سروں پر حجاب تھا۔۔۔اور لڑکے چھوٹی چھوٹی داڑھیوں کے ساتھ۔۔یعنی دیکھنے میں کوئی شک نہیں کہ وہ مسلمان گھرانوں کے بچے تھے۔۔۔مجھے ان کے وہاں ساتھ بیٹھنے پر بھی اعتراض نہیں۔۔۔مجھے ان کے آپس میں پر اعتماد گفتگو پر بھی اعتراض نہیں تو مجھے اعتراض کیا ہے۔۔میرا دل اداس کیوں ہوا۔میں نے اپنی بیٹی کو کیوں اپنے ساتھ باتوں میں الجھا لیا کہ وہ ادھر متوجہ نہ ہو سکے۔۔۔۔کیوں؟ کیونکہ ان میں سے ایک لڑکی جس نے حجاب پہن رکھا تھا۔۔وہ مسلسل ایک نامناسب حرکتوں میں مصروف تھی۔۔یہ نامناسب حرکتیں کینڈا میں کوئی انوکھی بات تو نہیں۔۔۔تو پھر میں کیوں نہیں چاہ رہی کہ میرے بچے ادھر متوجہ نہ ہوں۔میرا دل اداسی سے کیوں بھر رہا ہے کیونکہ اگر اس لڑکی نے حجاب نہ پہنا ہوتا۔۔۔کیوں کہ اگر وہ اسلام کو اتنا کھلا پیش نہ کر رہی ہوتی، اس کا حجاب، اس کے چہرے کا رنگ یہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ میرے ملک اور میرے مذہب کی نمائندہ ہے۔اور میں

اپنے بچوں کو یہ بتاتی ہوں کہ ہم لوگ گوروں سے مختلف ہیں۔ ہمارے پاس گرل فرینڈ بوائے فرینڈ کا کوئی تصور نہیں ہے۔۔ اور میں اپنی بیٹی کو بتاتی ہوں کہ عورت کا جسم ایک مقدس مسجد کی طرح ہوتا ہے اور اسکی حفاظت اور پاکیزگی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کسی مسجد کی ۔ اور شائد میں نے کبھی پردے پر، چہرے کو نقاب میں چھپانے پر زور ہی نہیں دیا۔۔ شائد میں غلط ہوں ۔۔ اور میری تعلیمات کے برعکس میری بچی جب اس ٹین ایج لڑکی کو دیکھے گی جو بہت واضح اسلام کی نمائندگی کر رہی ہے۔۔ جس کا نقاب اس کا اسلام بغیر کسی شک وشبے کے ظاہر کر رہا ہے۔۔ تو اس کو اس حالت میں دیکھ کر میرے بچے کیا کہیں گے۔؟۔ کیا پوچھیں گے؟ اس خوف سے میں ان کا دھیان ادھر جانے سے روکتی ہوں اور ان کو باتوں میں الجھاتی ہوں۔۔۔۔

ریسٹورنٹ کی اس میز پر بیٹھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ اس بچی کے ماں باپ نے اس بات پر دن میں دس دفعہ فخر کیا ہوگا کہ ہماری بچی نقاب کرتی ہے۔۔ ہماری بچی نماز کی پابند ہے، ہماری بچی نے قران پاک پڑھ لیا ہے۔۔۔ مگر کیا وہ بچی کو اندر سے مسلمان کر سکیں ہیں؟ مجھے تو یہ شک ہونے لگا کہ شائد اسلام میں ان باتوں کی کوئی گنجائش ہوگی ۔۔ جو یہ لڑکی اا اسلام کا جھنڈا اوڑھے علی الاعلان پورے اعتماد کے ساتھ اس کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اگر اس نے سر پر سکارف نہ باندھا ہوتا ۔۔ اگر اس کا اسلام اس طرح عیاں نہ ہوتا ۔۔ تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔

میرا اس سے کیا لینا دینا۔ مگر اس بچی کے سکارف نے اور اس کی مخالف سمت میں جاتی ہوئی حرکتوں نے میرا دل ہلا دیا۔۔ کاش اس کے ماں باپ اسے سکارف باندھنے کی بجائے یہ سکھانے میں کامیاب ہو جاتے کہ بیٹی عورت کا جسم ایک مقدس مسجد کی طرح ہوتا ہے۔ پہلے خود اس کی پاکیزگی کی حفاظت کرو۔۔ تو خدا خود بخود اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔۔ کتنے ہی گناہ وہ نے ہاتھ بہت قریب پہنچ کر بھی بھسم ہو جاتے ہیں۔۔۔ اپنی مسجد کا احترام کرو۔ سکارف باندھنا نہ بھی سکھاتے تو شائد کوئی فرق نہ پڑتا۔۔۔۔۔ اپنے جسم کی حفاظت کرنا ضرور سکھا دیتے۔۔ یہ میرا خیال ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے یہ خیال ہمارے منافق معاشرے میں بہت مس فٹ ہے۔۔ ہمارا

معاشرہ ہمیں اس کے برعکس تعلیم دیتا ہے۔۔کرلو۔ جو کرنا ہے مگر خاموشی سے۔۔۔ اف تک نہ کرو۔۔سب چھپا جاؤ۔۔سب ڈھک دو۔ گناہ گار کو گناہ کرنے کے لئے اور آزاد چھوڑ دو۔۔اور عورت وہ تو ایسی بات کرے تو بے شرم، بے حیا اور سکارف باندھ کر، داڑھی رکھ کر، نماز پڑھ کر سب گناہ جائز ہو جاتے ہیں۔ ایسا معاشرہ ہے ہمارا جہاں بھی بسا لیں اسے پاکستان میں یا پاکستان سے باہر۔مختاراں مائی جیسے کتنے بہادر لوگ ہیں؟ ہمیں منافقت سے نجات کی بہت شدید ضرورت ہے۔

☆☆☆

پاکستان نہ جیتا ہے، نہ مرتا ہے

پاکستان نہ جیتا ہے، نہ مرتا ہے مگر کیوں؟

عنوان کچھ لمبا ہو گیا۔۔مگر ہماری سزا اس سے زیادہ لمبی ہے۔ ہمارا انتظار اس سے بھی زیادہ طویل ہے۔ سوچتے ہیں یہ ملک سلامت کیسے رہا ہے۔ سوچتے ہیں یہ ملک اتنی پستی میں کیسے گر رہا ہے۔۔ اس کا سکتہ ختم کیوں نہیں ہوتا۔۔ یہ مل نہیں سکتا، یہ سوچ نہیں سکتا۔۔مگر یہ مر بھی نہیں رہا؟ کیوں؟ اس کا جواب شائد میرے پاس ہے۔

پاکستان کے ایگریکلچر شعبہ کے سائنس دان ڈاکٹر ریاض خان۔۔پچھلے دنوں وہ کینیڈا اپنی بیٹی کے پاس تشریف لائے۔ اس سے پہلے میں انہیں نہیں جانتی تھی (ہم پاکستانیوں کی یہی بدقسمتی ہے، اصل کو ہم جانتے نہیں، کھوٹ پر مرتے ہیں)۔۔مجھے ان کا فون آیا، وہ مسی سگا سے تھوڑا سا دور ہے ملٹن۔۔ وہاں ٹھہرے تھے اور جمعہ کی نماز پڑھنے ہمارے علاقے کی مسجد میں آئے، جو سٹوڈنٹ انہیں نماز پڑھنے لایا تھا، وہی انہیں میرے گھر ان کی خواہش پر لایا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ میرے کالم پڑھتے ہیں۔اور خوش ہیں اس بات پر کہ میں ان کا مشن آگے چلا رہی ہوں۔ کون سا مشن؟ پاکستان سے محبت کا، لوگوں کو آگاہی دینے کا اس سے بے پرواہ کہ آپ کو اس کا ایوارڈ آپ کا ملک کیا دے رہا ہے۔ جس سے آپ اتنا پیار کر رہے ہو بدلے میں وہ تو سنگدل محبوب

کی طرح آپ کو گھاس بھی نہیں ڈال رہا بلکہ وہاں سے آپ کو ناقدری، کچوکے، دکھ اور نا انصافیاں ہی ملی ہیں۔ میرا ڈاکٹر ریاض سے کیا مقابلہ ہم تو گھبرا کر ملک چھوڑ کر بھاگ آنے والوں میں سے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض جن کو سننے میں تھوڑی پرابلم ہو رہی تھی، جن کی آنکھیں بار بار بات کرتے ڈبڈبا رہی تھیں۔۔مگر جو مجھ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے۔ جو اس تھوڑی سی ملاقات میں مجھے شروع سے آخر تک اپنی زندگی بتا دینا چاہتے تھے۔ جو اس کرب میں مبتلا تھے کہ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں حکومتِ پاکستان نے ہمیشہ دھوکا، مکر اور فریب دیا۔ جو مجھے بتا رہے تھے کہ ان کی بارہ سے زیادہ ایگریکلچر پر کتابیں ہیں۔ جنہوں نے زراعت پر اتنی ریسرچ کی کہ انڈیا، امریکہ، برطانیہ سب جگہ انہیں لیکچرز کے لئے، تعریف و توصیف کے لئے بلایا جاتا ہے۔ جن کے زراعت کے اوپر کالمز اور ریسرچ پیپرز انٹرنیشنل لیول پر تو دھڑا دھڑ چھپ جاتے ہیں۔مگر ان کا ملک جب تک وہ جاب میں رہے انہیں دبانے پر ہی تلا رہا۔۔

ان کو اچھا عہدہ نہ مل جائے، ان کو زیادہ نام نہ مل جائے۔۔ان کی انتھک محنت سے کی گئی تحقیقات، ان پر کتابیں، مقالے۔۔سب کھڈے لائن لگانے کی کوشش کی جاتی۔۔ جب انہیں UNESCO اس بات کی آفر کرتا ہے کہ ہم آپ کی کتاب چھاپیں گے، تو انہیں کہا جاتا کہ نہیں تمھارے پر پہلا حق فیصل آباد یونیورسٹی کا ہے، پاکستان کا ہے سو ہم چھاپیں گے۔۔اور بعد میں یوں کہہ دیا جائے۔۔کہ نہیں یہ کتاب اشاعت کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔

جس شخص کو desert agriculture جیسی زراعت پر اچھوتی اور تحقیقی کتاب لکھنے پر پاکستان سے ایک ایوارڈ نہ ملا ہو اور جسے انڈیا سے شاباش مل رہی ہو۔ جسے کینیڈا امریکہ کی رہائش آفر ہو رہی ہو۔۔ جسے برطانیہ زراعت کا زبردست سائنسدان مانتی ہو۔۔جس نے بیجوں کی قسموں پر، پانی کے طریقوں پر اور نہ جانے کن کن مٹی کی چیزوں پر اپنے ہنر سے محنت سے اور اپنی لگن سے کام کیا ہو۔۔اور جس کو اپنا ملک کوئی نام نہ دے، کوئی پہچان نہ دے۔

جو میرے سامنے اپنی ناقدری کی بات تو کرتا جائے، مگر جس کے لبوں پر آج بھی ۔۔ جب کہ وہ کانوں سے صحیح سن نہیں پا رہا اور جس کے ہاتھ رعشہ سے ہلکے ہلکے کانپنا شروع ہو گئے ہوں ۔۔ وہ آج بھی مجھے بڑے عزم سے کہتا جائے ۔۔ روبی بیٹا! پاکستان کو میں کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ میرا کالم ڈاکٹر ریاض خان کی ساری خدمات کو قارئین کے سپرد کرنے کے لئے بہت چھوٹا ہے۔ میں نے انہیں اصرار کیا کہ اپنے تجربات ایک کتاب میں لکھیں، زراعت پر تو بہت لکھا، اب یہ باتیں، اتنی باتیں ۔۔ اتنے دکھ، اتنی ناقدری۔ یہ سب ایک کالم میں کیسے سمویا جا سکتا ہے؟۔ آپ کتاب لکھیں ۔۔ اردو میں نہیں لکھ سکتے تو میں آپ کے لئے لکھوں گی، مگر لوگوں کو آگاہی دے کر جائیں، مگر انہوں نے کہا، میں اب صرف عبادت کرتا ہوں، اور پاکستان کے لئے دعا کرتا ہوں اور اب جب انہوں نے اپنی حالیہ ای میل میں مجھے پاکستان کے ڈیمز، انڈس ٹریٹی اور انڈیا کے نئے خوفناک ارادوں کے بارے میں لکھا جس میں انہوں نے لکھا کہ چناب اور جہلم بھی اب خطرے میں ہیں ۔ انڈیا راوی، بیاس اور ستلج پر تو 52 کے قریب ڈیم باندھ چکا ہے اور اب ہمارے حکمران خاموشی سے باقی ماندہ پانی بھی اپنے ذاتی فائدوں کے لئے ان کے سپرد کر رہے ہیں تو میں ڈاکٹر صاحب کے پاکستان سے اس تعلق پر حیران رہ گئی۔ اور بے بسی سے میں تلملا کر رہ گئی کہ میں ان کے لئے، ان کے پاکستان سے اتنے بے لوث پیار کے لئے بدلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔

کوئی ایسے بھی محبت کرتا ہے؟

اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اس انسان کے منہ سے پاکستان کے لئے دعا نکلتی ہے، اس کا دماغ پاکستان کے لئے سوچتا ہے، اس کا دل پاکستان کی سلامتی کے لئے دھڑکتا ہے اور مجھے لگا اسی لئے پاکستان تباہ نہیں ہوا ۔۔ اور ایسے لوگ زندہ رہیں، پیدا ہوتے رہیں تو کبھی نہیں ہوگا ۔۔ کبھی نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے جب مجھے بتایا کہ انہوں نے 1945-1946 کے سٹوڈنٹ بیچ کے ساتھ قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ ہاتھ ملایا تھا ۔۔ تو قائد نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا

(اردو ترجمہ) نوجوان ! پاکستان بہت ترقی کرے گا میں تمہاری آنکھوں میں عزم دیکھ سکتا ہوں، پاکستان کو بہت آگے لے کر جانا اور کبھی ایسا کام نہ کرنا جس میں پاکستان کا مفاد نہ ہو۔ یہ بات سناتے ہوئے ڈاکٹر ریاض کی آواز کانپ رہی تھی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میرے سامنے وہ انسان بیٹھا تھا جس نے میرے قائد کا ہاتھ تھاما تھا۔ پاکستان کا مقصد اپنے کانوں سے سنا تھا، اور جس نے دوران ہجرت راہ میں نیزوں پر ٹنگے لوگ اور اجڑی عصمتیں دیکھی تھیں اور جو مجھے بڑے کرب سے سسک سسک کر بتا رہا تھا کہ ابھی بھی کچھ نہیں بدلا۔ اور میں نے بھیگی آنکھوں سے سوچا پاکستان سے اتنی محبت کرنے والوں کو جب پاکستان کی حکومت ٹھوکر پر ان سنا، ان کہا رکھے گی۔ جبھی تو یہ ملک کہیں کا نہیں رہا، جبھی تو ہم اخلاقی پستی کی حد کو پہنچ گئے ہیں۔ اور ہم پورے تباہ اس لئے نہیں ہو پا رہے کہ ایسے لوگ ابھی بھی وہاں سے مجھے ای میل لکھتے ہیں اور کہتے ہیں پاکستان کے پانی کو خطرہ ہے کوئی اسے بچا لے۔

جن کے دل پاکستان کیلئے نہ تو دھڑکنا بند کرتے ہیں اور نہ ان کے دل سے اس دھرتی کے لئے دعا نکلنا بند ہوتی ہے۔ اور جنہیں اس ملک کی فکر ایسے ہی کھائے جاتی ہے جیسے باپ کو اپنے بیٹے کی، ایسے لوگوں کے ہوتے ہوئے پاکستان کیسے صفحۂ ہستی سے مٹ سکتا ہے، کیسے دنیا کے نقشے سے غائب ہو سکتا ہے؟ مگر ایسے لوگوں کی ناقدری کر کے، ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھا کر، ان کی محبتوں کو نیلام کر کے۔ ترقی بھی کیسے کر سکتا ہے۔ سو یہ ملک نہ مرتا ہے اور نہ جیتا ہے۔ یہ کیسا الجھا ہے کہ اپنی الجھن میں الجھتا ہی جاتا ہے۔ اور ہم جو اس کے لئے تڑپتے ہیں، ایک انوکھے رشتے میں بندھتے جا رہے ہیں۔

میں ڈاکٹر ریاض خان کی کچھ نہیں لگتی مگر اب وہ ہر دعا میں مجھے یاد رکھتے ہیں۔ ان کی ای میلز میرے لئے دعاؤں سے بھری ہوتی ہیں۔ میری آنکھوں میں ان کے لئے آنسو بھر جاتے ہیں۔ ان کی بیگم میرے کالمز پڑھنے کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال سیکھتی ہیں۔ اور میں ان کو روز ای میل لکھنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ جب بھی وہ ای میل باکس کھولیں اپنی اس بیٹی کی ای میل اپنے سامنے

پائیں ۔ جسے انہوں نے جنم نہیں دیا مگر جسے وہ بہت پیار کرتے ہیں ۔ صرف اس لیے کہ وہ سوچتے ہیں کہ میں ملک کے ایسے سائنسدان کا مشن آگے چلا رہی ہے جس کی کسی نے قدر نہیں کی ۔ اور ان کا مشن ہے پاکستان کی بھلائی ۔ مگر میں سوچتی ہوں یہ صرف ان کا مجھ پر اعتماد اور پیار ہے ورنہ کیا یہ ایک چھوٹا سا کالم اتنے بڑے بڑے قد والی شخصیات کا کیا مقابلہ کرے گا ۔ ہم تو ایسے لوگوں کی قدموں کی خاک بھی نہیں ۔ خدا میرے ملک میں ایسے لوگوں کو سلامت رکھے کہ انہی کے صدقے میرا ملک اتنی تنزلی کے بعد بھی قائم ہے ۔

ڈاکٹر ریاض خان کی کتابوں کے نام جو حکومتی بے حسی کی نظر ہو رہی ہیں ۔

1 Agricultural Development Potential of Cholistan Desert

2 Feasibility of Extension of Irrigation System into Cholistan

3 Irrigated Agronomy

4 Overview of Balochistan Agriculture

5 Irrigated Agricultural Aspects of Six Basins of Balochistan

6 Review of Agricultural Research and Extension System of NWFP

7 Overview of NWFP Agriculture

8 Agriculture in Federally Adminstered Tribal Areas (FATA)

9 Agriculture in Azad Kasmir

10 Crop Management in Pakistan with Focus on Soil and Water

11 Retrospects of Pakistan,s Agriculture

12 Agriculture in Pakistan Challenges and Remwdies

☆☆☆

کوئی آپ کے خلوص سے کیوں کھیلے؟

کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیشہ صرف کوٹھوں تک محدود ہیں ۔؟ اور میں اس نوجوان کا سوال سن کر سن سی ہو گئی اور اس سے پہلے میں اس کا زرد چہرہ اور ویران آنکھوں سے حیران تھی، کیونکہ اس نوجوان کو میں نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے زندگی سے بھرپور اور خوشی سے دمکتے دیکھا تھا۔ وہ ہمارے گھر آج بھی اسی صوفے پر بیٹھا تھا جہاں وہ دو سال پہلے بیٹھا تھا، مگر اس وقت کے چہرے اور آج کے چہرے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ہمارا کئی سالوں سے کلائنٹ تھا، ٹیکس، ریفیوجی کیس اور پھر جب اس کا ریفیوجی کیس منظور ہو گیا اور اسے کینیڈا میں لینڈنگ پیپرز مل گئے تو اس نے اپنے آپ سے کئے گئے وعدے کے مطابق اپنی شادی کی، جب اس کا ریفیوجی کیس ہو رہا تھا وہ جب بھی ہمارے پاس آتا ایک ہی بات کرتا، کاغذوں کی فکر ختم ہوتے ہی شادی کروں گا۔ پہلے اپنی بیوی کو سپانسر کروں گا، پھر اپنی بیوہ ماں کو اور وہ مجھے ہر دفعہ کہتا، آپا گھر کتنی نعمت ہوتا ہے۔ میں تنگ آ گیا ہوں باہر کے کھانوں سے اور سڑکوں کی آوارہ گردی سے۔ اور تقریباً ڈیڑھ سال پہلے جب اس نے فون پر نکاح کیا، بیوی کو سپونسر کیا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ اور جب اس کا سپونسر شپ کا کیس ہو گیا، تو وہ ہمارے گھر مٹھائی لے کر آیا۔ اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح ہمارا شکریہ ادا کرے اور جب میرا چھوٹا بیٹا اسے سلام کرنے آیا تو مجھے آج بھی اس کے الفاظ یاد ہیں ۔۔۔۔ آپ جیسے محبت کرنیوالے میاں بیوی نے میرا کیس کیا ہے، اللہ کرے میرا گھر بھی آپ کے گھر کی طرح آباد ہو۔ اور کتنے پیارے بچے ہیں آپ کے۔ اور ہم نے ہنس کر اسے کہا انشا اللہ

بچوں سے تمہارا گھر بھر جائے گا، بیگم کو آنے دو۔
اور بیگم کے ذکر سے اس کے رخسار لال ہو گئے، اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ان دیکھی (صرف تصویر میں دیکھا تھا) بیگم کی تعریفیں کرنے لگ گیا۔۔۔آپا وہ بہت خوبصورت ہے، اور بہت پڑھی لکھی، پورا ایم اے کیا ہے، میں تو بی اے ہوں نہ مگر وہ بہت پڑھی لکھی ہے، جاب بھی کرتی ہے، مگر جب یہاں آئے گی تو میں نے جاب نہیں کروانی، میں اسے گھر بٹھا کر کھلاؤں گا۔۔مگر اگر وہ کرنا چاہے گی تو میں روکوں گا بھی نہیں۔بس میں اسے بہت خوش رکھوں گا۔
آپا مجھے خوش گھر بہت اچھے لگتے ہیں، جن میں کبھی کبھی جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔اور اس لمحے میں نے اسکی آنکھوں میں ان سب خوش گھروں کا تصور دیکھا جو وہ شروع سے دیکھتا آیا ہوگا، اسکے ماں باپ کا پیار بھرا گھر، اس کے شادی شدہ بہن بھائیوں کے گھر، اسکے دوستوں کے ہنستے مسکراتے گھر ۔۔اور وہ ان سب گھروں جیسا ایک پیار بھرا گھر چاہتا تھا۔کچھ کلائنٹس سے رشتہ کلائنٹ شپ سے آگے نکل جاتا ہے یہ کلائنٹ ان میں سے ایک ہے۔وہ ہم دونوں کا بہت احترام کرتا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے ہیں۔اور ڈیڑھ سال پہلے مجھے یاد ہے میں نے اس معصوم اور پرخلوص انسان کے لئے ایک پکے گھر کی دعا کی تھی۔
مگر آج وہ پیاری پیاری، بھولی بھالی باتیں کرنے والا نوجوان، جس کے زندگی سے لطف اندوز ہونے کے دن تھے، اور جس کی ڈیڑھ سال پہلے کھلائی گئی مٹھائی کا ذائقہ ابھی بھی منہ میں گھلا ہوا تھا ۔میرے سامنے بیٹھا سعادت حسن منٹو کے کسی تلخ افسانے جیسا جملہ بول رہا تھا۔۔کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیشہ صرف کوٹھوں تک محدود ہے؟ اور پھر اس نے نظریں زمین میں گاڑتے ہوئے، بہت ہی مدہم آواز میں پوچھا۔ہم شادی کے بعد جسے سپونسر کر کے بلاتے ہیں، اگر وہ ہمیں چھوڑ دے یا ہم سے طلاق لے لے تو کیا ہم اپنی سپونسر شپ کینسل کر سکتے ہیں۔اور ہمارا جواب نہیں میں تھا مگر ہمارا ابھی ایک سوال تھا کہ یہ پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟ اور اس کا جواب ایسا تھا جس پر میں بہت مہینوں سے قلم اٹھانے کا سوچ رہی تھی مگر تحریک اتنی زوردار نہ تھی، مگر اس نوجوان کے ٹوٹے دل اور

منتشر وجود نے مجھے ہلا دیا اور میں نے سوچا آج اس پر نہ لکھا گیا تو شائد کبھی نہ لکھا جائے ۔۔۔

اس نے نظریں زمین میں گاڑے گاڑے بتایا ۔۔ اس کی بیوی اس سے طلاق چاہتی ہے ۔۔ پھر وہ بتاتا گیا آپ کو تو پتہ ہے میں نے اسے خوش رکھنے کے کتنے خواب بنے تھے ۔۔ مگر اس نے خوش تو رہنا تھا مگر میرے ساتھ نہیں ۔۔ اس کا ایک لڑکے سے چکر تھا اور وہ امریکہ میں غیر قانونی رہ رہا ہے ، مجھ سے شادی کر کے اب وہ یہاں کا لیگل سٹیٹس لے چکی ہے اور اب وہ سال بعد اسے یہاں بلا لے گی ۔ وہ پڑھی لکھی ہے یہاں کے سب قاعدے آتے ہی پڑھ گئی ہے ۔ یہ سب اس نے مجھے نہیں بتایا ، وہ تو جس دن سے آئی ہے میرے ساتھ لڑتی رہتی ہے ، ایک دن ہم نے سکون کا نہیں گذارا ، میں ہنسوں تو برا ، نہ ہنسوں تو برا ، بولوں تو بھی جوتے مارتی ہے نہ بولوں تو بھی ۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ ایک عورت کو کیا چاہیئے ، ارد گرد جتنی خاندانی عورتیں دیکھتا تھا ، ان کے گھروں کی بنیادوں میں سمجھوتہ نظر آتا تھا ، مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ سمجھوتہ تو دور کی بات ، وہ باتیں بھی میرے سر منڈتی تھی جو مجھ میں سرے سے تھیں ہی نہیں ۔ آپا ایک بات میں جان گیا عورت گھر نہ بسانا چاہے تو کوئی طاقت اس سے ایسا نہیں کروا سکتی ۔ میں نے پوچھا تمھیں اس کے افیر کا کیسے پتہ ہے کہنے لگا پہلے دن سے پتہ چل گیا تھا ۔ کچھ اسکی حرکتوں سے اور کچھ ہمارے کسی مشترکہ جاننے والے نے بتایا ہے ۔۔ میں اس کو طلاق دے دوں گا ، مگر مجھے رہ رہ کر یہ چیز ستاتی ہے کہ اس نے مجھے استعمال کیا ، یہ دکھ ٹھکرائے جانے کے دکھ سے بھی بہت زیادہ ہے ۔ اور میں یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ کینیڈا کی امیگریشن کے لئے کیا کوئی لڑکی اپنے جسم کو بھی داؤ پر لگا سکتی ہے؟ کیا یہ شادی ہوتی ہے؟ کیا یہ بھی پیشہ نہیں بن گیا؟ ۔ میرا دل کرتا ہے اس کی امیگریشن کینسل کروا دوں ۔ اور میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا ، بلکہ تین سال تک وہ اس کی زمہ داری ہے کیونکہ اسنے اسے سپانسر کیا ہے ، اور یہ ایسا المیہ ہے کہ جسے آپ سپونسر کرتے ہو ، کینیڈا جیسے ملک کی رہائش دلواتے ہو ، وہی آپ کو چھکے سے پرے دھرتا ہے اور کھسک جاتا ہے اور آپ کچھ نہیں کر پاتے ۔

اس کیس کے بعد مجھے وہ سارے کیس یاد آنے لگ گئے جو پچھلے چند سالوں میں بہت زیادہ ہونے

لگ گئے ہیں۔۔اور جن میں 80% اب لڑکیاں ہیں۔ جو یہاں کے لڑکوں سے شادی کرتی ہیں اور پھر طلاق کا لفظ ان کی زبان کی نوک پر دھرا ہوتا ہے، طلاق لی اور اپنے اپنے راہ چل پڑیں۔

ایک معصوم تو ایسا تھا جو بیوی کو لینے ایئر پورٹ کھڑا رہا اور بیگم نے اسے موبائل پر فون کر کے اطلاع دی کہ گھر جاؤ میں نے جس کے ساتھ جانا تھا چلی گئی ہوں۔ اور ایک صاحب تو فون پر نکاح کر کے ,رخصتی کروانے پاکستان پہنچے، سسرال والے ٹال مٹول کرتے رہے، جب موصوف کو شک پڑنے لگا تو تھوڑی سی تحقیق کروائی تو پتہ چلا کہ لڑکی صاحبہ تو کینیڈا پہنچ بھی چکی ہیں۔ کچھ تو ہاتھ میں آئے بغیر ہی چکمہ دے جاتی ہیں (شائد ان میں اخلاص تو نہیں مگر کچھ شرافت باقی ہوتی ہے) اور کچھ کبھی سال اور کبھی دو، اس بات پر کس کی ضرورت کب ختم ہوتی ہے۔۔ اسی طرح لڑکے بھی ایسے ہی کرتے ہیں، کینیڈا کی لڑکی سے شادی کرتے ہیں، پورے پورے خاندان سیٹ کرتے ہیں، اسے طلاق پکڑاتے ہیں، اور اپنے خاندان کی پرانی منگیتر سے شادی کر کے ایک اچھا سا خاندان آباد کر لیتے ہیں۔

میں اس نوجوان کے سوال کے جواب میں کہ اب میں کیا کروں؟۔ وہ تو شائد اب کچھ نہیں کر سکتا، اس کے ساتھ تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ پاکستان سے مکاری اور جھوٹ کی جو تختی پڑھ کر بے ضمیر ے اور بے غیرت لوگ آتے ہیں۔ جنہوں نے شادی جیسے مقدس رشتے کو بھی اب شکوک کی سولی پر چڑھا دیا ہے۔ جس ملک میں لڑکیوں کی عزتیں سب سے قیمتی متاع گردانی جاتی تھیں، وہیں اب ماں باپ کی ملی بھگت سے لڑکیوں کے سودے انتہائی شائستہ طریقے سے طے پائے جاتے ہیں، تو ایسے میں یہاں کینیڈا کے رہنے والے لڑکے اور لڑکیوں کو ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔

اول : کوشش یہ ہونی چاہیے شادی کینیڈا میں ہی کریں، جب تک کہ آپ لڑکے یا لڑکی والوں کو بہت اچھی طرح سے نہ جانتے ہوں۔۔

دوم : اگر یہاں کے بچے پاکستان یا انڈیا میں شادی کر رہے ہیں تو جہیز یا حق مہر کے نام پر 25 سے 40 ہزار ڈالرز وصول کریں۔ مانا پیسے ایک پختہ گھر کی، مضبوط دیواروں کی گارنٹی نہیں

دے سکتے، مگر آپ کو اس کرب سے بچا سکتے ہیں کہ ہمیں استعمال کیا گیا۔۔ یا ہمارے جذبات سے کھلواڑ ہو گیا۔۔ یہاں کے پلنے والے، یہاں محنت کرنے والے بچے ذہنی لحاظ سے اور طرح کے ہوتے ہیں وہ بہت مخلص، بھولے اور محنت کش ہوتے ہیں۔ پاکستان میں غربت اور کرپشن اور بد حرامی، ان نشتروں نے لوگوں کو ننگا کر دیا ہے، یہ چبھتے ہیں اور ان کی چبھن سے لوگ بدن ڈھانپنا بھول گئے ہیں، وہ صرف ان کا شکار ہیں۔

پاکیزگی، طہارت، محبت، خلوص یہ سب نفسا نفسی اور خود غرضی چوس گئی ہے۔ میں نے اس معصوم انسان کو دیکھا جس کی آنکھیں اس کے ٹوٹے خوابوں سے لہولہان تھیں، جس کے دل میں ایک گھر بنانے کا خواب تھا، بچوں کی کلکاریاں اسے لبھاتی تھیں، گھر کی روٹی کی حسرت اسے بلاتی تھی، اپنے بیوی بچوں اور اپنی ماں کے ساتھ وہ ایک بھرپور، قہقہوں، اور کبھی جھگڑوں سے بھرے گھر کے خواب دیکھتا تھا۔۔ ان خوابوں کی کوئی قیمت نہیں، وہ انمول تھے، مگر ان کی قیمت لگا دی گئی۔ اس کے خلوص اور اس کی محبت کا کوئی جواب نہیں تھا، مگر اس پر سوال کھڑے کر دیے گئے

میں نے اس نوجوان کے لئے بہت درد محسوس کیا۔۔۔ ڈیڑھ سال پہلے میرے دل سے اس کے آباد گھر کے لئے دعا نکلی تھی۔۔ مگر وہ کیسی بے اثر دعا تھی۔ اور وہ لڑکی جو اسے برباد کرنے جا رہی ہے وہ کیسی طاقتور ہے۔ کینیڈا کی امیگریشن۔۔۔ کیا اتنی ہی دنیا کی بلند چیز ہے کہ اس کے آگے انسانوں کی محبتیں اور جذبات بے معنی اور بے وقعت ہیں۔ اور ایک اس امیگریشن کے لئے قدموں میں روندے جاتے ہیں۔۔۔ روندے جاتے ہیں۔ یہاں کا سپونسر شپ کا قانون نرم ہے، مگر یہاں رہنے والوں کو اپنے خلوص کی خود قدر کر کے اس کی حفاظت کرنا ہو گی اور کسی مطلبی، خود غرض انسان کو اتنی اجازت نہ ہو کہ وہ کسی کے خلوص کا یوں مذاق بنا کر اپنی راہ پکڑ سکے۔ ایسے فریبی، دغا بازوں کا انجام گو خدا کے ہاں بھی بہت برا ہو گا، مگر اپنے تئیں یہاں کے نوجوانوں کو بھی تر نوالہ نہیں بننا چاہیئے۔ ورنہ کبھی کوئی تو کبھی کوئی انہیں نگلتا جائے گا۔

☆☆☆

یہ نہ کرنا بچوں۔۔وہ بھی نہ کرنا۔۔ورنہ!

یہاں کینیڈا میں والدین بہت تذبذب کا شکار ہوتے ہیں، بچوں کو کیا کروائیں، کیا نہ کروائیں ۔اسلام، پاکستان بہت کچھ ہوتا ہے جو انہیں سکھانا ہوتا ہے، پڑھانا ہوتا ہے۔نماز یاد کروانی سورتیں پڑھانی، قران شریف ترجمے کے ساتھ اور میرے جیسے چند ایک سر پھرے ماں باپ کے ذہن میں اردو کا تصور بھی آتا جاتا رہتا ہے۔کاش ہمارے بچے اردو بولیں، اردو لکھیں اور اردو کو جئیں۔مگر سوچتے رہتے ہیں۔کبھی کچھ کرنے لگتے ہیں، کبھی اس سسٹم میں کہیں ٹھہر جاتے ہیں۔۔۔سوچنے لگتے ہیں مذہب کو یہاں سے متصادم نہ کروائیں، بچوں پر زبانوں کا بوجھ نہ لادیں، بچوں پر تہذیبوں کے فرق کا احساس نہ مسلط کریں۔۔۔بچوں کو ہلکا رکھیں۔۔بچوں کو یہاں کے سسٹم میں بہت انوکھا سا، عجوبہ بنا کر کھڑا نہ کردیں۔

ایسے حالات میں ذہنی کشمکش میں بہت سنبھل کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے، بچوں کا معاملہ ہے، لے سانس بھی آہستہ۔یہ بچے بہت نازک ہوتے ہیں، ان کے ذہن کچے کاغذ کی طرح ہوتے ہیں، ان کی نفسیات بہت نازک موڑ پر کھڑی ہوتی ہے۔بہت محتاط ہو کر چلنے کی ضرورت ہے۔مگر ہوتا کیا ہے، ہم اپنے اپنے مذہبی، رسمی، ثقافتی اور ملکی تفریقوں کا، تضادوں کا اور اس کے نتیجے میں پیدا

ہونے والے ذہنی انتشاروں کا بوجھ ان معصوموں کے کندھوں پر، دلوں پر اور دماغوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ہم اپنے آپ کو اچھا اور نیک ماں باپ ثابت کرنے کے لئے بچوں کے احساسات کو بغیر سمجھے ان پر اخلاقیات کا اور مذہب کا اتنا بوجھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اندر ہی اندر کہیں تڑکنے سے لگتے ہیں اور باہر سے ہمیں لگتا ہے کہ آئینہ سلامت ہے۔

گناہ اور ثواب کے خود ساختہ معیاروں پر انہیں پرکھنے ڈال دیتے ہیں، وہ اچھائی برائی، گناہ ثواب میں اپنے آپ کو تولتے رہتے ہیں اور تعلیم سے دور ہوا شروع ہو جاتے ہیں ۔ہم نے جو خود گناہ کیے ہوتے ہیں اس کی توبہ کا دروازہ بھی معصوم بچوں کو بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔انہیں ڈراتے ہیں، اس رب کی ذات سے ڈراتے رہتے ہیں جو بہت رحیم ہے، مگر ہم بچوں پر چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا دروازہ بند کرتے ہیں اور انہیں یہ اچھی طرح سمجھاتے ہیں کہ ایسا نہ کرنا ورنہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، ویسا نہ کرنا ورنہ اللہ تعالیٰ بہت ماریں گے ۔اور بچے خدا کے نہ نظر آنے والے ڈنڈے سے ڈرتے رہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں خدا تو اپنے بندوں کو بہت پیار کرتا ہے اور اسکی ذات بہت رحم اور مہربانی کرنے والی ہے ۔اور اس کی رحمتوں کا ہم ہر وقت بھی شکر کرتے جائیں تو وہ کم ہے۔

یہاں پر haloween اک رسم سی پڑی ہوئی ہے, اکتوبر کی رات بچے گھروں سے نکلتے ہیں ،اپنے اپنے کاسٹیوم پہنتے ہیں، کوئی سپائیڈر مین، کوئی کنگ، کوئی کوئین، کوئی شہزادی، کوئی ڈاکو، کوئی ڈاکٹر کوئی سپاہی کوئی مشہور کارٹون کریکٹر۔۔ سب بچے بہت جوش سے اس میں حصہ لیتے ہیں ۔صبح سکول میں بھی پارٹیز ہوتی ہیں سب بچے ایک قسم کا فینسی ڈریس شو مناتے ہیں ۔۔رات کو جب گھر گھر جا کر بیل دیتے ہیں تو ہر گھر سے ایک ہنستا مسکراتا چہرہ نکلتا ہے، بچے با آواز بلند کہتے ہیں trick or treat? اور وہ چہرہ اسی مسکراہٹ کے سات بچوں کے ہاتھوں میں پکڑے تھیلے کو ٹافیوں سے یا کسی بھی ٹریٹ سے بھر دیتا ہے ۔۔اور بچے شکریہ کرکے اگلے گھر کی بیل بجانے دوڑ پڑتے ہیں اور ان کے چہروں پر ایک نامعلوم ٹریٹ پانے کا تجسس ہوتا ہے، جوش ہوتا ہے اور بچے

بھاگتے جاتے ہیں،، گھر گھر سے اپنے لئے ٹریٹس اکٹھی کرتے ہیں۔ اور وہ بچے کتنے خوش ہوتے ہیں۔۔ کوئی مجھے کہے ہم تمھیں ایک ملین ڈالر دیتے ہیں اور بچوں کو ذرا مسکراہٹ تو خرید دو، میرا خیال ہے میں اس جیسی خوشی ان بچوں کو کسی قیمت پر کسی بھی بازار سے خرید کر نہیں دے سکتی۔۔ میں سارے بازار کی ٹافیاں بھی انہیں لے دوں تو وہ اس خوشی کا اک حصہ بھی نہیں پا سکتے جو انہیں اس رات، haloween کی رات اس ساری بھاگ دوڑ سے ملتی ہے۔ اس سے پہلے کی رات جسے ہیلووین کی چاند رات کہا جا سکتا ہے بچے مارے جوش کے سو نہیں سکتے۔ میں اس بات میں نہیں جانا چاہتی کہ اس ہلووین کا پس منظر کیا ہے۔ مذہبی ہے یا نہیں، توہماتی ہے یا نہیں۔۔ میں تو اس قدر جانتی ہوں کہ یہ بچوں کے خوش ہونے کی رسم سی لگتی ہے۔ بچوں کی ایک بے ضرر سی تفریح۔۔۔ مگر اس دفعہ میں نے بہت لوگوں سے سنا۔۔ ہم نے آج بچوں کو سکول نہیں بھیجا۔۔۔ ہم نے انہیں کوئی کاسٹیوم نہیں دلوایا۔ ہم نے انہیں رات کو باہر نہیں جانے دیا۔۔۔ ہم بچوں کو اس لعنت سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اسے نہیں مناتے۔۔۔ اور جو منا رہا ہے اس پر حقارت کی ایک نظر اور دائرہ اسلام سے باہر کرنے جیسی نظر۔۔۔۔ میں نہیں جانتی میں درست ہوں یا غلط۔ بچوں کو خوشیوں دینے میں میں کچھ ذیادہ ہی متعصب ہوں یا نہیں۔۔ بچوں کی مسکراہٹ اور ان کی خوشیوں کے لئے میں کچھ ذیادہ ہی کمینی اور خودغرض ہوں کہ نہیں۔۔۔ مگر میں اسی جگہ کھڑی ہو کر، کینیڈا کے انہی گلی کوچوں میں چلتے پھرتے بالغ النظر، عقل مند مسلمانوں سے چند سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔۔۔ ہو سکتا ہے میں آخرت کے لئے کچھ نہیں کما رہی، ہو سکتا ہے میں سرے سے غلط ہوں۔۔ ہو سکتا ہے میں بہت بڑا گناہ کما رہی ہوں۔ مگر میں پھر بھی پوچھنا چاہوں گی:

میں پوچھنا چاہوں گی۔۔ جب مسلمان ایک ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں انشورنس میری ہے، مگر میری والدہ جو حج پر جا رہی ہیں، مگر اس کا نام انشورنس میں نہیں اور میری والدہ کی دوائیاں میرے نام پر لکھ دیں تاکہ ہم مفت دوائیں لے سکیں۔۔۔ کیا یہ اسلام ہے؟

دوسرا سوال مسلمان یہاں آتے ہیں، انٹری کرواتے ہیں۔۔ بچوں کا چائلڈ ویلفیر اپلائی کرتے

ہیں اور واپس پاکستان یا مڈل ایسٹ چلے جاتے ہیں۔۔وہ یہاں نہیں ہیں،ان کے بچے یہاں نہیں ہیں مگر وہ حکومت سے بچوں کے لئے پیسے لیتے جاتے ہیں۔کیا ایسا اسلام سکھا سکتا ہے؟

ایک اور سوال P.R CARD ضائع نہ ہو،ریذیڈینسی کی شرط پوری ہو جائے، کینیڈا سے باہر ہوتے ہوئے بھی ٹیکس ریٹرن ادھر جمع کرواتے جاتے ہیں۔۔۔اس کے بارے اسلام کا کیا حکم ہے؟امیگریشن کے لئے پیپر میرج کرنا۔۔۔ چاہے کوئی ہندو ہے یا عیسائی،بھائی ہے یا بہن ۔۔ریفیوجی میں شیعہ،سنی،اور سب فرقے گھسیٹنا۔جو نہیں ہیں وہ کیس میں دکھانا اور جو اصلیت ہے اسے چھپانا۔۔۔؟

کم donation دے کر زیادہ کی رسید لے لیتے ہیں اور پھر ٹیکس ریٹرن میں حکومت سے اس سے بھی زیادہ رقم وصول کر لیتے ہیں۔۔اور یہ مسلمان ہیں؟

اس طرح کی اور بہت سی کہانیاں اردگرد پھیلی ہوئی ہیں۔اور امیگریشن میں لاتعداد جھوٹ۔۔۔۔ بڑوں کے ان گناہوں کو،جہاں ہمیں معاشی فائدہ ہوتا ہے،ہم اسلام کی جانب سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔دل میں کہیں نہ کہیں اسے justify کر لیتے ہیں مگر جہاں بچوں کی یہ خوشیاں ہیں، جن میں کوئی عقیدہ نہیں،کچھ مکر نہیں کچھ جھوٹ نہیں،کچھ دھوکہ نہیں وہاں ہم پتھر دل کے ہو جاتے ہیں۔اور بچوں کو حکم صادر کرتے ہیں کہ یہ شیطان کا کھیل ہے اس سے بچو۔۔ورنہ اللہ ناراض ہو جائیگا۔کینیڈا جیسے ملک میں آ کر ہم انہیں غیر ضروری ٹینشن دینے کی کوشش کرتے ہیں۔خود تو غیر محسوس طریقے سے حرام کھاتے ہیں مگر ان پر ننھی ننھی خوشیاں حرام کر دیتے ہیں۔۔جس سے کسی کا کچھ بگڑ نہیں رہا،جس سے کچھ حرام منہ میں جا نہیں رہا۔۔۔مگر نہیں اس سے ہمارا اسلام فورا خطرے میں پڑ جاتا ہے۔اور پاکستان کے ٹی وی چینل اسی دن چیخ چیخ کر کہ رہے ہیں happy halloween۔میں نہیں جانتی۔۔مگر میں پوچھتی ہوں کینیڈا جیسے ملک میں آ کر لڑکوں کو یہ بتانا کہ ٹیچر اگر فی میل ہے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرنی،لڑکیوں سے بات نہیں کرنی۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔۔۔یہ نہیں کرنا وہ نہیں کرنا۔۔والدین کے اپنے لئے معیارات فرق

اور بچوں کے لئے فرق۔ مجھے تو یہ پتہ ہے میرے پیارے رسول پاک اس بات کی کبھی کسی کو نصیحت نہیں کرتے تھے جو وہ خود نہیں کرتے تھے۔۔ مگر ہمارا دو رخہ پن ہمیں مروائے جا رہا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بچوں کو اسلامی طور طریقے سکھا رہے ہیں؟ اور اس وقت سے ڈریں جب یہ آج کے معصوم بچے کل آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں گے اور پوچھیں گے۔۔۔ اماں ابا اس خدا نے آج تک آپ کو ڈنڈے نہیں مارے تو ہمیں کیوں مارے گا؟۔

☆☆☆

کیا محبت کو نو کہا جا سکتا ہے؟ کیا محبت رسم ہے؟

زندگی کے لئے ایک امید ضروری ہے۔ میں اکثر اس بات پر سوچتی ہوں کیا کوئی اس پوری کائنات میں ایک بھی ایسا جاندار ہے جو کسی امید کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ خوراک، پانی کے ساتھ خواب زندگی کی ضرورت ہیں۔ ہم شائد کھائے پیئے بغیر کچھ دن زندہ رہ سکتے ہوں مگر خوابوں کے بغیر زندگی کا تصور نہیں۔ کم از کم میرے نزدیک نہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک خواب ٹوٹتا ہے تو اسکی جگہ فوراً دوسرا آ کر جڑ جاتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے اور جڑے ہوئے خوابوں کی ایک لمبی زنجیر سی بن جاتی ہے۔ اور اس زنجیر کا کمال یہ ہے کہ ٹوٹی ہوئی امیدیں، بکھرے ہوئے خواب بھی اس میں سمو جاتے ہیں۔ جو لوگ اس زنجیر کو مضبوطی سے بنا لیتے ہیں وہ زندہ، جاندار لوگ ہوتے ہیں اور جن کی زنجیر کٹی پھٹی ہوتی ہے وہ موت کی طرف مائل، اور کچھ ادھ موئے سے زندگی گزارتے جاتے ہیں۔ مگر یہ بات طے ہے کہ جینے کو، کوئی نہ کوئی سہارا ملتا رہتا ہے۔ کہیں نہ کہیں امید کی کرنیں روشن رہتی ہیں۔ مکمل تاریکی تو موت ہے۔ خدا کی ذات موت سے پہلے موت آنے نہیں دیتی، کچھ نہ کچھ جادو چلتے رہتے ہیں۔۔۔ کچھ نہ کچھ معجزے ہوتے رہتے ہیں۔

محبت زندگی میں سب سے بڑا سہارا اور سب سے بڑی روشنی ہے۔ محبت کرنے والے محبت کے

جاتے ہیں۔کبھی زندوں سے، کبھی مردوں سے اور کبھی سایوں سے۔ میں ایک بلاگ دیکھ رہی تھی
-- say no to valentine day۔ میں ویلنٹائن ڈے کی تاریخ میں نہیں جاتی، میں
اپنی سمجھ کے مطابق، آج کی

رسم کو دیکھ کر اس پر بات کرتی ہوں۔ پہلے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا محبت رسم ہے؟ نہیں۔۔ محبت
ایک عقیدہ ہے، ایک جذبہ، زندگی کی ایک امید۔۔تو کیا اس کو NO کہا جا سکتا ہے۔اگر جذبوں
کو، روحوں کو، اور دلوں کو جسم سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے تو اسے بھی نو کہا جا سکتا ہے۔اور اگر نہیں کیا
جا سکتا تو پھر اسے روکا کیسے جا سکتا ہے۔

محبت کا شعور انسان کو بچپن سے ہی مل جاتا ہے۔ جب زندگی کے دوسرے سبق پڑھتے ہیں تو ماں
باپ کی آغوش ہمیں محبت کا ایسا سبق دے رہی ہوتی ہے کہ اسے دل و دماغ سے نکالنا کسی انسانی
بس کی بات نہیں۔کوئی عفریت ہی اس ماں باپ کے دیے تحفے کو مٹانے کی کوشش کر سکتی ہے۔میں
نے جس دن ہوش و ہواس میں اپنے باپ کو دیکھا، میں نے اپنے آپ کو انکی محبت میں گرفتار پایا۔
انکی پریشانی میں اپنا دل کٹتے اور ان کی خوشی میں دل کو قلابازیاں کھاتے دیکھا۔پھر میں نے ماں
اور بیٹے کی محبت دیکھی، ماں کی زندگی کا محور بیٹے کی خوشی دیکھی اپنے بیس ماہ کے بیٹے کے ہاتھوں کو
جب اپنے چہرے پر محسوس کیا، اور جب دیکھا کہ پیدا ہوتے ہی وہ نرس کی گود میں تو رو رہا ہے مگر
میرے اوپر لیٹتے ہی سکون سے مسکرا رہا ہے، پھر اپنے سات سال کے عبداللہ کو میرے ٹی وی انٹرویو
کو دیکھتے ہوئے آنکھوں میں خوشی اور پیار آنسوؤں کو آتے دیکھا تو کائناتی محبت کی اس اتھاہ
گہرائی کو سمجھا۔۔اور سوچا۔۔کیا محبت کو۔۔نو کہا جا سکتا ہے؟ کیا محبت رسم ہے؟

اگر کوئی یہ کہے کہ ایک دن محبت کا منانے پر اعتراض ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔۔محبت تو سال
کے 366 دن منانے کی چیز ہے۔انسانوں سے پرے جانور بھی ایک دنیا آباد رکھتے ہیں، میری
بھانجی کے پاس ایک بلی ہے، وہ اس کی محبت میں گرفتار ہے، بلی اس کے قدموں کی چاپ پہچانتی
ہے، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایک روح کے رشتے میں بندھی ہوئی ہیں۔ کیا ایسی محبتوں کو

۔۔نو۔کہا جا سکتا ہے؟میری سارہ میری بھانجی اس کا دل میرے اندر دھڑکتا ہے۔محبت روح کا تعلق ہے۔اگر اسے جسموں کی بھوک کے ساتھ خلط ملط کر کے کوئی فیصلہ کرتا ہے تو وہ ایک الگ کہانی ہے۔مگر محبت کی جان اس کی روح میں ہے۔۔جسم میں نہیں۔محبت روح ہے جسم نہیں۔۔

جب میرے سامنے بیٹھے آدمی نے ایک دم اپنی جیب سے دو سونے کی ٹکریاں نکالیں، اور میرے سامنے رکھ دیں اور کہا، یہ میں نے اس عورت کے لئے سالوں سنبھال کر رکھی تھیں جسے میں نے بہت چاہا ہے۔سالوں چاہا ہے،جس کی تصویر کو میں نے بٹوے میں رکھ کر بارہا گیت گائے ہیں۔ مگر اب وہ چلی گئی ہے۔میرے ہاتھوں پر سونے کی ان بھاری بھاری ٹکریوں کی جگہ یکدم آگ سی اگ آئی ، میں نے گھبرا کر انہیں میز پر پھینک دیا۔میں نے سمجھا شائد وہ عورت مر گئی ہے۔مگر وہ عورت تھی ہی نہیں ۔۔وہ عورت ایک خیال تھا۔ایک تصور، ایک گیت ، جو وہ برسوں گاتا رہا۔اور اس کے بٹوے میں تصویر کی جگہ خالی ، وہ انسان اپنے تصور کی کھوج میں اتنا بھٹکا، اتنا بھٹکا کہ اس کے چہرے پر صدیوں کی گرد اٹی ہوئی تھی۔گردن پر ناہموار جھریوں کا جال تھا، اور ان سب میں ایک امید اسے اتنے سال سے زندہ رکھے ہوئے تھی کہ اس کی روح کا ساتھ کہیں ہے،وہ اس کے لئے دو سونے کی ڈلیاں اور گھر میں ایک کمبل رکھے پھرتا رہا۔اس سفر نے اسے کمزور کر دیا۔۔اتنا کہ پھر ایک دن اس کی ہمت ٹوٹ گئی، امید ٹوٹ گئی۔اور اس سے پہلے جب بھی وہ اپنے کام سے ملتا، تو ایک رنگ، ایک امید اس کے چہرے پر رہتی تھی، مگر اس دن جب میری ہتھیلی پر سونے کی ڈلیاں تھی، اس نے اپنی امید کے ٹوٹنے کا اعلان کیا، اور اس کی کمر جھکی ہوئی تھی، اور اس کی آنکھوں میں موت کی زردی تھی ۔اس نے مجھے بتایا کہ برے سے برے حالات میں بھی اس نے ان ڈلیوں کو بیچنے کا نہیں سوچا، مگر آج وہ محبت کی موت کے بعد اعلان کر رہا تھا۔۔کہ اب وہ پاکستان جا کر ان کو بیچ دے گا۔اور اسطرح امید کی آخری کرن کو بھی نہیں بچائے گا۔۔محبت میں نا امیدی اور امید کی موت۔۔اس کے بعد اس مسافر کی آنکھوں میں مجھے زندگی نظر نہیں آئی۔کہاں جا کر امید ٹوٹتی ہے اور کیوں ٹوٹتی ہے۔۔؟اس کے بعد میں یہی سوچتی رہی۔انسانوں سے محبت ہوتی ہے،

جانوروں سے بھی اور سایوں سے بھی لوگ محبت کرتے جاتے ہیں، اور یہ محبت امید پیدا کرتی ہے، زندگی دیتی ہے۔ اور جس دن یہ محبت ٹوٹتی ہے تو پھر زندگی میں امید کا سایہ ڈھلکنے لگتا ہے۔ امید کے خاتمے کے ساتھ ساتھ زندہ لوگ مردہ بننے شروع ہو جاتے ہیں۔

محبت دینا سکھاتی ہے، محبت اپنا آپ قربان کرنا سکھاتی ہے، محبت قربانی سکھاتی ہے، محبت معاف کرنا سکھاتی ہے، محبت معافی مانگنا سکھاتی ہے۔ محبت گردن جھکا کر بہت بڑے بڑے کام کرواتی ہے۔ محبت چھوٹے چھوٹے لوگوں کو بہت بڑا بنا دیتی ہے۔ محبت مانگنا نہیں، دینا ہے۔ محبت فقیر کے کاسے میں پڑا سب سے بڑا سکہ ہے۔ قدرت کا سب سے بڑا انعام۔ اور اس کائنات کا سب سے بڑا حسن۔ نہ یہ پھول حسین ہیں، نہ یہ بادل، نہ گھٹائیں، نہ ندیاں، نہ نشیلی آنکھیں اور نہ رسیلے ہونٹ۔۔ سب محبت کا کرشمہ ہے۔ جس دل میں محبت پھوٹتی ہے۔ وہ اس کائنات میں بہنے والے کسی بھی گندے نالے کو قدرت کی حسین ترین قدرتی آبشار بنا دے گا۔ اس کے برعکس نفرت چہروں کو بگاڑتی، رنگوں کو برباد کرتی، اور دلوں کو اجاڑتی ایک فاحشہ ہے۔ نفرت زدہ آنکھیں نہ حسن دیکھتی ہیں اور نہ ان میں حسن باقی رہتا ہے۔ نفرت حسد کو جنم دے کر اس کائنات میں مزید بدصورتی اور تنگ دلی کو فروغ دیتی ہے۔ دلوں میں کینہ اور بغض۔۔ آنکھوں میں جالے اور کالے سائے۔۔ نفرت محبت کے مرنے پر جشن مناتی ہے، اور امید کی قبر میں اسے اتار کر پہروں محو رقص رہتی ہے۔

ویلنٹائن ڈے کو آپ no کہہ دیں۔۔ مگر سوچیے ان نظر بندیوں میں، ان پہروں میں اور ایسی قیود میں کیا انعام پڑا ہے۔ کیا فائدہ ہے اور کیا قلبی خوشی؟ محبتیں منانے سے، بانٹنے سے نفرتوں کو کم کرنے سے، نہ تو ہمارے اسلام کو خطرہ ہے اور نہ یہ خوف کہ ہم کفر کے دائرے میں داخل ہو جائیں گے۔ کفرانہ کاموں کی ایک اور لمبی لسٹ ہے جو ہم کرتے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں اس سے ہماری مسلمانی کو یا پاکستانیت کو خطرہ نہیں۔۔ اور حقیقت میں وہیں پر ہم غلط ہوتے ہیں۔ اپنی منافقت، حسد، جھوٹ، دھوکے بازی، ذاتی مفاد، شرک (ایک سے زیادہ خداؤں کو سجدہ کرنا ہمارا معمول بن گیا ہے، ذرا غور تو کریں)، بدحرامی اور غیبت سے ہم چھٹکارہ پالیں تو ہمیں یہ ویلنٹائن ڈے کافر

نہیں بنا سکے گا۔

اگر ہر طرف یہی آہ و بکا رہی گی ۔۔ انہی باتوں پر ہم وقت برباد کرتے رہیں گے تو امید ۔۔ جو ہر جاندار کو خدا کا تحفہ ہے، ہم سے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں پر خوابوں والی سونے کی ڈلیوں رکھے مر جائیں گے۔ اور مردہ جسموں کا قبرستان تو ہوتا ہی ہے، مردہ روحوں اور دلوں کا قبرستان بھی دلوں میں کھڑا ہو جائے گا۔ امید سے جڑی محبت کو ۔۔ نہیں ۔۔ مت کہیے ۔ چلنے دیں ۔ زندہ رہنے کو کچھ تو لوگوں کے پاس رہنے دیجیے۔ اخلاقیات کی کتاب میں کرنے کو ابھی اور بہت کچھ ہے، جو ضروری بھی ہے اور بہتر بھی۔

☆☆☆

ایک رسمِ جنازہ اور ایک وصیت

دیکھو تو دنیا میں کیا کمایا میں نے؟ انسان کیسا بھی ہو، چھوٹا، بڑا، گورا کالا۔ اس کی حاجتیں، اسکا آغاز اور انجام ایک سا ہی ہوتا ہے تو یہ فرق کیوں؟ یہ تفرقے کیسے؟ یہ جماعتیں، گروہ بندیاں، فرقے، نسلی امتیاز۔۔۔ یہ سب کیوں؟ ماں کے پیٹ سے جنم لے کر زمین کی گود میں اترنا۔۔کیا یہی انسان نہیں؟ کیا انسان یہیں سے شروع ہو کر یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔۔بچپن سے مائیکل جیکسن کا نام یوں سنتے آئے ہیں جیسے اپنے کسی ہمسائے کا نام ہو۔۔کبھی لگتا ہی نہیں تھا کہ ہم اس شخص کو نہیں جانتے۔ اس کے کتنے گانے سنے، یہ بھی پتہ نہیں۔۔ بہت عرصے تک beat it کو peeeray peeray گاتے رہے مگر کبھی لگا ہی نہیں کہ غلط گا رہے ہیں۔ میں نے کسی سنگر کو شہرت کی ان بلندیوں کو چھوتے نہیں دیکھا۔۔صحیح معنوں میں بچے بچے کی زبان پر اس کا نام تھا۔ اور بعد میں ایک بچے کی وجہ سے اس کا نام بڑوں بڑوں کی زبان پر بھی آ گیا مائکل جیکسن کا childhood کا گانا اور ویڈیو۔۔ جب دیکھو تو اس کی معصومیت اس کی آنکھوں سے جھلکتی ہے اور دل خود بخود یہ یقین لے آتا ہے کہ یہ شخص کسی کے ساتھ غلط نہیں کر سکتا۔ مائیکل جیکسن کے وڈیو اور اس کی گائیکی بے مثال اور لاجواب ہے۔۔

مائیکل جیکسن جیسا رقص کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے تو اس کی نرس کے مطابق اس کا جسم درد کرتا رہتا تھا۔ اور لوگ کہتے ہیں نشے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کی نرس کا بیان تھا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکتا تھا۔ رقص سے جسم میں درد اور بچے والے الزام سے اس کی روح زخمی ہو گئی

۔۔سلیپنگ پلز اس کا سہارا۔۔اور درد اس کا دوست تھی۔

بہت عرصے پہلے میں مائکل جیکسن کا ایک بیان پڑھ رہی تھی جس میں اس نے ایک رپوٹر کو کہا تھا کہ تمھارے منہ سے نکلی ہر بات پر لوگ یقین کر لیں گے اگر تم کہو گے مائیکل جیکسن ایک غیر زمینی مخلوق ہے تو بھی۔مگر میرا یقین کوئی نہیں کرے گا۔اس کے ایک دوست کا کہنا تھا کہ مائیکل جیکسن بچے سے زیادتی والے کیس کی ٹرائل سے اتنا بے حال اور دل گرفتہ ہوتا تھا کہ اسے سمبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔مائیکل جیکسن نے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا کہ میڈیا کے متعصب رویے کی وجہ سے میں بہت پریشانی کا شکار رہتا ہوں۔وہ شخص جس پر بچپن نہیں آیا۔۔جو سیدھا ماں کی گود سے نکلا اور دنیا کے میلے میں گم ہو گیا۔۔

اس کو تنہائی سے بیٹھ کر اپنے لئے سوچنے کا کب وقت ملا۔زندگی کے شروع کے دس سال جس میں وہ اپنے باپ کے ظلم کا نشانہ بنتا رہا۔۔جس میں ایک بچے کو باپ کا تحفظ ملتا ہے اسے باپ کی گالیاں، تضحیک، اور مار ملی۔ایک ٹی وی انٹرویو میں اس نے باپ کی بچپن کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے، روتے روتے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔اور اس بات کا اقرار مائیکل کے باپ نے بعد میں خود بھی کیا۔جس کے نو بچے تھے اور مائیکل ساتویں نمبر پر تھا مائیکل نے کہا میرے باپ کی سختی اور ٹریننگ نے مجھے شائد آج اس مقام تک پہنچایا ہے۔

ٹھکرائے ہوئے بچے کے دل سے کیا آہ نکلتی ہو گی کہ خدا اس نے اسے اتنی کم عمری میں اتنی شہرت، اتنی دولت عنایت کی کہ وہ دنیا کے اس میدان میں بجے سب ریکارڈ توڑتا چلا گیا کہیں گینز بک آف ریکارڈز میں جگہ بنائی اور کہیں کنسرٹ میں سب سے زیادہ لوگوں کا اجتماع اکٹھا کرنے کا ریکارڈ بنایا اور کہیں ان سنگرز کی فہرست میں سب سے اونچا جا کھڑا ہوا جن کے سب سے زیادہ میوزک البم فروخت ہوتے ہیں۔اس کی جلد کی بیماری اس کا فیشن بن گئی۔۔اس کا کالا رنگ پہلے ہلکا ہوا اور پھر پیلا ہونے لگا۔۔کالے رنگ سے، موٹے ناک سے نجات حاصل کرتے کرتے وہ نہ جانے کون سی دنیا میں گم ہوتا گیا۔۔اپنے اصل سے شرمندہ، نقلی چہرے لگاتے لگاتے وہ اتنی

جلدی بہت دور کی کسی بھیڑ میں کھو گیا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے اس کی نرس بتاتی ہے وہ سکون کی نیند کے لئے ترستا تھا۔۔ وہ پوری پوری رات سو نہیں پاتا تھا وہ سونا چاہتا تھا، سو نہیں سکتا تھا۔۔ وہ جینا چاہتا تھا اور زیادہ جی نہیں سکا۔ 1.6 million لوگ اس کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لئے بے چین ہیں۔ صرف 8750 ٹکٹس لوگوں کو ملے ہیں۔۔ خدشہ یہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ آخری رسومات ایک سرکس کا روپ نہ دھار لیں۔۔۔ لوگ اس میں شرکت کے لئے بے چین ہیں آخری رسومات میں شرکت کرنے والوں کے نام قرعہ اندازی سے نکالے جا رہے ہیں۔۔ سیکورٹی کا بھرپور انتظام ہو رہا ہے۔۔

مائکل جیکسن جس کا ٹی وی انٹرویو ان سپورٹس میں دیکھے جانے والا سب سے زیادہ مقبول شو بن گیا تھا جسے لاکھوں کروڑوں لوگوں نے دیکھا تھا۔۔ جس کا ہر شو لاکھوں لوگوں سے بھرا رہا۔۔ جس کی ہر البم نے نئے سے نئے ریکارڈ بنائے۔ اور اب یوں لگتا ہے اس کی آخری رسومات بھی کچھ نئے ریکارڈ متعارف کروائیں گی۔۔۔ سفر تو جتنی جلدی اسے شروع کر دیا بہت سے سال اپنے پیشے کو دے کر فقط پچاس سال میں ہی وہ کسی بوڑھے کی طرح رخصت ہو گیا ایسے لوگ کتنے ہیں اس دنیا میں؟ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ، اصلی نقوش کے ساتھ، اپنے چہرے کے بھول پن کے ساتھ وہی مائیکل جیکسن آنکھوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کاسمٹک سرجری کے بعد کے اور الزامات کے بعد والے مائیکل کو لوگ بھول جائیں گے۔

مائیکل کی موت کے بعد سے میں یہی سوچتی جا رہی ہوں۔ اصلیت میں، originality میں ہی حسن ہوتا ہے۔۔ خدا کتنے پیارے چہرے کے حساب سے نقوش دیتا ہے۔ انسان جتنا بھی طاقتور ہو جائے، موجد ہو جائے، کرشمہ ساز ہو جائے، خدا جیسی خوبصورت تخلیق نہیں کر سکتا۔ نہ چیزوں کو خدا سے زیادہ خوبصورتی بخش سکتا ہے۔ اور دوسری بات زندگی کا یہ سفر، یہ بھاگ دوڑ ایک کفن کے لئے۔۔۔ ایک قبر کے لئے اور ایک رسم جنازہ کے لئے۔۔ ایک انسان کی موت سے زندہ رہنے والوں کو کیا ملتا ہے۔۔ ایک وصیت اور پھر وہ وصیت ان سے ہوتی

ہوئی کسی اور کو اور پھر کسی اور کو۔۔۔ پیچھے رہ جانے والے نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔۔ کتنے لوگ ہیں ہوں یا نہیں لاکھ کیا فرق پڑتا ہے؟

وصیت میں مردے کی طرف سے زندوں کو کتنے کا تحفہ ہے مردے کو کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک سی قبر میں اتر کر ایک سی مٹی میں مل کر اس کے بعد کونسا فرق، کونسی جماعت، کونسا رنگ الگ نظر آتا ہے۔ سب ایک ہو جاتے ہیں۔۔ مٹی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ تو کیا گورا اور کیا کالا۔۔ کیا پیلا اور کیا براؤن مٹی کا رنگ تو مٹیالا ہے اور یہ دنیا دلوں میں اسی رنگ کو آباد کر لے تو ہر رنگ کی عزت کرنا آجائے گی۔ اور کوئی مائیکل جیکسن اتنا بڑا فنکار ہونے کے باوجود بھی، رنگ کے ہاتھوں بد رنگ نہیں ہوتا رہے گا۔۔ اور وہ جس کی خوب صورتی اس کے فن میں تھی اور وہ جو پاپ گائیکی کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔۔ یوں نشے آوار دواؤں کا شکار نہ ہوتا۔۔ وہ جو اپنے اصل کو بھلانے کا جنون تھا، اپنی تنہائی میں غرق ہونے کا کرب تھا۔۔ وہ اس کی رگوں میں یوں نہ پھیلتا کہ اس کا دل ہی دھڑکنا بھول جاتا۔ اس کی روح کو سکون ملے جو دنیا میں بے سکون رہا۔۔ جو لاکھوں کے ہجوم میں تنہا رہا۔۔ جس کی موت پر لوگ اسے تنہا نہیں چھوڑ رہے۔ اور وہ تنہائی چاہتا ہے وہ سونا چاہتا ہے۔ اور اس صدی کے عظیم فنکار کو سلام۔۔ اور وہ جو کیمرہ مین کا دعوی ہے کہ اس کی روح کو اس کے گھر میں بھٹکتے دیکھا ہے۔ غلط ہو۔۔ اب اسے سکون سے سونا چاہیئے۔ اب اس کا بھٹکنا ختم ہونا چاہیے۔ دنیا میں اسنے میوزک سے بہت خوشیاں بانٹیں۔۔ اسے بھی خوش ہونا چاہیئے۔

غدار تو نوازے جاتے ہیں

Knighthood کا خطاب سر۔۔۔سراسر۔۔۔اور سر۔۔۔علامتی خطاب ہے
medieval میں اسے بہادری، chivalry اور gallantry کی مثال سمجھا جاتا ہے، سرماؤں
کو یا اعزاز یہ خطاب دیا جاتا تھا جو فوجوں کو لیڈ کرتے ہیں تھے سینے پر زخم کھاتے تھے اور بے خوف
تھے۔۔زمانہ بدلا commonwealth پر آکر اس مفہوم علامتی ہوگیا، آج یہ برطانیہ کے محل
سے نکلتا ہے اور ایک عظمت کی کنڈلی بن کر لینے والے کے سر پر ہمکتا ہے، مگر اس کا مطلب آج
مبہم ہے، نا سمجھ آنے والا ہے دوہرے معنی رکھتا ہے جیسے دہرے چہرے ہیں ویسے ہی دوسرے
معنی ہیں۔۔۔سر کے معنی۔۔ ملکہ برطانیہ اپنے ان سورماؤں کو بخشتی ہیں جنہوں نے انسانیت کی
اپنے گھر کی چار دیواری میں ملکہ ایسے بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے، ماؤنٹین کلائمبر انسانیت کی،
اپنے گھر کی چار دیواری میں ملکہ ایسے بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے ، ماؤنٹین کلائمبر
EDMUND HILLARY (mountain climber) ہو یا
PAUL MACCARTNEY (musician) ہو یا مشہور زمانہ، انسانیت کا محسن ہل

گیٹ ہو، اپنے سورماؤں کو جب سر کا اعزاز بخشا جاتا ہے تو خالص معیار پر، ان کی خدمات کے اعتراف میں اور ان کی قابلیت سے جھک کر۔۔ مگر جب شاہوں کے شاہ۔۔ colonies کے تھرڈ کلاس، تھرڈ ورلڈ کے باشندوں پر مہربان ہوتے ہیں جب ان کو نوازنے کو ان کا دل مچلتا ہے تو یہاں قابلیت، انسانیت کی خدمت، انسانیت کا سکھ انسانیت کے لئے سوشل ورک کچھ معیار ٹھہرتا نظر میں۔۔ معیار ہوتا ہے صرف غداری، خالصتاً غداری، تھرڈ ورلڈ کا، اس برطانیہ کا غلام رہ چکنے والا کوئی بھی ملک، اور اس کا کوئی باشندہ چاہے وہ کیمبرج کا تعلیم یافتہ ہو یا آکسفورڈ کا، مالامال ای صورت ہوتا ہے سر کا خطاب اسی صورت پاتا ہے جب وہ اپنے لوگوں سے، اپنے خون سے، اپنے ملک سے غداری کرتا ہے، اپنے کپڑے میں چھید کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ نوچتا ہے تو ملکہ برطانیہ اپنی زندگی کی 81 ویں برتھ ڈے پر اسے سر کے خطاب سے ضرور نوازتی ہیں، ورنہ ان آخری جشنوں میں زندگی کی ان جاتی بہاروں میں کہاں مزے اور کہاں رنگ نظر آئیں گے۔

سر کا خطاب انہیں دیا جاتا ہے جو کراؤن، ہیڈ آف سٹیٹ کی نظر میں معتبر ہیں،۔۔۔ اور برصغیر کی اس وقت کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔۔ معتبر کون ہوتا ہے۔ میر جعفر، جیسے کرداروں سے ہمارے تاریخ زرد ہوئی پڑی ہے آج تک بیاری ہے آج تک ہل نہیں پائی اور نئے نئے غدار اس کو مستقبل میں بھی ہلنے جوگا نہیں چھوڑنے والے۔۔ پوری پوری بستیوں کے وہ مالک جو صاحب بہادر کو اپنے لوگوں کی وفاداریوں کا بھرپور یقین دلاتے ہیں مسندِ شاہی میں اعلیٰ مقام پاتے تھے۔۔ آج تک یہی ہو رہا ہے، انڈیا، پاکستان، کینیڈا، امریکہ، انگلینڈ جہاں جہاں ہمارے لوگ ہیں، ان میں سے اکثریت ایسی ہے جو سر کا خطاب تو بہت دور کی بات ہے، کسی بھی گورے امیدوار سے صرف ہنس کر دیکھ لینے اور اس کے ساتھ تصویر کھچوانے کیلئے ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی کمیونٹی کے سب ووٹ آپ کو دلوائیں گے اور اس کے بدلے اگر اپنا کوئی مسلمان، پاکستانی بھائی کھڑا ہو تو اس کو دل و جان سے ہروانے میں مدد کرتے ہیں۔۔۔ تو رشدی نے تو سر کا خطاب پا کر اپنی غداریاں، (جن کو آزادی اظہار) freedom of expression کا نام دیا گیا ہے۔۔ تو کیا یہ آزادی

بہانہ ہے اس کو یہ ایوارڈ دینے کا۔۔ ہمارا تو اس سے کچھ نہیں جاتا ہے اور جانا بھی نہیں چاہیے۔

فٹ بال ورلڈ کپ میں جس طرح ایک عالمی چیمپئن زیڈان (مسلمان) کو بڑی خاموشی سے اشتعال دلا گیا، کیمرے کی آنکھ جب زیڈان پر پڑی تو وہ غصے سے لال پیلا تھا، اس نے مخالف اشتعال دلانے والے کے سینے پر ٹکر رسید کردی تھی۔۔ کیمرے نے لوگوں نے صرف زیڈان کو اشتعال میں دیکھا۔۔ اس کا خوب پروپیگنڈا ہوا، لوگوں نے اس کو اشتعال دلانے والے عوامل کو جاننے کی کوشش نہیں کی، جس شخص نے اسے مشتعل کیا اس کو ایسا کرتے کسی نے نہیں دیکھا، اس کی سازش کا شکار زیڈان پکڑا گیا رنگے ہاتھوں اور وہ پیٹھ پیچھے، ٹھنڈی سی آگ لگانے والا، پرامن مہذب رہا، یہ کھیل ہے گیم کے میدان سے سیاست کی بساط تک ایک غریب مسلمان ملک سے ایک امیر مسلمان ملک تھا۔۔ بڑی نفاست سے، بڑی ہنر مندی سے یہ کھیل کھیلا جارہا ہے۔۔ اگر اس کھیل کو غور سے سمجھیں زیڈان کو اشتعال دلوانے والے رویے کو سمجھیں تو ہمیں سمجھ آتا ہے۔۔۔ یہ سرکا شوشہ کیا ہے۔۔ بات بہ بات مسلمانوں کو اکسانے کا جو ایک جارحانہ رویہ ہے یہ کیا ہے ہمیں دوسری کے سینوں پر ٹکرے مارتا سارا میڈیا پکڑ لیتا ہے، جس وجہ سے ہم ٹکریں مارتے ہیں اس کوئی نہیں دیکھتا یا دیکھتا بھی ہے تو دیکھنا نہیں چاہتا۔۔۔ ہم متحد نہیں، ہمارا سب سے خوبصورت اور دل پسند شکار ہونے کی وجہ، ہمارا لذیذ گوشت، ان گوروں کو لبھانے کی وجہ، یہ گوشت غداری، نا اتفاقی اور leg pulling کی ہانڈی میں تیار ہوتا ہے، صاحب بہادر کو یہ ڈش بہت مرغوب ہے، اسی لیے صاحب سر کا خطاب دیتے ہیں۔۔۔

ورنہ آزادی اظہار تو ایران کے احمدی نژاد نے بھی کیا تھا hollowcast پر سیمینار کروا کے اس کے تو جابجا داخلے بند ہو گئے تھے پابندیاں لگ گئی تھیں، سفارتی، سوشل ہر قسم کے بائیکاٹ تیار ہو گئے تھے ۔۔ اس موضوع پر جس جس سکالر نے ریسرچ کرنے کی کوشش کی، اسے کئی کئی سال زندان میں ڈالے رکھا یہ آزادی اظہار نہیں ہے؟ آج اگر ہٹلر کے ہاتھوں مرنے والے یہودیوں کی تعداد ۶ ملین سے ساڑھے پانچ ملین بھی کردیتا ہے تو سخت سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔۔ اسے اس ریسرچ

کا خطاب کیوں نہیں ملتا ۔۔ ہمارے ہیرو، نیوکلیر پاور کے موجد، ہمارے محسن ڈاکٹر قدیر خان (جس کا نام رہتی دنیا تک رہنے والا ہے) کا خطاب ہے چور ڈاکو اور اس کا اعزاز ہے کال کوٹھری، کسمپرسی کی موت اور اس کا سبب کون ہیں ہمارے اپنے لوگ ۔۔۔ جب میں بچوں کو بتاتی ہوں کہ ہمارے ملک پر ایک ایسا صدر ہے جس نے ہمارے ہیرو کو قید کر رکھا ہے تو بچے پوچھتے ہیں ۔۔۔ آزادی اظہار والے اس ملک میں حیران ہو کر پوچھتے ہیں ایسا کیسا ہو سکتا ہے؟ جو ہیرو ہو، اور اسی ملک کا ہو، وہی ملک اسے کیسے جیل میں ڈال سکتا ہے ۔۔ اس کے لوگ صدر کو مار کیوں نہیں دیتے ۔۔ میں کہتی ہوں ہم اپنے ملک کے صدر کو مار نہیں سکتے، ہم اپنے رسول کی شان میں گستاخی کرنے والے کو اف تک نہیں کہہ سکتے، ہمیں دنیا دہشت گرد کہتی ہے ہمیں دنیا جوش میں اندھے لوگ کہتی ہے، ہمیں دنیا گھٹی ہوئی قوم کہتی ہے، ہمیں اپنا امیج صحیح کرنا ہے ہمیں روشن خیال بن کر دکھانا ہے، ہمیں ابھی اپنے بہت اچھے اچھے لوگ، اپنے ہیرو کو مروانا ۔۔۔ ہمیں منہ سے کوئی غلط بات نہیں نکالنی ۔۔ ہم نے دنیا میں اچھے اور پر امن انسان بن کر دکھانا ہے دیکھو، زیڈان کو چپکے سے گالی دینے والے کھلاڑی کی طرح، برطانیہ شوشہ چھوڑ کر کسی کی نظر میں نہیں آیا ۔۔۔ زیڈان کو جاتا سب نے دیکھا ۔۔۔ رشدی کو خطاب دینے میں بڑے بہانے ہیں، ملکہ برطانیہ کی اس میں کہیں پکڑ نہیں ۔۔۔ نار جلاتے، پتلے جلاتے، تصویریں پھاڑتے مسلمان ہر کیمرے کی آنکھ میں ہیں، ٹکریں مارتے ہم ہی نظر آتے ہیں، ملکہ تو محل کے کسی تاریک کونے میں آنکھوں پر پٹی باندھے، روشنی کو روکتے ہوئے سو رہی ہو گی، سر کا خطاب پانے والا سو رما، کسی کھڈ میں گھس کر اپنی جان بچا رہا ہو گا، جس کی جان بچانے کیلئے انگلینڈ کی حکومت بلین پاؤنڈ ہر سال خرچ کرتی ہے اور یہ قیمتی جان 1990 سے یہ سہولتیں لے رہی ہے ۔۔۔ یہ سرمایاتی نظام پر بوجھ نہیں، کیونکہ یہ گوروں کے دل سے تعصب کا نفرت کا بوجھ اتارتا ہے جو ان کے دلوں میں نہ جانے کتنی صدیوں سے چھایا ہوا ہے ۔۔۔ خوف ہے یا نفرت ہے اس کا فیصلہ تو یہ لوگ کیلئے بیٹھ کر خود ہی کر سکتے ہیں ۔۔ مسلمان سے کیا خوف ہے جو یہ ان کو چین سے جینے نہیں دیتے ۔۔۔ ان کی آنکھوں میں صلیبی جنگیں خود چلتی ہیں

اور وحشت گرد ہم قرار پاتے ہیں کیونکہ ہماری قوم کی جب فصل کٹتی ہے تو بہت سے میر جعفر اگتے ہیں اور ان کا مقام ہے ایسے ٹھنڈے، ہوشیار اور پر امن قوم کا ہتھکنڈا بنا ۔ ۔ ۔ کینیڈا میں بہت سے لوگ اسلام کے پاکستان کے، قرآن شریف کے، رسول پاک ﷺ کے خلاف لکھتے ہیں، بولتے ہیں اور کہتے ہیں وہ سب امید پکی رکھیں، سر کا خطاب نہیں تو ملکہ یا کسی نہ کسی بادشاہ کی نظر کرم میں تو آ ئیں گے ۔

☆☆☆

ہمارے محمود و ایاز کینیڈا میں رہتے ہیں

Hazel Mccallion میئر مسسز گا 14 فروری 1921 کو کیوبک کے صوبے میں پیدا ہوئی، زندگی کی 88 بہاریں گزار چکی ہے اور ابھی بھی اس میں بیس سال کی لڑکی جتنی توانائی ہے، وہ

1968 سے سیاست میں ہے اور تقریباً اٹھائیس سال سے مسسز گا کی میئر ہے مسسز ساگا کی تاریخ میں اس کے علاوہ صرف دو میئر گزرے ہیں، باقی تمام عرصہ مسسز گا پر اس خاتون کی حکمرانی رہی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی الیکشن کمپین نہیں چلاتی، کوئی فنڈ ریزنگ مہم نہیں چلتی اور وہ گھر بیٹھے جیت جاتی ہے، اور وہ کہتی ہے جو فنڈ مجھے دینا ہے وہ کسی خیراتی کام میں لگا دیا جائے 2006ء کے حالیہ الیکشن میں اس نے ایک پیسے کے expense کی بھی رپورٹ نہیں کی، وہ پاکستان میں ہوتیں تو انہیں پچاس سال پہلے ہی یہ مشورہ دیا جاتا، بی بی گھر بیٹھو اور اللہ اللہ کرو۔ لو دیکھو!۔۔اماں کیسے چھلانگیں لگاتی پھرتی ہے۔۔اماں حیا کر۔۔وغیرہ وغیرہ۔۔

مگر یہ اماں! جس نے اپنی فولادی قوت اور مضبوط دماغ سے مسلسل جیت کر یہ ثابت کیا ہے کہ عورت کے اندر خدا نے ایسی قوت بھردی ہے جو ٹھیک جگہ اور ٹھیک موقعے پر استعمال ہو کر مردوں کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ سکتی ہے، اس مائی نے بہت سے ایوارڈ جیتے ہیں جرمنی کی کمپنیوں کا بزنس کینیڈا لانے پر اسے جرمنی کا سب سے اعلیٰ ایوارڈ ملا ہے کینیڈا کا سب سے اعلیٰ ایوارڈ، کئی ٹائٹل، عورتوں کیلئے ایک مشعلِ راہ ہے، اور جو لوگ عورت کو دماغ کے ساتھ نہیں صرف جسم کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کیلئے اس مائی کی مثال ہی بہت ہے۔

اس کو کیوں بار بار منتخب کیا جاتا ہے۔۔۔ایسے ہی نہیں۔۔نہ وہ کسی کی وراثت لے کر آگے چل رہی ہے اور نہ وہ عورت ہے اس لیے کہ: 1978 میں جب وہ پہلی مرتبہ مسسز گا کی میئر منتخب ہوئی تو اگلے ہی سال ایک ٹرین کے derail ہونے کا حادثہ مسسز گا میں پیش آ گیا، اس ٹرین میں تباہ کن مواد تھا اور بہت زیادہ نقصان کا احتمال تھا۔ مگر اس مائی نے جو اس وقت بھی کوئی نوجوان نہیں تھی 56 سال کی تھی۔۔اس نے پاؤں کی موچ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بہت حاضر دماغی اور اور تدبر سے مسسز گا جس کی آبادی اس وقت دو لاکھ تھی، خالی کروایا۔ اور کسی بھی قسم کو کوئی جانی نقصان نہ ہونے دیا۔۔۔اور دیکھنے والے کہتے ہیں وہ سٹک سے اپنی موچ کو کہیں پیچھے چھوڑتے ہوئے، لوگوں کے لیے بھاگی دوڑی پھر رہی تھی۔۔

آج مسز گا اس کی پالیسیوں کی وجہ سے debt free شہر ہے۔۔۔اس کا نام مسز گا میں بزنس کیلئے ایک ٹرمپ کارڈ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اور ایک واقعہ اس کے نام سے سنایا جاتا ہے۔کہ ایک آدمی خودکشی کرنے کو تیار تھا۔خوب شور شراب،عمارت کے گرد فائر بریگیڈ، پولیس اور ایمبولینس وغیرہ چار گھنٹوں سے لٹکے کھڑے تھے۔۔میئر کو اطلاع ہوئی۔۔وہ آئی سیدھی اس آدمی کے پاس گئی اس سے کہا۔۔ان سب لوگوں کو کیوں باندھ رکھا ہے انہیں اپنے ضروری کام کرنے دو ۔۔یہ سن کر آدمی نے گن پوائنٹ اور خاموشی سے نیچے اتر گیا یہ فولادی خاتون آج تک اپنے گھر کا کام خود کرتی ہے، دومنزلہ سرخ اینٹوں والا گھر جو سٹریٹس ول میں ہے اس کے سسر نے شادی کے وقت تحفے میں دیا تھا۔آج بھی اسی گھر میں رہتی ہے، اس کے خاوند کو فوت ہوئے کافی سال گزر گئے ،وہ کہتی ہے: میں روز صبح اپنے دفتر اسی بیتابی سے جاتی ہوں جتنی میں اپنے دفتر کے پہلے دن گئی تھی۔

لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اسے اس وقت تک میئر دیکھنا چاہتے ہیں جب تک وہ زندہ ہے اور چلتی پھرتی ہے، وہ اپنی کار خود چلاتی ہے،سائیکل پر سواری کرتی ہے۔۔اور اس نے مسز گا کے ہرٹیج سینٹر، لیونگ آرٹ سینٹر اور کمیونٹی سینٹر بنوائے ہیں۔ساری عمر گزاردی۔سیاست کو عبادت کا درجہ دیا۔۔سیاست میں دولت نہیں عزت کمائی۔

یہ قصہ محض ایک ایسی عورت کا کردار اجاگر کرنے کیلئے سنایا نہیں جا رہا۔۔جو عورتوں کیلئے ہمت، ذہانت اور مستقل مزاجی کا سبق ہے، اور نہ ہی صرف ان بوڑھوں کا حوصلہ بڑھانے کیلئے سنایا جا رہا ہے جو بڑھاپے کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں یا سماج ان پر طاری کروا دیتا ہے بلکہ اس قصے میں ایک اور کہانی بھی چھپی ہے اور وہ ہے نظام جی جیت کی۔۔میڈیا اور جوڈیشری کے کردار کی۔۔معاشرے وہاں کے رہنے والے لوگوں سے نہیں وہاں بنے ہوئے نظام اور اس کی بالادستی سے کامیابی سے چلتے ہیں۔امن کا گہوارہ بنتے ہیں اور انسانوں کے لائق رہنے کی جگہ بنتے ہیں۔

اس عورت کی مثال اس لیے آج ذہن میں آئی کہ اتنی مثالی زندگی گزار کر، بڑے بڑے کام کر کے

۔۔ چار دہائیوں میں اپنا نام بنا کر بھی وہ میڈیا اور جوڈیشری کے آگے جوابدہ ہے۔ اس کا جرم یہ ہے کہ اس کے ریلٹر بیٹے نے جو زمین خریدی تھی ۔۔ اس کی میٹنگ میں ہیزل خود بھی موجود تھی اور اس نے conflict of interest میٹنگ میں موجود دوسری اتھارٹیز کے آگے واضح نہیں کیا۔ بس۔ اتنا تھا۔۔ رہائشی علاقے کی زمین کمرشل ہونے جا رہی تھی ۔۔ اور اس سے اس کے بیٹے کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ پبلک آفس ہولڈر والے کو اپنے انٹرسٹ دکھانے پڑتے ہیں مگر وہ خاموش رہی، اور آج اس کا جوڈیشل ریویو ہونے جا رہا ہے جس کی لاگت 2.5 ملین ہوگی مگر تقاضا ہے کہ یہ ہو کر رہے گا۔۔ اور بات ایک شخص کی نہیں، بات ہے پالیسی کی ۔۔ آخر سسٹم میں یہ لوپ ہول کیسا کہ اس قسم کا فائدہ کوئی اٹھا سکے۔۔ گھر میں ہوئے اس سوراخ کو بند کرنے کیلئے یہ جائزہ ضروری ہے اور سسٹم کسی ایک شخص کیلئے نہ بنتے ہیں نہ توڑے جا سکتے ہیں۔ یہی بات میڈیا کہہ رہا ہے، عام لوگ کہہ رہے ہیں اور اپوزیشن کہہ رہی ہے، حالانکہ لوگ اس ضعیف العمر میئر سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ ایک عورت کو میں نے روتے اور یہ کہتے سنا۔۔۔ میں میئر کا یہ حال نہیں دیکھ سکتی۔

دوسری طرف میں پاکستان میں این آر او کا ڈرامہ دیکھتی ہوں ۔۔ وہ کہتے ہیں سیاست دان ہر جرم سے بری الزمہ ہے، چاہے اس پر قتل کا مقدمہ ہے یا غبن کی کیس، اغواء ہے یا ہائی جیک کا مسئلہ۔۔ لوٹ مار ہے یا بد نیتی ، بس ایک affidevite لکھ دیا جائے گا کہ یہ سیاسی مقدمہ ہے اور ہمیں پھنسایا گیا ہے اور پھر اس پر کوئی مقدمہ نہیں چل سکتا، آسان الفاظ میں قاتل، ڈاکو، فراڈ اور چور بننے سے پہلے بس اتنا کرنا ہے کہ سیاست دان بن جانا ہے ۔۔ بس پھر کوئی قانون آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، ۔۔ پہلے تو یہ عملاً ہو رہا تھا ماتم کا مقام تو یہ ہے کہ اسے اب قانون کی صورت متعارف کروایا جا رہا ہے، اور ہم ایک پاکستانی کی حیثیت سے بڑے فخر سے کہتے ہیں ۔۔ جو عیش پاکستان میں ہے وہ اور کہاں ۔۔۔ ان ممالک میں تو بات بے بات قانون آ کھڑا ہوتا ہے ۔ میڈیا جان کھیا جاتا ہے ۔۔ دیکھو مائی کی اللہ اللہ کرنے کی عمر تھی اور اسے ذلیل کر کے رکھ دیا ہے، بغیر الیکشن کمپین چلائے 90 فیصد ووٹ لینے والی کی اتنی بھی وقعت نہیں جتنی ہمارے ہاں پچھلے دروازے سے ایوان صدر

میں داخل ہونے والوں کی ہوتی ہے۔۔ بچارے کینیڈین اور وہ کہتے ہیں ہمارے قانون، پالیسیاں اور ضابطے کسی بھی انسان کیلئے نہیں بدل سکتے۔۔ اور وہ سب کو ایک کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ پالیسی کو بچانے کیلئے مزید مضبوط بنانے کیلئے سب انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیتے ہیں، محمود اور ایاز ان معاشروں میں بس گئے ہیں ہمارے ہاں مشرف، زرداری، نواز شریف اور رحمٰن ملک رہتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں ہمارے ہاں جنگل کا قانون ۔۔ میں کہتی ہوں جنگل کے قانون کی توہین کیوں ۔۔۔؟ جنگل میں تو فطرت کا بڑا خوبصورت اور لگا بندھا قانون چلتا ہے۔۔

☆☆☆

نہیں نہیں میں طالبان نہیں ہوں

یہ کیسا لیبل ہے؟ اسے تو مجھے اپنے سے ہٹانا ہے میں! اور بنیاد پرست! نہیں ہرگز نہیں ۔ میں نے تو ماڈرن اور ماڈریشن کی سڑک پر دوڑنا ہے، مولوی تو نہیں، میں ایکٹوسٹ بھی نہیں، میں شدت پسند بھی نہیں میرا انداز دفاعی ہو جاتا ہے اور میں یہ بھول جاتی ہوں کہ میں انصاف اور امن کی بات کرتے کرتے اپنے آپ کو طالبان جیسے لفظ سے بچانے کے چکر میں پھنس جاتی ہوں، مجھے قدامت پرست اور شدت پسند جیسے القابات سے اب اکثر نوازا جاتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ماڈرن نہیں، اور ماڈرن ہونے کی آج کل جو تعریف ہے میں اس پر پورا نہیں اترتی، اس تعریف سے آپ سب واقف ہوں کیونکہ 80 فیصد لوگ اس پر پورا اترتے ہیں اور وہ تعریف کچھ یوں ہے کہ اگر پاکستان کے کسی حصے میں اور خاص کر کسی مدرسے میں اور کسی قبائلی علاقے میں کوئی پاک فوج سے یا امریکہ کے ڈرون اٹیک میں مرجائے تو منہ سے سسکی نہ نکالو، اور اس موت کو یہ کبھی نہ سمجھو کہ یہ کسی انسان کی موت ہے، اور سمجھو یہ ان بدنصیب جانوروں سے بدتر مخلوق کی موت ہے جو اس شبے میں مر گئے کہ وہ طالبان ہیں، یا تھے، یا بن سکتے ہیں، اور یہ طالبان وہ ہیں جس سے امریکہ میں بسنے والے اعلیٰ نسل کے انسانوں کی جانوں کو خطرہ ہے اور اس سے پہلے کہ وہ بچے بڑے ہوں، کچھ عقل سیکھیں یا ذہن میں کچھ کھٹا میٹھا ارادہ کریں، انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دو، اور جو جرم وہ کبھی بھی کر سکتے ہیں اس جرم کی پاداش میں انہیں اگر مار دیا جاتا ہے، بے عزت کیا جاتا ہے تو یہ اپنے شہریوں کو بچانے کا جو بہت باوقار انسان ہیں ایک مہذب طریقہ ہے، دنیا کی آبادی کا کتنا حصہ مار کر کتنے فی صد حصے کو تحفظ دینا ہے، یہ فیصلہ کرنے کا حق آپ کو یا مجھے نہیں مگر اسے تسلیم

کرنے کا فرض آپ کا ہے میرا ہے اور اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم بنیاد پرست، طالبان پرست اور دہشت گرد سوچ کے حامل ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ دیکھتے دکھاتے میرا نام شدت پسند پڑ گیا، عام انسان کے اندراج کر دیکھا تو امریکیوں یا رئیسوں جیسا پایا تو یہی سوال اٹھایا کہ انسان کو دو نظر سے کیوں دیکھا جائے؟ اگر ایک مارنے والا دہشت گرد ہے تو اسے بھی بڑے طریقے سے مارنے والا دہشت گرد کیوں نہ کہلائے، میرے نزدیک دونوں برابر ہیں، معصوم لوگوں کی جانیں لینے والے دونوں ہی دہشت گرد ہیں، تشدد کے نت نئے طریقے نکالنے والے دونوں ہی شدت پسند ہیں، کوئی مذہب کی آڑ میں جنونی کھیل کھیل رہا ہے تو کوئی دنیا کو امن کی جگہ بنانے کی آڑ میں لوگوں کے منہ پر تحقیق کے نام پر پیشاب کرنے کو بھی جائز سمجھتا ہے۔

طالبان کے ظلم، ان کا آمرانہ انداز اور اسلام کے نام پر طرح طرح کے ظلم متعارف کروانا، ان کی حمایت کون کرتا ہے؟ ان پہاڑیوں میں رہنے والے، کتابوں سے دور اور دنیا کی جدت سے نا آشنا کو تو ہم سب بہت کوستے ہیں جنگلی اور جنگی دونوں ناموں سے نوازتے ہیں۔ اور ان کے خلاف لکھنے اور انہیں گالیاں دینے میں تو سبقت رکھتے ہیں۔ اور ہم ماڈرن اور اعتدال پسند کہلاتے ہیں، مگر یہ اعتدال ہے؟ اعتدال تو دو شدتوں کے درمیان کا راستہ ہے، تو کیا ہم ایک طرح کے شدت پسندوں کو کوستے کوستے دوسری طرح کے شدت پسندوں کی طرف نہیں جھک رہے اور کیا ہمارے ہاتھوں میں بھی لہو کی بو نہیں رچ رہی؟ کیا صرف وہ جنگلی ہی بہار رہے ہیں؟ کیا ہوش و عقل سے فقط وہی بیگانہ ہیں؟ کیا سمجھدار تعلیم یافتہ، مہذب اور سفید دنیا کے باسی قتل و غارت، انسانیت کی تذلیل اور معصوموں کی موتوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھ رہے؟

جرمنی کی عدالت میں مصری اکتیس سالہ حاملہ خاتون جس کا تین سال کا بچہ بھی اسی جگہ موجود تھا، اس خاتون کو ایک مسلمان سے نفرت کرنے والے اٹھائیس سال کے ایکسل ڈبلیو نے عدالت میں اس وقت اٹھارہ دفعہ چاقو مار کر قتل کر ڈالا، جب وہ عدالت میں اپیل کا فیصلہ سننے اپنے شوہر کے ساتھ

آئی تھی، جسے قاتل نے حجاب لینے کے جرم میں سرِعام دہشت گرد کہا تھا اور عدالت نے ایکسل کو 2008ء میں جرمانہ کر دیا تھا، جس کے خلاف اٹھائیس سال کے اس نوجوان نے اپیل کی تھی اور شیرینی اسی عدالت میں اس نوجوان کے ہاتھوں وحشیانہ طریقے سے قتل ہو گئی، کیا یہ وحشت نہیں؟ کیا یہ جنونیت نہیں؟ کیا یہ شدت پسندی نہیں؟ کیا یہ نفرت نہیں؟۔۔۔ چونکہ میں ماڈرن لوگوں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتی ہوں، میں اپنے اوپر شدت پسندی کا لیبل ہٹانا چاہتی ہوں، تو میں کہتی ہوں نہیں۔۔۔ گورا کبھی غلط نہیں کرتا، وہ ہمیشہ مہذب رہتا ہے، وہ دہشت گرد نہیں ہوتا، اس عورت کو کیا ضرورت تھی حجاب پہننے کی، اور پھر اگر کسی نے اسے دہشت گرد کہہ ہی دیا تھا، تو وہ تسلیم کرتی کیوں کہ اس کا حجاب ہی دہشت گردی کی علامت ہے، آزادی کی نہیں، اور مجھے ماڈرن کہلانا ہے اور میں یہ بھی نہیں کہتی کہ جیسے کوئی حجاب نہ کرنے کیلئے آزاد ہے اسی طرح کوئی حجاب لینے کیلئے آزاد کیوں نہیں ہو سکتا؟ حجاب نہ کرنا شرافت اور حجاب کرنا دہشت کب سے بن گیا؟ اگر ہمیں حجاب کرنا اچھا نہیں لگتا اور ہم اس میں آزاد رہنا چاہتے ہیں کوئی آکر پردے کی بات کرے تو ذہن میں غلامی کی گھنٹی بجتی ہے۔۔ تو اسی طرح حجاب کرنے والیوں کی آزادی کیوں سلب کرنا۔۔ کیا انہیں بھی اوڑھنے پہننے کی آزادی نہیں ہونی چاہیے، کسی کی آزادی حجاب نہ پہننے میں ہے تو کسی کی پہننے میں بھی ہو سکتی ہے، کون پہنے کون نہ پہنے کیا یہ ایک فرد کا اپنا معاملہ نہیں ہونا چاہیے؟ اگر طالبان کسی کو حجاب پہننے پر مجبور کر کے عورت کو اندر سے مار دیتے ہیں کیا اسی طرح مغرب میں اپنی مرضی سے حجاب پہننے والی کو برا بھلا کہنا یا اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا طالبانی رویہ نہیں ہے؟ کیا فرق ہے ان جنگل میں رہنے والوں میں، جنہوں نے کتابوں کا منہ تک نہیں دیکھا اور ان مہذب انسانوں میں جنہوں نے جابجا لائبریریوں کے، تحقیق کے اور تشخص کے مراکز قائم کر رکھے ہیں؟ کیا فرانس میں نقاب پر پابندی لگنا ایسا ہی نہیں جیسا سوات میں نقاب پہننے کی پابندی ہو، مگر میں خاموش ہوں، مجھے شدت پسندی کا لیبل ماتھے پر نہیں لگوانا۔

اور میں چیخ چیخ کر ایران میں ہجوم میں کھڑی لڑکی پر گولی چلنے کے واقعے پر میڈیا کا ساتھ دے رہی

ہوں۔۔ظلم ہے۔لڑکی پر وار ظلم ہے۔ بے قصور لڑکی، خوبصورت لڑکی، کیوں ماری گئی؟ کس جرم کی پاداش میں ماری گئی؟ احمدی نژاد کے گلے میں اس جرم کا پھندا پڑنا چاہیے، اور میں مغربی میڈیا میں اس لڑکی کا چہرہ بار بار دیکھتی ہوں اور میرا دل اس طرح کانپتا ہے جیسے سوات میں مرنے والی بچیاں دیکھ کر کانپتا ہے، مگر میں دل کو کہتی ہوں نہیں جسے مغربی میڈیا بہت زور وشور سے دکھا رہا ہے اس کی موت معنی رکھتی ہے، وہ ایک عورت کی، ایک انسان کی موت ہے، اس سے کسی گستاخ امریکہ کا تختہ الٹ سکتا ہے، مجھے اس موت کا خوب ماتم منانا ہے، میں ماڈرن، مہذب اور تعلیم یافتہ کہلانا چاہتی ہوں، میں شدت پسند نہیں ہوں اور میرے ذہن کے پردے سے سب سواتی بچے بچیاں، عورتیں، بوڑھے دھندلا گئے اور میں نے کہا انہیں مرنا ہی چاہیے، کیونکہ طالبان کو پکڑنے کا کوئی اور طریقہ نہیں، اور میں جو دانشوروں کو کہتی ہوں فوج حملہ نہ کرے، معصوم لوگ نہ مارے جائیں اور جیسے مرضی، کسی بھی طریقے سے طالبان کو پکڑ لے، تو لوگ کہتے ہیں میں طالبان ہوں۔ ماڈرن دانشور لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ جہاں طالبان ہوں وہیں پر بم ماردینا چاہیے اور میں جوان سے پوچھتی تھی کہ اگر تمہارا بچہ کسی سکول میں ہے اور اندر طالبان آ گھسے ہیں تو کیا تم پھر بھی پاک فوج کو کہو گے کہ جہاں طالبان ہیں وہاں بم مار دو۔۔مگر میں اب یہ بھی نہیں کہتی کیوں کہ مجھے اپنے سے لیبل ہٹانا ہے۔

پاکستان سے میرے ایک بہت پیارے انکل لکھتے ہیں ۔۔ روبی بیٹا۔ تم نیا کالم میں Maddof کی بات تو خوب کی جسے امریکی عدالت نے سزا دی کہ اس نے اپنے شہریوں کو مالی دھوکہ دیا، مہذب معاشروں میں عدالتیں ایسے ہی آزاد ہوتی ہیں، انسانوں میں یونہی حق سچ پر فیصلے ہوتے ہیں، عوام، رعایا سربراہ مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے مگر کیا تم بتاؤ گی ڈاکٹر عافیہ کا فیصلہ امریکی عدالت کیوں نہیں کرتی۔ میں خاموش ہوں۔ میں ڈاکٹر عافیہ کے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھا کر جنگلی نہیں بننا چاہتی، اس نے ضرور کچھ کیا ہوگا۔۔قرآن شریف تو پڑھنے کیلئے بانٹی تھی؟ کیا ضرورت تھی امریکہ میں رہ کر یہ سب کرنے کی۔ نیورو سائیکلوجی میں ایم

ایس سی کیا، پوری ڈاکٹر فیملی سے تعلق رکھتی تھی کیا ضرورت تھی کسی بھی مسلم آرگنائزیشن کو جوائن کرنے کی، پانچ سال وہ گمشدہ رہی تو کیا؟ اس پر دہشت گردی کا۔۔شبہ۔۔۔تھا۔اس پر القاعدہ کا ماسٹر مائنڈ ہونے کا۔۔شبہ۔۔تھا اس شبے کی بنیاد پر اگر ایک مسلمان عورت کو پانچ سال تک سرے سے غائب ہی کر دیا جائے اور جب وہ منظر پر دوبارہ آئے تو اس کا ایک گردہ نہ ہو، اس کے دانت نکال دیے گئے ہوں، اس کا ریپ بار بار کیا گیا ہو، اس کے بچے (جنہیں میں معصوم نہیں کہوں گی۔۔کیونکہ وہ ایک مشتبہ دہشت گرد مسلمان پاکستانی عورت کے بچے ہیں) کیا ہوا اگر وہ دس سال کے اور اس سے بھی چھوٹے ہیں، وہ معصوم کیسے ہو سکتے ہیں؟

محمد احمد، دس سال کا ڈرا سہا بچہ، کہاں کہاں سے ہوتا ہوا آیا۔جس کے ماں باپ کی پیدائش کے بعد سے اس بات پر جھگڑتے رہے کہ اس کی پرورش امریکہ میں کی جائے یا پاکستان میں؟ کہاں رہ کر وہ اچھا انسان بن پائے گا، اور وہ بچہ پانچ سال افغانستان میں نہ جانے کن حالوں میں رہا، اور ہمارے دانشور ہی بتاتے ہیں کہ وہاں بچوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ تو وہ بچہ۔ڈاکٹر عافیہ کا بچہ۔وہ کس رحم کے قابل ہے، اس کی ماں کی مشتبہ حرکتوں کی وجہ سے وہ امریکی بچے جو پیدا ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں کسی بھی حملے سے خوف کا شکار ہو سکتے ہیں، کسی بھی نفسیاتی الجھن میں الجھ سکتے ہیں، تو یہ بچہ یا اس کے ننھے ننھے بہن بھائی کیسے معصوم اور کس طرح رحم کے قابل ہیں؟ ان کا ان کی ماں سے بچھڑ جانا، جہنموں میں رہنا، اذیتیں سہنا، اس کا ذکر میں نہیں کر سکتی، میں ایک پڑھے لکھے دانشور کا خطاب اپنے لیے سننا چاہتی ہوں نہ کہ شدت پسندی کا۔

میں تو یہ بھی نہیں کہوں گی کہ yvone Ridley برطانوی جرنلسٹ جب جنگلی طالبان کے پاس قید ہوئی اور اس کا جرم بھی شائد ڈاکٹر عافیہ جیسا ہی تھا بغیر پاسپورٹ، بغیر ویزے کے منہ ڈھک کر وہ افغانستان میں داخل ہو گئی تھی، 14 دن طالبان کی قید میں رہی اور وہ اسے رات کو دروازے کے اندر سے بند کر کے سونے کی ہدایت کر جاتے تھے اور جہاں قید میں رہ کر بھی اسے کھروچ تک نہیں آئی، مگر اس میں قابل تعریف بھی کوئی بات نہیں، وہ جنگلی اسے دنیا کی اعلی مخلوق سمجھ کر اس کو عزت

دیتے رہے، اس کا جرم ان کی نظر میں ڈاکٹر عافیہ جتنا ہی ہوگا۔۔۔شبہ۔۔۔شبہ۔۔۔اور شبہ مگر ڈاکٹر عافیہ کا انجام یا حال اس جیسا نہیں کیونکہ وہ اس ملک کی باسی ہے جسے فروخت کرکے اس کے ملک کے صدر کے بلال بیٹے نے رقم وصول کی ہے، وہ بیچی گئی جنس ہے اور ریڈلی خریدنے والے ملکوں کی ایک اعلیٰ نسل کا باسی ہے، دونوں کو ایک نظر سے دیکھنا انصاف کی، انسانی معاشروں میں توازن کی توہین ہے۔اور توازن کا حسن یہی ہے کہ جو جس مقام پر ہے وہ رہیں رہے تو اچھا ہے ہمارا جو مقام ہے ہم اسی کو سر جھکا کر تسلیم کرلیں اور سمجھدار، پڑھے لکھے دانشور کہلائیں، اعلیٰ نسلوں کے لوگوں کو مقابلہ یا ان کے مقابلے کا انصاف مانگنا چھوڑدیں، پانی ہمیشہ نیچے کو بہتا ہے تو اس کے مخالف سمت بہنے کی کوشش کیوں کریں۔ نیچے گھاٹیوں میں جو پسے ہوئے، لوگ کھڑے ہیں ان کی طرف جوتیوں کا رخ کرلیں، اور جو لوگ بلندیوں پر پہنچ چکے ہیں ان کو سر پر ہاتھ رکھ کر سلام کریں، یہی دانشوری ہے۔

☆☆☆

ہمارے MADOFF تو جنت میں رہتے ہیں

نیویارک کے فیڈرل جج Denny Chin کے الفاظ سننے، پڑھنے اور دل میں سمانے سے تعلق رکھتے ہیں اس نے کہا۔

Here the message must be sent that Mr Madoff's ----- crimes were manipulation of the system is not merely a BLOODLESS financial crime that takes place just on paper ,but it is instead .... on that takes a staggering extraordinarly evil and that this kind of irresponsible human toll".

Madoff وال سٹریٹ کا ایک ایسا مجرم ہے جس نے بڑے بڑے مہذب طریقے سے بغیر خون بہائے کئی لوگوں کو جیتے جی یوں مار دیا کہ ان سے ان کا پیسہ جھوٹ اور فراڈ سے ہتھیا لیا، 1990 کے آغاز سے PONZY SCHEME کے ذریعے تقریباً 5 بلین ڈالرز اکٹھے کیے 70 سال کے برنارڈ میڈوف کو 150 سال کی سزا سنائی گئی ہے، سزا سناتے ہوئے جج نے وال سٹریٹ میں جنم لینے والے اسی معاشی سکینڈل کو جو کل لالچ کی علامت بن سکتا تھا سخت سے سخت سزا جو امریکی قانون کے مطابق صرف دہشت گرد، غدار یا بہت ہی سنگین جرائم کے مرتکب انسان کو دی

جاتی ہے۔وی۔گو کہ اس نے کسی کی جان نہیں لی مگر بہت سے لوگوں سے انکی ساری زندگی کی کمائی چھین کر انہیں زندہ درگور کردیا جس کے نتیجے میں اسے کوئی حق نہیں کہ وہ اچھی زندگی گزار سکے، اس اس کے زندگی کے باقی دن عام سی جیل میں ڈرگ ڈیلرز اور غنڈوں کے درمیان گزریں گے، اس کی سب طاقت چھن جائے گی، کسی کے مقرر کیے وقت پر روٹی کھانا، سونا اور اٹھنا بیٹھنا ہوگا، فرش پر کپڑ امارے گا، ٹوائلٹ صاف کرے گا اور پولیس رات کو پانچ سے چھ مرتبہ اس کے سوئے ہوئے چہرے پر ٹارچ مارے گی، اور اب اسے فراڈ اور لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے جرم میں اسی جیل کے اندر ہی مرنا ہوگا، اس کا جرم امریکی جج کی نظر میں ناقابلِ معافی اور ناقابلِ ضمانت ہے، بلین بلین سب دھرے کے دھرے اور اس کی زندگی ایک عبرت کی نشانی بنا دیا، پچھلی ایک دہائی سے امریکہ میں white collar criminals کو لمبی لمبی سزائیں دینے کا رجحان بڑھ گیا ہے، میڈوف کی فراڈ کا شکار لوگوں کا کہنا تھا اس نے امریکہ معاشی نظام پر ہمارا اعتماد متزلزل کیا ہے۔۔ اس نے ہماری بچت، خیرات سب برباد کر دی ہیں، اس کی بیوی نے بھی اسے برا بھلا کہا، اس نے کہا کہ یہ وہ میڈوف نہیں جس سے میں نے شادی کی تھی، اور آخر میں میڈوف نے سزا سننے کے بعد اپنے بیٹے کو سائڈ پر لے جا کر کہا:

ALL JUST ONE BIG LIE...

ایک درست فیصلہ، مجرم کو درست سزا، کتنی نسلیں سدھار سکتی ہے۔

مجھے یہ فراڈ پڑھنے کے بعد اپنے ملک میں ہونے والے پے در پے فراڈ یاد آئے، جنہیں ملک کے عوام یوں ہضم کرتی ہے جیسے ساتھ میں چھولا دے دیا گیا ہو، عدالتیں یوں غائب کرتی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ حکومتیں اس میں سے اپنا حصہ یوں لیتی ہیں جیسے ان کا حق ہو مہران بنک کا سکینڈل۔۔جس میں عوام کا پیسہ استعمال ہوا رشوت دینے میں۔۔کسے؟ عوام کے نوکروں کو (سیاست دانوں کو)، دی کس نے؟ عوام کے محافظوں نے، مقصد کیا تھا؟ عوامی کو حکومت کو گرا کر دوبارہ الیکشن کرانا، اس ساری تفریح کیلئے سوچ میلے کیلئے لوگوں کی جمع پونجی ڈبو دی گئی۔۔ ہمارے پاس Madoff کی کمی

نہیں ہے۔ تاج کمپنی کا سکینڈل کون بھولا ہوگا؟ فنانس کمپنی کے نام پر کئی لوگ لٹ گئے، بیواؤں کا پیسہ، ریٹائرڈ لوگوں کا پیسہ۔۔ ان کی ساری عمر کی کمائی، سب فراڈ یے دندناتے پھرتے ہیں وہ لوگوں کو ایسی جنت میں پھرتے نظر آتے ہیں کہ ہماری جوان نسلیں اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ کام کام میں کچھ نہیں رکھا، محنت ایک لعنت ہے شارٹ کٹ زندہ باد، کیونکہ پاکستان میں کوئی ایسا نظام نہیں جو ایسے لوگوں کو عبرت کی نشانی بنا سکے، میڈوف کی سزا کے بعد ایک عورت نے بہت غصے سے کہا کہ یہ اس لیے لوگوں سے پیسے چھینتا رہا ہے کہ یہ اور اس کی بیوی عیش کی زندگی گزار سکیں۔۔ اپنی اچھی زندگی کے لئے دوسروں کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔۔ اور ہم؟ ہم کیا دیکھتے ہیں؟۔۔ پانی اور بجلی تک لوگوں سے چھین لی گئی ہے، ہر جگہ، ہر موڑ پر لوگوں کیلئے ایک فراڈ کھڑا ہے۔ کیا یہ فراڈ نہیں ہے کہ ہم نے پچاس سالوں میں پانی کی یہ پلاننگ کی ہے کہ پانی کیلئے صرف دو reservoirs بنائے ہیں اور دوسری طرف چاینا جس کے پاس صرف انتیس تھے پچاس سال بعد انہوں نے 85000 تک نمبر پہنچا دیا ہے، یو این او کی رپورٹ کے مطابق پانی کی قلت کا شکار 60 ملک ہو نگے۔۔ جو عقل والے تھے تدابیر کرتے رہے جو بکنے بکانے، لٹنے لٹانے کے شغل میں مصروف رہے وہ اپنے لوگوں کیلئے جہنم کا انتظام کرتے رہے

KESC کو جب پرائیویٹائز کیا kanooz al watan ,73 pecent کو دے دیے گئے۔۔ جرمن منیجر نے جب کوئی لائحہ عمل تیار کیا تو اسے نامنظور کر دیا گیا۔ ترقی کے، بچت کے اور مستقبل کے منصوبوں کو یوں مٹی میں ملا دیا جاتا ہے کہ لگتا ہی نہیں کسی قوم کے بارے میں، کسی ملک کے بارے میں، یا خالی کسی انسان کے بارے میں پالیسی مرتب ہو رہی ہے۔ یوں لگتا ہے زمین میں رینگنے والے کیڑے ہیں جن کے مستقبل کا فیصلہ ہو رہا ہے اور جو فیصلہ کر رہے ہیں ان کے سر پر تاج اور پیٹھ کے نیچے تخت ہے، جن کی پوری نسلوں کا مستقبل کیڑوں کا ملیدہ بنانے میں پوشیدہ ہے میڈوف کو ایک سو پچاس سال کی سزا اس لیے دی گئی کہ اس کا جرم قتل سے بھی زیادہ سے سمجھا گیا کہ لوگوں کو روزی سے کھیلنا، انہیں سسکتی موت کی طرف دھکیلنا ہوتا ہے، اور کیا کہوں اور کیسے کہوں

ہمارے ملک میں عام لوگ دولت کے بل پر دولت کا فراڈ کر کے عیش کی ایسی زندگی گزارتے ہیں کہ ایمان والے اپنا منہ نوچتے رہ جاتے ہیں ان کے حصے میں لوڈشیڈنگ، پانی کی قلت، روٹی کی گرانی، مصائب کی فروانی اور اسکے علاوہ اور کوئی عیاشی نہیں پہنچتی، ہمارے زرداری صاحب جو پاکستان کے گیارہویں صدر ہیں اور جو امارت میں پاکستان کے پہلے پانچ امیر ترین اشخاص میں شامل ہوتے ہیں ان کی جائیداد میں اس ملک کے غریب عوام کی ایک بڑی تعداد میں خون اور بوٹیاں شامل ہیں، سنا ہے جب کتا پیٹ بھرنے کے بعد بھی بھونکتا رہے تو وہ اپنے بچوں کیلئے روٹی کا انتظام کر رہا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ملک کا یہ حکمران طبقہ۔۔ نہ جانے کس کس کی عیاشی کیلئے اتنی دولت اکٹھی کر رہا ہے، اور ایک سو پچاس سال کی سزا پانے والا میڈوف بدقسمت ہے کہ وہ پاکستان میں پیدا نہیں ہوا، ورنہ جس ملک کا صدر لوگوں کا خون چوس کر عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہو۔۔ وہاں انسان کتنے خودمختار ہونگے دوسرے انسانوں کا خون چوسنے کیلئے۔ لوگ جب سینہ تان کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے کروڑ پتی میڈوف کو کہا۔ کیا تم نے اس لیے اتنے لوگوں کو کنگال کیا کہ تم اور تمہاری بیوی خوش رہ سکے؟ کتنا حیران تھے اور کتنا ناقابل معافی جرم تھا یا امریکی انسان کے نزدیک۔

دنیا کا ایک کنارہ وہ ہے اور دوسرا کنارہ جس پر لکھتے لکھتے رکنا پڑ رہا ہے کہ وہاں ہونے والی کرپشن پر کتنا لکھوں، اس کنارے بسنے والے لوگ نہ جانے کب سے اپنی دولت، اپنی محنت، اپنی قابلیت پر پاکستان کے چند کنبوں کی کفالت کر رہے ہیں، بار بار لٹتے ہیں white collar criminals سے مگر خاموش رہتے ہیں۔۔ بولنا جانتا نہیں۔۔ اسے قسمت کا لکھا، خدا کا دین سمجھتے ہوئے سینے سے لگاتے ہیں صرف اتنا کہتے ہیں، (تقدیر کی اندھی گردش نے جو کھیل کھلائے کھیل چلے۔۔۔) اس کنارے بسنے والے لوگ انسانی ضرورتوں سے نجانے کب ہاتھ دھوئے بیٹھے ہیں۔۔ یا دھو رہے ہیں، اور اب تو سچ مچ میں اس کنارے بسنے والے لوگ بک رہے ہیں، ان کی لاشوں کے بدلے چند خاندانوں کی سیکورٹی کا انتظام ہوتا ہے، ان کی بھوک کے صدقے

گوشت کی دیگیں چڑھتی ہیں اور ان کی پیاس کے بدلے شراب خانوں میں محفلیں جمتی ہیں، لوگوں کے آنسوؤں کے بدلے ان کے سوئمنگ پول پکے ہوتے ہیں اور غریبوں کے گھروں میں پھیلے اندھیرے کے صدقے ان محلوں میں روشنی کبھی کم نہیں ہوتی۔

جگہ جگہ میڈوف بکھرے پڑے ہیں، مگر ان کا نصیب ایک سو پچاس سال کی سزا نہیں، لوگوں کی لعنت ملامت نہیں، جج کی جھاڑ نہیں، جیل کی صعوبتیں نہیں، خالی ہاتھ نہیں۔۔ بلکہ عزت ہے، احترام ہے، عہدے ہیں، دنیا کے حسین رنگ ہیں، عیش بھی، جن کے گھر نہیں محل ہیں۔۔ جن کے باورچی خانے نہیں پورے ہوٹل ہیں، جنہیں لوگ سیلوٹ کرتے ہیں، اور جن کا مرتبہ بہت اونچا ہے اور جو ایمانداروں کے منہ پر بڑے زور کا طمانچہ ہیں، اور میڈوف بڑا بدقسمت ٹھہرا امریکہ میں پیدا ہوا۔۔ پاکستان میں ہوتا تو آج جیل کی بجائے ایوانِ صدر میں ہوتا، اور دنیا اس کے آگے جھکی ہوتی، اور وہ دنیا کے امیر ترین آدمیوں کی فہرست میں کھڑا ہوتا ہے۔۔ کالر اونچے کر کے کھڑا ہوتا۔

☆☆☆

حنوط کی ہوئی ایک فاختہ

29 مئی کو جب نارتھ کوریا نے دوسرا ایٹمی میزائل ٹیسٹ کیا، تو واشنگٹن سے اسے بھی وہی دھمکی موصول ہوئی، جو 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو اور 1998 میں نواز شریف کو مل چکی تھی، لیبیا کے سابق صدر معمر قذافی لکھتے ہیں: کہ امریکہ کے اس وقت کے سٹیٹ سیکرٹری ہنری کسنجر نے بھٹو کو کہا تھا: اگر ایٹم بم بنا تو عبرت کا نشان بنا دیں گے۔۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ پاکستان ایک منفرد ریاست ہے جس کی بنیاد اسلام ہے، اسلام کے بغیر پاکستان کچھ بھی نہیں، اسرائیل یہودیت اور پاکستان اسلام پر بنا تھا۔ اور یہ دونوں نظریاتی ریاستیں ہیں، صرف مذہب پاکستانیوں کو متحد کر سکتا ہے اور یہاں کے لوگ بنیاد پرست اس لیے ہیں کہ ان کا ملک مذہب کے نام پر بنا تھا اور یہی ان کی شناخت ہے۔

1971ء میں بھارت کے مداخلت کی بنا پر جب پاکستان کو اپنا ایک بازو علیحدہ کرنا پڑا تو یہ احساس تقویت پکڑ گیا کہ پاکستان کو مزید کسی اسی قسم کے دھچکے سے بچنے کیلئے ایٹمی قوت بننا پڑے گا، چنانچہ بیلجیم سے ڈاکٹر قدیر نے بھٹو صاحب کو خط لکھا۔ اور یوں بھٹو نے امریکی دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا فیصلہ کیا اور ان کے یہ الفاظ تاریخ کا حصہ بن گئے ۔ گھاس کھائیں گے مگر ایٹمی طاقت بن کر رہیں گے۔ بعد ازاں تاریخ کی گواہی میں بھٹو صاحب اپنے ہی مسلمان اور پاکستانی جنرل کے ہاتھوں عبرت کا وہ نشان بنائے گئے جس کا وعدہ امریکہ نے ان سے کیا تھا۔:

فسادِ شہر میں لوٹا گیا تھا میرا گھر

سمن بھی کورٹ کا میرے ہی نام آیا

یہ اور بات ہے کہ بھٹو صاحب کا وعدہ بھی پورا، قوم گھاس کھا رہی ہے اور یہ ایٹمی طاقت بننے کے نتیجے میں نہیں بلکہ ان کے داماد کو حکومت دینے کے نتیجے میں ہے۔ یہ تو ایک اور کہانی ہے 1980ء میں رونالڈ ریگن نے اس ضمن میں خاموش اختیار کیے رکھی کیونکہ ضیاء الحق اور پاکستان کی اسے افغانستان میں روس کے خلاف لڑنے کیلئے ضرورت تھی، مگر 1990 میں پاکستان پر ایٹم بنانے کی سزا میں sanctions لگا دی گئیں، اور f-16 جن کی ادائیگی پیشگی بھی پاکستان پیش کر چکا تھا اور اس کی سپلائی روک دی گئی۔۔

کرفیو زدہ تھا شہر ، گرفتاریاں تھیں عام

قاتل کا لفظ اس نے مرے گھر پہ لکھا دیا

(محسن کمال)

1990ء میں ہی شہزادہ سلطان سعودی عرب نے پاکستان کے نیوکلیئر پلانٹس کا دورہ کیا، اور غالباً سعودی عرب کیلئے بھی نیوکلیئر پاور کی ڈیل کی، جب 1998ء میں انڈیا نے اپنے نیوکلیئر ٹیسٹ کیے تو اسے تو کچھ نہ کہا گیا مگر BRUCE RIEDEL(FORMER CIA OFFICER) کے مطابق کلنٹن نے نواز شریف حکومت 2 بلین ڈالرز کی آفر کی کہ وہ ایٹمی دھماکے نہ کرے اور بروس کے مطابق ابھی ہم لوگ پاکستان کے دورے پر ہی تھے کہ نواز شریف نے دھماکے کر دیے اور اس نے نعرہ دیا۔

newclear ۔۔ نکالی اصلاح نئی ایک کے کر تبدیل جسے کے nuclear vision

vision۔ اور یوں نواز شریف کا دورِ اقتدار بھی اسی سال رخصت ہو گیا اور اس کے پیچھے بھی اپنا ہی مسلمان، پاکستانی جرنیل تھا۔۔

نارتھ کوریا نے پہلا دھماکہ 2002 میں کیا تھا اور امریکہ کے 37000 فوجی ساؤتھ کوریا میں بیٹھے

تھے روز، چین نارتھ کوریا کی پشت پناہی پر تھے، نارتھ کوریا نے بات چیت اور six power talks کے بعد خاموشی رکھی مگر اس سال اس نے پھر اپنے ایٹمی ٹیسٹ کر چھوڑے، امریکہ پیچ و تاب کھا رہا تھا کیونکہ واشنگٹن نے نارتھ کوریا کو axis of evil and an outpost of tyranny کے القابات سے نواز رکھا ہے۔ امریکہ اور ساؤتھ کوریا کے حساب سے نارتھ کوریا ایک شیطان ملک ہے۔۔۔ امریکہ اور اسرائیل کے حساب سے ایران ایک جذباتی شرارتی بچہ ہے ۔۔۔ امریکہ اور بھارت کے مطابق پاکستان ایک غیر ذمہ دار، غیر جمہوری اور بنیاد پرست ایٹمی طاقت ہے، چنانچہ امریکہ اپنے اپنے محبوب ممالک کے پشت پر کھڑا ہے جو خود بھی ایٹمی طاقتیں ہیں مگر چونکہ وہ امریکہ کی ہر دلعزیز ہیں لہذا سمجھدار ہیں اور۔۔۔ صاحب جی چاہ رہے ہیں کہ شرارتی بچوں کے ہاتھوں سے ایٹمی طاقتیں چھین لی جائیں۔۔۔ اور قتیل شفائی نے تو سلامتی کونسل کے بارے میں کہا تھا، مگر میں امریکہ کے بارے میں اسے زیادہ درست تسلیم کرتی ہوں۔۔

تلاشِ امن میں نکلے تو ایک جنگل میں
حنوط کی ہوئی اک فاختہ ملی ہم کو

امریکہ کی دنیا میں امن قائم کرنے کی خواہش بڑی بناوٹی اور خلوص سے پاک ہے، امریکہ کے دوغلے معیار دنیا کو پر امن جگہ بنانے کی بجائے ایک گھنا اندھیرا جنگل بنا رہی ہے جہاں پر سحر پھوٹنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے ، نارتھ کوریا کو روکا جا رہا ہے ، پاکستان کو NPT(nuclear non proliferation treaty) اور CTBT(comprehensive test ban treaty) پر دستخط کرنے کو کہا جاتا ہے اور دوسری طرف انڈیا کو 2005ء میں نیوکلیئر آفر کی جاتی ہے، اور یہی موقعہ پاکستان کو نہیں دیا جاتا، بلکہ پاکستان کو نہ صرف اپنے مقصد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ پھر اس کے بعد اس کے ہاتھ باندھنے کی کوشش کی جاتی ہے، جیسے کسی غلام کو اتنی ہی آزادی ہو جتنا اس کا مالک حکم کرے اور اس کے بعد پھر اسے باندھ کر بٹھا دیا جائے ، میں انڈیا کے ایک سابق آئی ایس آفیسر BAHUKUTUMHI

RAMAN کا ایک مضمون پڑھ رہی تھی جس میں اس نے امریکہ کو تنبیہ کی ہے کہ شمالی کوریا نے جو دھماکے 25 مئی کو کیے ہیں اور ان کا سختی سے نوٹس لیں کیونکہ ایران بہت غور سے شمالی کوریا کے دھماکوں پر واشنگٹن کا ردعمل دیکھ رہا ہے اور اگر امریکہ نے نرمی سے کام لیا تو تہران کے حوصلے بلند ہو جائیں گے، اور مزید لکھتا ہے کہ یہ وقت ایران کو یہ پیغام دینے کا نہیں کہ امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات کھوکھلے ہو رہے ہیں، ایران کے ساتھ امریکہ اپنے تعلقات بے شک بڑھائے مگر اسرائیل کے ساتھ تعلقات کی قیمت پر نہیں۔ یوں تو دیکھا جائے ایٹمی طاقت کا یہ کھیل امریکہ نے خود 6 august 1945 کو جاپان کے جزیرے ہیروشیما اور پھر ناگاساکی میں شروع کیا۔ آج وہ کس منہ سے امن کی بات کرتا ہے اور کیسے کسی اور ملک کو غیر ذمہ دار یا نا سمجھ کہہ سکتا ہے۔۔ جب اس نے خود اتنی بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت پوری دنیا کو دے دیا ہو۔

آج بھی امریکہ بھی اپنے مفادات کی خاطر ملکوں کو ڈھیل دیتا ہے، کوئی ایٹمی طاقت بن رہا ہے تو آنکھیں بند کر لیتا ہے اگر اسے اس ملک سے مطلب ہے تو۔۔ نہیں تو پھر کسی بھی چیز کو وجہ بنا کر شور مچا دیتا ہے، دنیا میں جو اندھیرا بڑھ رہا ہے اور وحشت کی چادر تنتی جا رہی ہے اس کی وجہ ہی امریکہ کا دوغلا پن ہے، اگر ایٹمی طاقت نہیں بننا تو کوئی بھی نہ بنے۔۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا ہے کہ طاقتور ہمسایہ تو ایٹمی بھوت بن جائے اور چھوٹا غریب اسی انتظام میں تھر تھر کانپتا رہے کہ کب اس کو غصہ آئے اور کب مجھے بھسم کر دے، شیخ سعدی کی ایک حکایت ہے کہ جب بلی خوفزدہ ہوتی ہے تو اپنے آپ کو بچانے کیلئے شکاری پر پہلے جھپٹ جاتی ہے یہ اس کی وہ بہادری ہے جو موت کے سامنے دیکھ کر آخری حربے کے طور پر استعمال ہوتی ہے، تو چھوٹے ملکوں پر بھی نادان بہادری کا ٹھپہ اس لیے باآسانی لگ جاتا ہے کہ یہ چھوٹے ملک اپنے بقاء کیلئے دھماکے کرتے جاتے ہیں۔۔ ایٹمی طاقت بنتے جاتے ہیں، بڑے اور طاقتور دشمن کو بتانے کیلئے کہ مجھے تر نوالہ نہ سمجھنا۔۔ پلٹ پلٹ کر جھپٹتے ہیں، تو اس وقت امریکہ کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ ان ممالک کو جو اپنے بقا کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، انہیں یہ یقین دلائے کہ وہ محفوظ ہیں اور یونہی کوئی مگرمچھ انہیں نہیں نگل سکتا، اگر دنیا

میں یقین کی یہ حالت ہو جائے تو کوئی چھوٹا ملک پاگل نہیں کہ اپنے بچوں کے منہ کی روٹی چھین کر ایٹم بم بناتا جائے، بڑے ممالک کو غنڈہ گردی سے روک کر انہیں نتھ ڈالنے کی ضرورت ہے نہ کہ چھوٹے چھوٹے پہلے سے خوفزدہ ممالک کو مزید ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہے اور وہ غریب کہتے ہیں۔

کیا جانے کیوں مجھی پہ رہی وقت کی نظر
ہزار زاویے سے میری ہی تصویر لی گئی
جس ناگوار بات کا وارث کوئی نہ تھا
وہ بات میرے نام سے منسوب کی گئی۔

جیو اور جینے دو۔۔ایسے ہی نہیں کہتے۔۔اس چھوٹی سی بات میں کتنی حکمت ہے کاش۔۔معاشرے کے افراد سے لے کر ممالک کے سربراہوں کو سب کو پتہ چل جائے۔اور یہ دنیا رہنے کی جگہ بن سکے ،خوف سے نجات ملے اور امن کو بول بالا ہو ،موسم بہار لوگوں کو نصیب ہو،اور اس دنیا میں بھی وحشت کی رات چھٹنے کے بعد امن کی سحر ہو،اور یہ میرے خیالوں میں تب ہی ممکن ہے اگر امریکہ چھوٹے چھوٹے ملکوں کے ہاتھوں میں امن کی فاختہ پکڑانے کی بجائے، بڑے ملکوں کو مل جل کر جینے کا قرینہ سکھادے۔

☆☆☆

بھوت

مجھے ڈاکٹر عافیہ کے ٹرائل سے پہلے اور بعد میں بہت ایک میلز آتی رہیں ۔ جن میں سے زیادہ تر پاکستانی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی تھی ۔ جن کی عمریں انیس سال سے پچیس سال ہونگی۔ ہر ای میل میں مختلف سوالات تھے مگر جن کا تانا بانا ڈاکٹر عافیہ کی قسمت، اس کے قصور اور اس کی سزا پر جا کر ٹوٹتا تھا ۔ ڈاکٹر عافیہ کے ٹرائل سے پہلے فیس بک کے ان باکس میسج میں لاتعداد پیغامات تھے ۔ پاکستانی جوان نسل، جن میں لڑکیاں بھی ہیں اور لڑکے بھی ۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھ رہے تھے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ۔ ڈاکٹر عافیہ رہا ہو جائے گی؟

میں جانتی تھی ایسا نہیں ہوگا ۔ اگر وہ رہا ہوتی ہے تو اس پر جانوروں والے تشدد کی کیا وجہ دے گی؟ دنیا کی سب سے پر امن اور مہذب قوم؟ مگر میں ان باکس پر، ای میل پر خاموش ہوں ۔ میرا دل ڈر رہا تھا ۔ میں اس موضوع سے بہت دور بھاگنا چاہتی تھی ۔ مگر پھر ایک پیغام آتا ہے ۔ آپ تو نارتھ امریکہ میں ہیں آپ کو وہاں کے قانون تو پتہ ہی ہونگے، وہاں انسان کے بڑے حقوق ہیں ۔ لگتا ہے ڈاکٹر عافیہ رہا ہو جائے گی ۔ ۔ ہے نا! ؟ اور امید بھری اس ای میل کو جواب دیے بغیر میں ڈیلیٹ کر دیتی ہوں ۔ پھر فیس بک پر ایک میسج آتا ہے ۔ ڈاکٹر عافیہ کو مشرف نے پکڑوایا تھا نا؟ میں کہنا چاہتی ہوں نہیں ۔ ۔ کوئی انسان جس پر اپنے ملک کی حفاظت کی ذمہ داری ہو ایسا نہیں کر سکتا ۔ وہ تو انسان بھی تھا اور حکمران ۔ مگر میرے پاس ایسا کہنے کی کوئی وجہ نہیں ۔ وہ پاکستانی جوان اگلی ای میل میں ثابت کر دے گا کہ مشرف کے دورِ حکومت میں اور کراچی کی عظیم منظم سلطنت سے بیلا وارث خاتون اٹھائی گئی ۔ میں اس ڈر سے خاموش ہو جاتی ہوں ۔ فیس بک کا یہ میسج بھی ڈیلیٹ ہو گیا ۔

ایک اور پیغام ہے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر عافیہ نے کیا کیا ؟ اسی کو کیوں پکڑا ۔ اس کا جواب دینے میں بھی میں خاموش ہوں ۔ کیوں کہ اس کا جواب ہمارے پڑھے لکھے دانشور بہت خوب دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کیا ضرورت تھی اسے اسلامی پرچے بانٹنے کی ، اسلام پھیلانے کی ۔ وہ بچہ مجھ سے گستاخی سے پوچھ سکتا ہے میں نے تو سنا ہے عیسائی پادری امریکہ اور کینڈا میں گھر گھر جا کر تبلیغ کرتے ہیں ۔ بہت سا چھپا ہوا مواد لوگوں کے ہاتھوں میں تھاتے ہیں تو کیا وہ دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتا ۔ میں اس کی گستاخی کے خوف سے یہ میسج بھی ڈیلیٹ کر دیتی ہوں ۔ ٹرائل ہو گیا ۔ ملزم مجرم قرار دے دی گئی ۔

میں اس موضوع پر نہ زیادہ پڑھ سکی اور نہ سوچ سکی ۔ ریڈلی برٹش صحافی جو بار بار چلاتی ہے ۔ جس نے سب سے پہلے اس گرے لیڈی کو کھوجا ، اس کی چیخیں عوام تک پہنچائیں ۔ اور سلام ہے عمران خان کو ، جس نے حسبِ معمول دیدہ دلیری سے کام لیا اور اس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر پریس کانفرس کی ۔ اس پریس کانفرس میں سو تک صحافی تھے ۔ اس کانفرس سے نکلتے ہی نوے فی صد صحافی دانشور بن چکے تھے ۔ وہ عقل و دانش کی باتیں کرنے لگ گئے ۔ جیسے مجھے ایک دانش ور نے کہا ، امریکہ کے قبائلی علاقوں ، سکولوں اور عام گھروں پر ڈرونز اٹیک بالکل جائز ہیں ۔ طالبان جیسے جنگیوں کو مارنے کے لئے ایسا ہی کرنا چاہیئے ۔ میں نے ان سے دو سوال پوچھے تھے ۔ اگر ایک سکول یا کالج میں ان کی بیٹی یا بیٹا ہیں ، وہاں طالبان گھس جاتے ہیں تو کیا وہ اسی جذبے کے ساتھ امریکہ کو کہیں گے آؤ اور میرے بچے کی جان کے عوض میری قوم کو طالبان سے نجات دلا دو ۔ چاہے میرا بچہ مر جائے ، مگر میں یہ قربانی دینے کو تیار ہوں ۔ وہی قربانی جو آپ غریب ، عام اور ان پڑھ دیہاتی سے مانگ رہے ہیں ، جو جانتا بھی نہیں آئیڈیلوجی کیا ہے ، سوشلزم اور سیکولرزم کیا ہے ۔ جس کی زندگی آٹے دال اور روٹی میں پھنسی ہے ۔ اس سے جو قربانی مانگ رہے ہیں ۔ ۔ مانگ بھی نہیں بلکہ اس پر جو قربانی مسلط کر رہے ہیں ۔ وہ آپ خود دے سکتے ہیں ؟ ۔ اگر اس کا جواب ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ میں ہے تو مجھے ڈرونز پر کوئی اعتراض نہیں ۔

اور دوسرا سوال تھا۔ اگر آپ کی بچی کسی کا قتل کردے اور آپ کو معلوم بھی ہو کہ وہ قاتل ہے تو کیا آپ اس تشدد کا ہزارواں حصہ بھی اپنی بیٹی کے لئے تجویز کریں گے یا اس سزا پر صبر کریں گے، جو اس نیورو الجسٹ، نازک سی ایک بیٹی، ایک ماں پر ہوا۔ آپ اپنی بیٹی کی ایک انگلی اس کے ایک کنفرم، ثابت شدہ جرم پر توڑ کر دکھا دیں۔ اور یہاں آپ بغیر ثبوت کے، بغیر جرم کے ثابت ہوئے، ان دیکھے جرم پر، ان کہی بات پر، ایک عورت کو کسی روئی کی گڑیا کی طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا گیا ہے، اس کا پانچ ماہ کا بچہ مر چکا ہے، ایک بچہ کن اذیتوں سے گذرتا ہوا وہاں پہنچا ہے، ایک ابھی بھی غائب ہے۔ اور آپ دانش اور حکمت کی کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔ اسلام اور عیسائیت کے سنہرے اقوال زریں لوگوں کو سنا رہے ہیں۔

امن کی جنگ جنگ سے نہیں جیتی جاتی۔ میں نے اپنے بچے کو پیار اور محبت کا درس دینا ہے تو میں اسے ڈنڈے مار مار کر یہ درس نہیں دے سکتی۔ امریکہ نے دنیا کو امن کی جگہ بنانا ہے تو وہ یہ کام ڈنڈے کے زور پر نہیں کر سکتا۔ آج عافیہ پر ظلم پر دنیا خاموش ہے تو کل یا پرسوں اس کا بیٹا، جس نے اپنی آنکھوں سے یہ ظلم دیکھا اور سہا ہے۔ بڑا ہو کر کون گواہی دیتا ہے کہ وہ دنیا کو آگ میں جھونکنے کی کوشش نہیں کرے گا؟ اپنی آنکھوں کے سامنے ماں کے برہنہ جسم کو بے حرمت ہوتے دیکھ کر۔ کیا امید کرتے ہیں ہمارے دانشور کہ وہ امن کی بات کرے گا؟۔ اس دنیا کو محبت دے گا؟۔ پیار کے پھول کھلائے گا؟۔ جس کی آنکھوں میں انگارے اور روح میں کانٹے اتارے جا رہے ہیں۔ وہ میرے محترم دانشوروں، بڑا ہو کر لوگوں کی آنکھوں میں آگ لگا دے گا۔ ببول کے پیڑ سے آم نہیں نکلتے۔ امریکی کو مارو تو دہشت گردی۔ پاکستانی مرے تو انصاف۔ دوش امریکہ کا نہیں، ہمارے دانشوروں کا ہے۔ جو ایک نقطے پر متفق نہیں۔ جو خود غرضی میں اتھڑے اپنے آپ کو ماڈرن ثابت کرنے کے لئے لوگوں کے، اپنے پاکستانیوں کے کرب سے ناواقف بن جاتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے موتوں اور اذیتوں پر ایسے ایسے پر مغز آرٹیکل لکھتے ہیں کہ دل ان کی سرد مزاجی پر تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔

حیرت تو مجھے جب ہوتی ہے جب امریکہ اور کینیڈا کے انسانی حقوق پر بات کرنے والے، پڑھے لکھے لوگ بھی امریکہ کی ایسی حرکتوں پر حیران رہ جاتے ہیں اور اپنے غم وغصہ کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مگر سلام ہے پاکستانی دیسی گوروں پر جو اپنی وفاداریوں میں ایسے پکے ہیں کہ وہ امریکہ کی بڑی سے بڑی بربریت کو بھی ایسی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور تب اس مقولے پر یقین آتا ہے کہ محبوب کی کوئی چیز بری نہیں لگتی۔ اگر ان دانشوروں کو پانچ منٹ دے دیے جائیں تو یہ امریکہ کا ہیروشیما پر جو حملہ تھا اسے بھی درست ثابت کر دیں گے۔ ساڑھے تین لاکھ کی عام آبادی والے شہر کو دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے والی سپر پاور نے منٹوں میں راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا۔ لوگ اس میں یوں جھلس گئے تھے جیسے تپتے تندور میں درخت سے گرنے والے پتے۔ یہ ایسا ظلم تھا اور ایسا فیصلہ تھا، جس پر امریکی عوام بھی حیران و پریشان رہ گئی تھی۔ اور آج تک اس پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں کہ وہ کیوں کیا تھا۔۔ اس کی توجیہیں ڈھونڈی جاتی ہیں، اپنے فیصلے کو درست ثابت کرنے کے لئے کیا کیا جتن ہو رہے ہیں۔

یوں لگتا ہے امریکی حکومت تو نہیں امریکی عوام اور اس کے دانشوروں کے ضمیروں پر بوجھ ہے۔ وہ کتابیں لکھ لکھ کر اس بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عراق، افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں عام شہریوں کی موت سے گھبرا کر امریکہ کا حساس، انسانیت پرست دانشور طبقہ تڑپ اٹھتا ہے۔ مگر پاکستانی دانشور۔۔ ماڈرن دانشور۔ آج ان کی دانش کا معیار ہی یہ ہے کہ پاکستان کے اندر ہونے والی موتوں کو، ظلم کو بڑے سلجھے طریقے سے، مہذب انداز سے لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ بہت خلوص سے پاکستانیوں پر ظلم کو پاکستانیوں کے لئے ہی نجات ثابت کرنا۔ امریکی بے جا ظلم کو تہذیب کا لباس پہنانا، اور طالبان کی جاہلیت کو اجاگر کرنا۔

ٹیکنالوجی میں آگے، تہذیب کے سب سبق پڑھے امریکہ کے آگے، اچھائی اور برائی دونوں کی آپشن ہوتی ہے۔ مارنا اس کی ذاتی چوائس ہے۔ طاقتور کے ہاتھ میں ایک ان دیکھی لاٹھی ہوتی ہے۔ اپنی چوائس کی۔۔ کمزور کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا، کوئی آپشن نہیں ہوتی، کوئی دو

راستے نہیں ہوتے ۔ایک راستہ ہوتا ہے۔جس پر اسے چلنا ہوتا ہے،یا جس پر اسے چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔طاقتور کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔وہ با اختیار ہوتا ہے۔تو بس دانشوروں سے یہی پوچھنا اور کہنا ہے۔۔بلی کو جب اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ شیر پر بھی جھپٹ پڑتی ہے۔ چھوٹے ملکوں کی ان بلیوں کو زندگیوں کا یقین دلانا شیر کا کام ہے۔پھر یہ جھپٹا جھپٹی ختم ہو سکتی ہے۔ امن کا راستہ امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔کسی طالبان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ پہاڑوں میں،جنگلوں میں رہنے والوں کو آپ امن سکھانا چاہتے ہیں تو ان میں تعلیم عام کریں۔

ہمارے دانشور وہاں جا کر ان کو تعلیم دیں ۔جس دن ان بند دماغوں میں علم کی روشنی پہنچ گئی ۔انہیں بھی دنیا میں سر اٹھا کر جینا آ جائے گا ۔ورنہ آپ کی حکمت کی باتیں اور ایک ڈرون مارنے کے بعد امریکہ کی امن کی بات ان کے اخروٹ دماغ میں نہیں آئے گی ۔ڈاکٹر عافیہ کی جو تاریخ لکھی جا رہی ہے اس سے آگے جو بھی راستہ جاتا ہے۔جس پر اس کے بیٹوں کو چلنا ہے وہ امن کا نہیں ہو سکتا۔کل کو عافیہ کے بچوں میں سے جنہوں نے اپنی ماں پر تشدد ہوتے دیکھا ہے،وہ کھڑے ہو کر امریکہ کے چار بندے مار دیں تو اس پر کس کو حیرت ہوگی؟ وہ نوجوان جو پاکستان سے مجھے ای میل کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔۔کیا مشرف نے عافیہ کو امریکیوں کے حوالے کیا۔؟ اپنے سوال کا ہاں میں جواب ملنے کے بعد وہ جوش میں،(انیس و رپچیس کی عمر ہی ایسی ہوتی ہے) مشرف یا اس سے ملتی جلتی شکل جو زرداری کی بھی ہو سکتی ہے حسین حقانی کی بھی اور الطاف حسین کی بھی،مار دے۔تو اس پر کسی کو حیران ہونا چاہیے؟،میرا ہاتھ ہلکا سا جل گیا،میری گردن پر معمولی سا بل پڑ گیا،میرے سر میں درد سی محسوس ہوئی،میرے بچے کا میرے سامنے آنسو نکل آیا،میں تو ان باتوں پر بڑا درد محسوس کرتی ہوں،ہم سب ایسے ہی ہیں نا؟۔تو کیا ہم اس قابل ہیں کہ عافیہ،اس کی ماں یا اس کے بچوں پر بیتے ظلم پر بات کر سکیں؟ ہماری اتنی اہلیت نہیں ہے۔اپنے ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہو سکتی ہیں،یہ باتیں کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔اس لئے میں شرمندگی سے ہر ایسی ای میل،ایسا پیغام ڈیلیٹ کر دیتی ہوں۔

کینیڈا میں بہت دانشور بیٹھے ہیں، بہت سمجھدار لوگ ۔۔ کاش وہ میری تسلی کرا سکیں کہ یہ ظلم بالکل ٹھیک ہوا ہے۔اور پھر میں یہ تسلی کے دو لفظ آگے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا سکوں؟ کاش ! اتنے مقام پر کوئی ہوتا ۔۔اور اس موضوع پر بات کرنے کا اہل ہوتا ۔ہم تو دنیا کے پر امن ملکوں میں بیٹھے پر امن زندگیاں گذار رہے ہیں ۔نظریات اور فلسفوں پر بات کرتے کرتے صبح کر دیں مگر اس ایک سوال کا جواب شائد ہم میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ۔۔ہگرام کا بھوت گرے لیڈی نہیں ہے۔ہم سب علم وعقل کے بھوت ہیں جو اپنے اپنے نظریوں سے چمٹے ہوئے ہیں ۔اور ایسے چمٹے ہیں کہ ہمارے کان نہ تو کسی کی چیخیں سنتے ہیں نہ آہیں ۔نہ ہی کسی کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی ہمیں کسی کے آنسو نظر آتے ہیں ۔اپنے اپنے نظریوں کے بھوت ہیں ہم اور کچھ بھی نہیں ایک دوسرے پر علمیت کا رعب جماتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ۔

ماتھے کی گھوری

پاکستان سے واپسی پر آج تک اتنی تھکاوٹ ہے کہ قلم اٹھ نہیں رہا، جسمانی تھکاوٹ تو مہینہ پہلے ختم ہو چکی ہے مگر ذہنی بوجھ کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اداسی ہے، دکھ ہے، نہ جانے کیا کیا ہے، اداسی تو شائد بہت سے پیاروں سے بچھڑنے کی ہوتی ہے۔ دکھ بھی بہت سی چیزوں پہ ہے، ایک ایک کر کے وہ دکھ یاد کرتی ہوں اور آپ کو ان میں شامل کرتی ہو۔ شائد یہ ہم سب کے سانجھے دکھ ہوں ائیر پورٹ سے گھر جاتے ہوئے میں اپنی بہن کے ساتھ بیٹھی تھی جو گاڑی چلا رہی تھی، ہم سے آگے میرا بھائی تھا جس کی گاڑی خالی تھی لوگوں سے مگر اس میں سامان تھا، خیر سارجنٹ نے اسے روکا اور کہا تمہارے شیشے کالے ہیں، یہ جرم ہے۔ سارجنٹ نے بہت insulting way سے یہ بات کی۔۔ اور اس سے بھی زیادہ برے طریقے سے بھائی نے اس جواب دیا، دونوں نے خوب تلخ کلامی کی، اور نتیجے میں نہ وہ چالان کر سکا اور نہ بھائی جان سکا کہ وہ کہاں غلط تھا۔ میں نے سوچا اگر بھائی اس کو آگے سے اتنا برا بھلا نہ کہتا تو شائد دونوں ایک دوسرے کو گالی گلوچ دینے کی کوفت سے بچ جاتے، میں نے بہن کو کہا یہ بھائی کو کیا ہو گیا ہے صبرے کیوں بات نہیں سنتا۔۔ بہن نے کہا ہاں یہ ایسا ہی ہو گیا ہے، تھوڑا آگے گئے تو بہن کی گاڑی کے آگے ایک اور گاڑی والا غلط ٹرن بنا تا ہوا آ گیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بغیر اپنی غلطی مانے، چلانا شروع کر دیا، اس نے دیکھا ایک عورت چلا رہی ہے اسے کیا پتہ رولز کیا ہوتے ہیں جیسے کہ اکثر پاکستانی مرد سمجھتے ہیں مگر بغیر عورت کا لحاظ

کیسے وہ اتنی بری طرح بولا کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا خبیث کے بچے غلطی تیری تھی اور تجھے کسی نے عورت سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی، وہ ایک طرف نکل گیا، ہم دوسری طرف۔۔ بہن بہت اونچی ہنسی، کہنے لگی تمہیں ایک دم کیا ہوگیا، تم تو ابھی بڑے صبر اور شکر کی تلقین کر رہی تھی۔ میں نے سوچا مجھے کیا ہوگیا تھا؟ میں تو ایسے کبھی نہیں بولتی۔۔ مگر ہوا کیا تھا، صرف یہ کہ جیسے بال کو دیوار پر مارو تو وہ اتنے ہی زور سے باؤنس کر کے واپس پلٹتا ہے تو میرا بھی وہ باؤنس ہی تھا۔ شائد بھائی کا بھی سارجنٹ کو باؤنس تھا، ہم سب ایک ایسے ردعمل کا شکار ہیں کہ خود سے سمجھ نہیں آتی کہ پہلے وار کون کرتا ہے کئی دفعہ کمزور بلی کی طرح اپنے دفاع میں وہاں کے لوگ حملے سے پہلے حملہ کر دیتے ہیں، جو چپ کر گیا وہ گیا، اگر سارجنٹ آرام سے بات کرتا تو شائد کچھ عزت پا لیتا، مگر اس کو نہ رکنے اور وہاں کھڑے ہو کر ذلت اٹھانے نے اتنا مجبور اور کمزور کر دیا تھا کہ اس نے آغاز ہی ماتھے پر گھوری ڈال کر کیا، بھائی جو اس ذلت سے کہ اس نے اسے روکا کیسے اور مخاطب کیسے کیا؟ بپھر گیا، ہر کوئی وہاں عزت نفس کی جنگ میں ہے اور پاکستان میں کامیاب اور پرسکون وہی ہے جس کے پاس عزت نفس نام کی چیز نہیں ہے۔

لوگوں کی ماتھے کی گھوری گہری ہے اور مسکراہٹ ناپید ہے، غربت مجھے نظر نہیں آئی، مجھے بازار بھرے ہوئے، اور کھانے پینے کے مقامات پر رونق نظر آئی۔۔ ہمارے لوگ غریب ہو گئے ہیں مسکرانے میں، مجھے کسی چہرے پر مسکراہٹ نظر نہیں آئی، شائد ہم لوگ طبعی طور پر محنتی لوگ ہیں اس لیے جس چیز پر زیادہ محنت درکار ہے جیسے غصے کیلئے بہت سے چہرے کے عضلات کو حرکت میں لانا پڑتا ہے، برعکس مسکرانے میں، جس کیلئے صرف دو عدد عضلات کو زحمت دینا پڑتی ہے، تو ہم زیادہ محنت والا کام کرتے ہیں، چلتے چلتے آپ کو بہت نظارے نظر آئیں گے، بہت اچھی طرح سے تیار ہوئے لوگ، آپس میں سڑکوں کے بیچ گھتم گتھا ہوئے ہوتے ہیں، گھر سے تیار ہو کر، خوشبوئیں لگا کر بیوی، بچوں اور والدین کو خدا حافظ کہہ کر آتے ہیں مگر بیچ سڑک پر جا کر نہ جانے کیا ہو جاتا ہے کسی کی چھوٹی سی غلطی یا اپنی غلطی پر دوسروں پر چڑھائی ہو جاتی ہے، یہ سب سسٹم بن گیا ہے، اگر

کسی کو آرام سے بات کرو تو وہ سنے گا ہی نہیں، آپ کو چیخ کر بولنا پڑتا ہے اپنی بات سنوانے کیلئے اور منوانے کیلئے بہت گالیاں دینا پڑتی ہیں بڑی بدکلامی کرنا پڑتی ہے۔

بچے جنہیں یہاں بہت پیار اور عزت سے بلایا جاتا، ہمارے پیارے دیس میں ان معصوموں کیلئے بھی مسکراہٹ ختم ہو گئی ہے، یہاں آپ کا بچہ کوئی حرکت کر دے تو آپ کم اور ارد گرد کے لوگ زیادہ خوشی مناتے ہیں، اتنی حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے آپ کا بھی اور بچے کا بھی، مگر وہاں بچے کو کسی دکان میں لے جائیں وہ غلطی سے کسی چیز کو ہاتھ لگا دے تو ایک نفرت بھری نگاہ اس پر پڑتی ہے ایک اوئے کی آواز آتی ہے، بچہ کم اور والدین زیادہ لرزتے ہیں، اپنا بچہ ایک وبال لگنے لگ جاتا ہے کسی کی چیز نہ توڑ دے، کسی کا بازو نہ مروڑ دے اسی ٹینشن سے میرے جیسے ماں باپ ادھ موئے ہو جاتے ہیں، وہ کیسی قوم ہو گی جن کی ماتھے کی گھوری کسی بچے کی پیاری سی شرارت سے بھی مدہم نہیں ہوتی، بچوں کیلئے بھی جن کی آنکھوں میں غصہ اور منہ سے اوئے ہی نکلے۔۔کیسی قوم ہو گی؟ میں سوچتی ہوں ترقی کرنا، غربت دور کرنا، خوشحالی لانا، تعلیم عام کرنا یہ سب تو بہت دور کی باتیں ہیں۔۔۔ہم آسان کام تو کریں، ہم مسکراہٹ تو عام کریں۔۔ہم اخلاق تو سیکھیں جو ڈگریوں سے نہیں محبتوں سے آتا ہے، جو حسد اور غصے کو مارنے کے بعد آتا ہے، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، حسد کی آگ میں جلنے، دوسروں کی عزت نفس کو کچلنے کے بعد جو ہماری شکل بنتی ہے تو پھر اس میں مسکراہٹ نہیں ہوتی صرف ماتھے پر ایک گھوری سی بن جاتی ہے۔۔جس نے ہم سب کی شکلوں کو بہت بدصورت اور ہمارے ملک کو بہت پسماندہ کر دیا ہے، میرے نزدیک غریب وہ نہیں جس کے پاس مال اور رتبہ نہیں بلکہ غریب وہ ہے جو مسکرا بھی نہیں سکتا، یہ غربت دور کرنا تو ہمارے بس میں ہے، عورتوں بزرگوں اور بچوں کو، اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو عزت دینا اور پیار دینا کیا اتنا ہی مشکل کام ہے کہ ہم کر نہیں سکتے؟

☆☆☆

میں اور میری امی

صبح صبح ایک دم پراٹھوں کی خوشبو سارے گھر میں پھیل گئی، ناشتہ بن رہا ہے، اٹھنے میں کاہلی ہے، رات بھر جاگنے سے صبح اٹھنے کو من نہیں کر رہا، پھر پراٹھوں کی خوشبو کے ساتھ ایک ملائم سی آواز پورے گھر میں پھیل رہی ہے، امی کی آواز، ناشتہ کر لو، ایک انگڑائی سارے بستروں پر نمودار ہوئی، واش روم کے دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازیں، پھر باورچی خانے میں کوئی پہلے اور کوئی بعد میں، مگر امی چولہے کے آگے تنی کھڑی ہیں، پراٹھے پر پراٹھا، کسی کیلئے آملیٹ انڈا کسی کے لیے فرائی ۔۔کسی نے اچار سے کھانا ہے۔اور مجھے ابھی بھوک نہیں، ہنگامہ جاری ہے، اس کے بعد سب چلے گئے ہیں باورچی خانہ ایک دم خالی ہو گیا ہے، کوئی کالج، کوئی سکول اور کوئی جاب پر، امی وہیں کھڑی ہیں، کام والی کو برتن دھونے کا سلیقہ بتا رہی ہیں ۔۔۔ہم سب پراٹھوں کی خوشبو سے بہت دور جاتے جا رہے ہیں، دور بہت دور، باہر ٹریفک کی کثافت ہے، آلودگی ہے، ہم سب کدھر گم ہو گئے، میری بہنیں، بھائی اور میں سب ماحول کی آلودگی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں امی وہیں کھڑی ہیں باورچی خانے میں اور ہم پراٹھوں کے خالص پن سے زمانے کی کثافت میں تحلیل ہو چکے ہیں حالانکہ ان کثافتوں سے دور رکھنے کیلئے ہی سخت گرمی میں گھر میں خالص مکھن سے پراٹھے بنائے جا رہے ہیں۔

میں کچن میں کھڑی ہوں، پراٹھے بنانے کی کوشش میں چولہے کے آگے تنی ہوئی ہوں، امی جیسے پراٹھے بناتے بناتے کئی دفعہ ہاتھ جل گئے ہیں، گھر میں پراٹھوں کی خوشبو نہیں پھیل رہی، بچوں کو

آوازیں دے رہی ہوں، اٹھو آجاؤ۔۔ناشتہ تیار ہے، مگر اپنی آواز مجھے خود سنائی نہیں دے رہی میرے کان میری آواز سن نہیں رہے اور میرا ناک خوشبو سونگھنے سے قاصر ہے۔۔کیونکہ میں چولہے کے ساتھ ہی کھڑی ہوں، میری بیٹی آنکھیں ملتی آتی ہے۔۔کیا خوشبو ہے مگر ابھی بھوک نہیں، بیٹا کہتا ہے آملیٹ، دوسرا بیٹا کہتا ہے فرائی انڈا، اور میں امی کی طرح سب کی خواہشوں کو پورا کرتے کرتے بار بار ہاتھ جلاتی جاتی ہوں، میری پلیٹ خالی ہے، سب کھا کر چلے گئے ہیں۔۔میں برتن ڈش واشر میں لگا رہی ہوں، کچن خالی ہے اور میں اب بھی کچن میں ہی تنی پھر رہی ہوں۔۔پھر ایک دفعہ رکتی ہوں اپنا ہاتھ جلا ہوا ہاتھ دیکھتی ہوں۔۔خود ہی اسے سہلا لیتی ہوں، کیونکہ اس وقت میں امی ہوں اور میری امی میرے پاس نہیں۔۔مجھے ان سے رخصت ہوئے بارہ سال ہو گئے ہیں۔۔ پراٹھوں کی خوشبو اور امی کی آواز اب میرے گھر کا حصہ نہیں ہیں۔۔آج خیال آیا میری ماں کا بھی ہاتھ جلتا ہو گا۔۔آج جا کر ان ہاتھوں پر اپنے ہونٹ رکھنا چاہتی ہوں، آج پتہ چلا ماؤں کے ہاتھ چپکے چپکے جلتے رہتے ہیں۔۔۔

صحن سے کھیلتے کھیلتے ایک دم سب اکٹھے ہو گئے ہیں، امی پیلے پیلے خربوزے کاٹتی جا رہی ہیں ایک ایک کو پکڑا رہی ہیں ہم سب کھا رہے ہیں، میٹھے میٹھے خربوزے، گرمی کے موسم میں اتنے مزیدار پھل میں بدل چکے ہیں کہ جس کا مقابلہ دو جہانوں میں نہیں، امی کے ہاتھ سے پکڑتے جاتے ہیں اور کھاتے جاتے ہیں، امی اپنے منہ میں ایک پھانک بھی نہیں ڈالتیں، سب ہمارے لیے ہے۔
ہماری صحت اس تاریخ کا مسئلہ ہے اور ہمیں خبر ہی نہیں۔۔

میں نے ایک برتن میں تربوز کاٹے ہیں، دوسرے میں ہنی ڈیو (خربوزہ) انہیں ٹی وی دیکھتے بچوں کے سامنے رکھ دیتی ہوں، ان کی صحت آج کی تاریخ کا مسئلہ ہے، چھوٹا بیٹا اپنے ہاتھ سے نہیں کھا رہا، میں اسکے منہ میں ڈالتی جاتی ہوں، وہ کہتا ہے امی تربوز کتنا مزے کا ہے، اور میں تربوز کے مزے سے لاپرواہ ہوں، آج کی تاریخ میں میری صحت مسئلہ نہیں ہے، کیونکہ میں امی ہوں۔۔اور اپنی امی سے دور آئے مجھے آج بارہ سال ہو گئے ہیں میرے ہاتھ پر چھوٹا سا کٹ ہے جو پھل کاٹتے

کاٹنے لگ گیا ہے، میں ہاتھ کے اس کونے کو خود ہی منہ میں ڈال کر سہلاتی ہوں ۔۔اور اس وقت سمجھتی ہوں پھل کاٹتے کاٹتے ماؤں کے ہاتھوں بغیر کسی شور شرابے کے کٹتے رہتے ہیں، نظروں میں آئے بغیر کسی آواز دیے بغیر، آج سوچا جا کر دیکھوں امی کے ہاتھ پر کتنے کٹ ہیں، میں اپنے کٹ دیکھتی ہوں اور میرے بچے اس سے بے خبر ٹی وی دیکھتے جاتے ہیں۔

کسی بات پر امی ابو کی زوردار بحث ہو رہی ہے، زندگی کے مسائل ہیں ہماری خوراک، لباس، تعلیم اور آسائشوں کیلئے میری امی ابو سے حالتِ جنگ میں ہیں، وہ ہمارے اچھے مستقبل کیلئے کمرے میں تنی کھڑی ہیں، مگر وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے ہمیں چھت پر کھیلنے کا کہہ گئی ہیں ہمیں چھت کی کھلی ہوا میں بھیج کر وہ بند دروازے کے پیچھے ساری گھٹن اپنے اندر اتارنا چاہتی ہیں، اس گھٹن کا ایک ذرہ بھی اڑ کر ہم تک نہ پہنچے وہ اس خیال سے ہمیں چھت پر جانے کا کہہ گئی ہیں ۔۔ ہمارے جسم کے ساتھ ساتھ ہمارا دماغ بھی توانا رہے، وہ اپنے بچوں کی صحت مندی کیلئے ساری لڑائی اکیلے ہی لڑ رہی ہیں ان کی پشت پر نہ میک ہے اور نہ انہوں نے اپنے سامنے بچوں کو ڈھال بنا رکھی ہے۔۔بچوں کو اذیتوں سے دور۔۔ بند دروازے سے بہت دور چھت پر پہنچانا چاہتی ہیں ۔۔ بچوں کیلئے ٹھنڈی اور تازہ ہوا کے بندوبست کے جنون نے انہیں کمرے میں اکیلا بند کر دیا ہے، وہ نہیں جانتیں کہ دروازے کے پیچھے سے تتی ہوا نکل نکل کر چھت پر نہ جانے والے نافرمان بچوں کے دماغوں میں کھلبلی مچا رہی ہے۔

میں اپنے میاں سے الجھی ہوں، بچوں کیلئے یہ چاہیے وہ چاہیے، ایسا گھر ہو اور ایسا کھانا ہو انہیں وقت دو اور پیسہ بھی، ان کے مستقبل کیلئے یہ بھی کرو اور وہ بھی کرو، بحث جاری ہے میں بچوں کو نیچے بیسمنٹ میں گیمز کا کھیلنے کہہ کر آئی ہوں، تیسری منزل پر بیڈ روم کا دروازہ بند کر چکی ہوں ۔۔ کوئی آواز کوئی تتی ہوا لے کر میری بچوں کے کانوں تک نہ پہنچے، خود میں تپتی دھوپ میں بغیر سن ہیٹ کے کھڑی ہوں، تیز الٹراوائلٹ زمیرے چہرے پر ناخن مار رہی ہیں، مگر مجھے اپنے بچے جسمانی اور دماغی طور پر مضبوط چاہیے ۔۔میرا دماغ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔۔میری امی نے کمرے کا دروازہ

بند کیا تھا کہ مجھ تک معاشی سماجی اور نفسیاتی جھگڑوں کی آواز نہ پہنچے، اور آج میرے آگے سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ میں امی کا بند دروازہ بارہ پہلے چھوڑ آئی تھی۔ اور میں دوڑ دوڑ کر اپنے بچوں کے اوپر ان مصیبتوں کے دروازے بند کرتی جاتی ہوں۔۔ بھاگتے بھاگتے میرا سانس پھول جاتا ہے، میرے چہرے پر تیز دھوپ کے ناخن لگے ہیں، اور آج مجھے پتہ چلا ماؤں کے چہرے پر دھوپ ہولے ہولے ناخن مارتی رہتی ہے اور ان کے سانس پھولے رہتے ہیں، سوچا۔ آج جا کر اپنی امی کے منہ پر منہ رکھ دوں اور اپنا سارا سانس ان میں انڈیل دوں۔

بزنس کلائنٹس کو نمٹانا، ملنے ملانے والوں کی شکائتیں اور شکوے۔۔ لوگوں کی دعوتیں کرنا اور ان کی دعوتوں میں جانا۔۔ کسی ناراض رشتے دار کو منانا، اور کسی خوش کے ساتھ مل کر ہنسنا۔۔ ملنے ملانے والوں کی امیدوں پر پورا اترنے کی جان توڑ کوشش، ان جان لوگوں کو پرکھنا اور لین دین کے معاملات۔ یہ سب کرتے کرتے میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔۔ کیونکہ میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہوں، میرے سر پر سورج بہت تیز چمک رہا ہے، میں ڈائریکٹ سورج کی شعلہ بار نظروں کے سامنے کھڑی ہوں کیونکہ اس سائے سے جو میرے سر پر تنا رہتا ہے جو مجھے اپنے پیچھے دھکیل کر میرے آگے تن جاتا تھا ساری تپش، ساری تھکن اپنے اندر اتار کر میرے تک چھنی ہوئی صاف ملائم ہوا آنے دیتا تھا، اس شجر کے سائے سے نکلے بارہ سال بیت گئے ہیں، اور آج مجھے پتہ چلا ماؤں کی آنکھوں میں سورج کیسے جا جا کر چبھتا ہے۔۔ اور ان کے جسم تیز الٹراوائلٹ ریز میں مرجھانے لگتے ہیں اور ان کے سروں میں درد رہتا ہے اور آج سوچتی ہوں گرم شعاعیں پھینکتے سورج کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا دوں اور دوسرے ہاتھ سے اپنی امی کی آنکھوں کو ڈھانپ لوں اور جو بھی شعلے ان کی طرف لپکیں ان سے اپنے ہاتھ جلا لوں۔۔ اور وہاں صرف ٹھنڈی ہوائیں جائیں اور شبنم اترے۔۔ دھیرے دھیرے اور بس۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

اپریل 2009ء کی نسلی امتیاز کی کانفرنس

صدیاں گزرنے کے بعد آج 2009ء میں بھی حالات ویسے ہی ہیں جیسے پہلے ہوا کرتے تھے، نسل پرستی کی بنیاد پر نہ جانے کب پڑ گئی کہ انسان کہیں پیچھے رہ گیا اور نسلیں، ذاتیں، رنگ، جنس اور قومیں آگے نکل آئے، انسان کا قد کم ہوتا گیا اور نسل پرستی ہر کولیس بنتی گئی، سوئٹزر لینڈ میں نسل پرستی کے خلاف منعقد ہونے والی یونا یٹڈ نیشنز کی اس کانفرنس نے بہت امید پیدا کی کہ اب اس وقت کا سب سے ہاٹ ایشو زیر بحث آئے گا۔۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جو چھوٹے بڑے ہر لیول پر ہر قوم کو درپیش ہے، اور نسل پرستی کی یہ عادت آج کی دنیا کیلئے بہت ہی نقصان دہ اور خون ریز ثابت ہو رہی ہے، میرا خیال تھا anti racism پر ہونے والی یہ انٹرنیشنل کانفرنس بند دماغوں کھولے گی، ڈایلاگ کا سلسلہ بنے گا اپنی اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر سب نظر ڈالیں گے اور دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کیلئے سب مل بیٹھ کر حل نکالیں گے۔

مگر اس کانفرنس نے پہلے یوں مایوس کیا کہ باراک اوبامہ جو دنیا میں نسل پرستی کے خلاف سب سے عمدہ اور طاقتور مہم نہ صرف چلا سکتا ہے بلکہ اسے کامیاب بھی بنا سکتا ہے، مگر اس میں سب سے عجیب بات نہ یہ نکلی کہ اوبامہ نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا، اوبامہ جس کی نسل نہ جانے کب سے تعصب کا شکار رہی ہے، جو پہلے غلامی اور پھر غلاموں جیسی زندگی گزارتے رہے ہیں اور جن کے آباؤ اجداد نے یہ وقت دیکھا ہے کہ جہاں گورے موجود ہوتے تھے وہاں کا یہ رخ نہیں کر سکتے تھے، ایک ایسی ہی بات تھی جب ایک گورے نے کالے سے کہا colored people are not allowed here تو کالے نے بڑے تحمل سے جواب دیا، میں جب

پیدا ہوا تو کالا تھا، جوان ہوا تو بھی کالا تھا، بیمار ہوتا ہوں تو کالا ہی رہتا ہوں سردی گرمی میں بھی میرا رنگ کالا ہی رہتا ہے، مرتا ہوں تو کالا ہی رہتا ہوں اس کے برعکس جب تم پیدا ہوئے تو گلابی ہوتے ہو، جب بڑے ہوتے ہو تو سفید، بیمار ہو تو سبز، سورج کے آگے جاتے ہو تو سرخ، سردی لگ جائے تو نیلے اور جب مرتے ہو تو کاسنی ہو جاتے ہو۔۔ and you have nerve to call me colored? پھر مجھے جان مکین اور بارک اوبامہ کی الیکشن کمپین کے دنوں کی مغربی ورجینا سے ایک سروے رپورٹ کی یاد آئی جس میں صحافی عام لوگوں سے پوچھتا ہے کہ کیا بلیک بارک اوبامہ تم لوگوں کو صدر کی حیثیت سے منظور ہے تو وہ بڑے غصے سے اور شدت سے سر ہلا کر کہتے تھے۔۔نو۔۔کسی صورت نہیں۔۔۔اور جب وہ پوچھتا ہے کہ وہ کیا وجہ تو کہتے۔۔ we just dont agree اور ان کی آنکھوں میں ایک کالے کیلئے بہت نفرت نظر آتی تھی۔۔۔۔ اوبامہ کی کامیابی ایک معجزہ۔۔۔اور وہ چاہتا تو اس نسل پرستی کے خاتمے میں ایک قدم ضرور اٹھا سکتا تھا جس کا سامنا سب سے زیادہ اس کی قوم نے کیا ہے فقط اسرائیل کو خوش کرنے کیلئے۔۔۔تو کیا یہ خود سے ایک تعصب اور اقربا پروری جیسی بات نہیں ہے؟ اس کانفرنس کا بائیکاٹ زیادہ تر یورپی ممالک نے کیا اور اسرائیل نے تو سوئٹزرلینڈ سے اپنا سفیر بھی احتجاجا واپس بلا لیا۔

احمدی نژاد کی تقریر ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ رنگ برنگے بالوں کی مسخرے جیسی وگ پہنے دو آدمیوں نے ہال میں اودھم مچانا شروع کر دیا۔۔کیا بات کرنے کی آزادی اسے کہتے ہیں؟ اگر ایران کا صدر اپنے موقف کے ساتھ سٹیج پر کچھ کہہ رہا تھا تو کیا اسے سننا سب مہذب ملکوں کے نمائندوں کا فرض نہیں تھا؟ کیا اس کی تسلی کروانا۔۔یا ڈائیلاگ کا ایک مہذب راستہ کھولنا ان مغربی مہذب ممالک کا کام نہیں تھا؟ کیونکہ ہر دفعہ ایرانی صدر کو اس بات پر مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بات ہی پوری نہیں کر سکتا، اور اسی وقت سب مغربی ٹی وی چینلز کے نیوز پرسنز لہک لہک کر مذاق اڑانے والے انداز میں اس واقعے کو مرچ مصالحے کے ساتھ ساری دنیا کو دکھا رہے تھے۔۔اور وہی نیوز مین اپنی زبان میں ایرانی صدر کو نسل پرست اور متعصب قرار دے رہے تھے۔۔۔اور کہہ

رہے تھے کہ اسرائیل کو متعصب اور نسل پرست کہنے والا صدر خود سب سے بڑا نسل پرست ہے اور یہ فیصلہ ٹی وی کے رپورٹرز پوری دنیا کو سنا رہے تھے۔۔۔ میں سب کے اتحاد پر حیران رہ گئی۔۔ سب مل کی احمدی نژاد کے یوں کوسنے لے رہے تھے جیسے کلاس میں بچے تو بہت بڑا جرم کر دیا ہے اور باقی ساری کلاس بہت ہی شریف بچوں کی ہے۔۔۔ ماضی میں کس کا دامن خون سے صاف ہے۔ مغربی ممالک کا؟۔۔۔ ورلڈ واروں اور ٹو میں جس قدر معصوم جانوں کا خون بہا۔۔ کیا اس کی مثال تاریخ میں کہیں اور ملتی ہے؟ کیا اسرائیل نے فلسطین میں ابھی حال ہی میں خون کا جو بازار گرم کیا تھا وہ شرافت کے کسی معیار پر پورا اترتا ہے، عراق میں تباہی کے ہتھیار ڈھونڈتے پورے عراق کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔۔۔۔ یہ کوئی جرم نہیں؟ افغانستان اور پاکستان (افسوس اب دونوں ایک ہی لائن میں بالکل ساتھ کھڑے ہیں) ان ممالک کو برباد کرنے والے امن کے سفیر کا خطاب پا سکتے ہیں؟ تو ایک احمدی نژاد ہی کیوں ٹارگٹ؟ اس کانفرنس میں ڈائیلاگ کیوں نہیں کیا گیا؟ کچھ ممالک نے پہلے اور کچھ نے بعد میں کیوں بائیکاٹ کیا؟ کیا یہ بہت اہم مسئلہ نہیں تھا؟ کیا نسلی پرستی ایسے مسئلے کا حل ہونا آج کے وقت کی سب سے بڑی ضرورت نہیں ہے؟ یہ نسل پرستی جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے، ممالک کے اندر، پوری دنیا میں۔۔ اپنے پاکستان کو دیکھیں۔۔۔ اور کسی سے تو بعد میں گلہ کریں گے

ظفر زنجیر میرے پاؤں میں ہے میری اپنی ہی

شعیہ، سنی، بریلوی وغیرہ وغیرہ کے بعد سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان برصغیر کو دیکھو تو بنگالی، ہندو، سکھ، مسلمان اور عیسائی، بین الاقوامی سطح پر دیکھو تو ایشیئن، افریقی، انگلیزی۔۔۔۔ یہ سب بہت چھوٹے پیمانے پر دیکھ رہی ہوں۔ بہت کچھ ہے تعصب اور نسل پرستی ان گورے ممالک میں تو شائد بہت ڈھکی چھپی ہے۔۔ بہت تمیز سے اور بہت طریقے سے کرتے ہیں۔۔ نسل پرستی کے قوانین ہیں، تعصب کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔۔ مگر دلوں میں بسی ہوئی نفرتوں کو جو رنگ اور مذہب سے جنم لیتی ہیں مٹانا بہت مشکل ہے۔۔ گو میرا دل کرتا ہے میں متعصب ہو کر دیکھوں اور کہوں نہیں سارا

قصور اس مغربی دنیا کا ہے۔۔ہم تو بہت بیچارے ہیں،تو اتنا متعصب تو میں با آسانی ہو سکتی ہوں ۔۔میں کسی ہندو کو بڑے آرام سے بری نظر دیکھ سکتی ہوں۔۔ مجھے کوئی سندھی نظر آئے تو میں اس کا مذاق اڑا سکتی ہوں۔۔ عیسائی کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں مجھے حجت ہو سکتی ہے۔۔سکھ کے ساتھ بات کرنے میں دشواری محسوس ہو سکتی ہے،دوسرے مذہب تو دور کی بات مجھے دوسرے فرقے کے لوگوں کو دیکھ کر بہت آرام سے گھن آسکتی ہے۔۔کیوں؟ کیوں کہ میری پرورش ایک ایسے معاشرے نے کی ہے جہاں تعصب ہر دم پھلتا پھولتا ہے اور اسے کوئی برا بھلا نہیں کہتا۔۔۔امیر کا غریب کے خلاف ہی اتنا تعصب ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی تعصب پر چھا سکتا ہے۔۔۔پھر میں نے اپنے ان بھائیوں کو تعصب کے شیرے سے اس قدر لتھڑا دیکھا ہے کہ اپنے آپ کو انصاف کے کٹہرے سے میں با آسانی اتنے متعصبانہ رویے کے باوجود بری کروا سکتی ہوں۔۔ کیوں کہ میں نے عربی کا غیر عربی کیلئے جو رویہ دیکھا ہے۔۔مجھے دنیا میں اس سے زیادہ متعصب رویے کی مثال نہیں ملتی۔۔غیر تو اگر ہمیں رنگ،نسل، ملک یا مذہب کی وجہ سے حقارت سے دیکھیں۔۔تو کم گلہ بنتا ہے۔۔مگر اپنے عربی بھائی جب چھری سے گلہ کاٹتے ہیں تو حلق سے خون یوں ابلتا ہے۔۔ کہ اس کا رنگ بھی لال نہیں ہوتا۔۔۔اپنے مسلمان بھائیوں کی حقارت سے وہ اس قدر سیاہ پڑ جاتا ہے۔۔پاکستانی پاسپورٹ کو یوں غصے سے دیکھتے ہیں۔۔خانہ کعبہ کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور اپنی نسل کو سب سے برتر سمجھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں جس کی نسل ہونے پر وہ مان کرتے ہیں اس کا فرمان ہے،کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر۔۔کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فوقیت حاصل نہیں۔۔عیسائی، یہودی، ہندو، اور کسی بھی مذہب کا نام لے لیں۔۔ مجھے جتنا حقارت آمیز رویہ عربیوں کا دوسرے غیر عربی مسلمانوں سے نظر آتا ہے،اتنا مجھے کہیں اور نظر نہیں آتا۔۔۔ مڈل ایسٹ کے سب ممالک میں آپ ساری عمر گدھوں کی طرح کام کرتے رہیں مگر وہاں کی آپ شہریت کے قابل کبھی نہیں ہو سکتے۔

بات شروع ہوئی تھی نسل پرستی کو ختم کرنے سے۔۔۔اس سے میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل نسل

پرستی کی ایک بہت عمدہ مثال ہے، جہاں کے سکولوں تک میں نسل پرستی کو اس قدر فروغ دیا جاتا ہے کہ اس کا تدارک اور کہاں سے کیا جائے۔۔ جب تعلیمی درسگاہیں ہی اس کا نمونہ ہیں، یہاں لڑکیوں کی ذاتوں کی بنیاد پر کلاس رومز، کینٹین اور ٹیچرز ہوتی ہیں، مختلف ذات کی لڑکیوں کو مختلف باڑوں سے تقسیم کردہ حصوں میں بٹھایا جاتا ہے۔۔۔ یہ نسل پرستی ہر جگہ ہے، کہیں دبی ہوئی، کہیں ابھری ہوئی کہیں کسی وجہ سے اور کہیں کسی وجہ سے، سو اس پر بات کرنا ایک بہت سودمند عمل تھا۔۔ مگر اسے شروع ہونے سے پہلے مارنے کی کوشش کی گئی۔۔ اور اگر شروع ہو ہی گئی تھی تو اسے ڈائیلاگ کی منزل تک جانے سے پہلے ہی ماردیا گیا۔۔۔ اگر ایرانی صدر سے ڈائیلاگ کیا جاتا۔۔ اس کے دیس میں سنی شیعہ کا جو کہرام ہے اور جس کی وجہ سے وہ کئی سالوں تک عراق سے بھی جنگ کرتا رہا ہے۔۔ اس پر بات ہو سکتی تھی۔۔ اس کو بھی جواب کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا تھا۔۔ مگر کیا یہ تعصب اور نسل پرستی کو زیادہ ہلہ شیری دینے کے مترادف نہیں ہے، کہ آپ یکدم سب کھڑے ہو کر فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ شخص اچھوت ہے اور اس سے کوئی بھی بات نہیں ہو سکتی۔۔۔؟ آخر کیوں۔۔ کیا اسرائیل ساری مغربی طاقتوں کی ایسی محبوبہ ہے جس کے خلاف وہ ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتے؟ بہت اچھا ہوتا۔۔ اگر احمدی نژاد کے سوالوں کے جوابات دیئے جاتے ۔۔۔ اس کا مطمئن ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی بھی اور ملک کے سربراہ کا۔۔۔۔

اپنے ناپسندیدہ شخص کو برداشت کرنا، اس کی بات سننا اور اسے بھی مطمئن کرنا۔۔ یہی بین الاقوامی جمہوریت ہے۔۔۔ یہیں سے تعصب اور فرقہ پرستیاں ختم ہوں گی اور یہیں سے پھر روشنی پھوٹے گی جو اس دنیا کو منور کر دے گی ورنہ تو نسل پرستی اور نفرت نے اس دنیا کا رنگ اتنا سیاہ کر دیا ہے کہ صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو سورج کی کرنیں ڈھونڈنا پڑتی ہیں۔۔۔۔ بہت دور چھپتی جا رہی ہیں ہماری آنکھوں سے بہت دور۔

☆☆☆

کیا لکھا جائے اور کیسے لکھا جائے

جب سورج کی طرف دیکھو تو بھی روشنی نظر نہ آئے اور جب چاند کو دیکھو تب بھی آنکھیں ٹھنڈک محسوس نہ کریں تو کیا کیا جائے؟ لوگ جب یہ دعوت دینے لگ جائیں کہ لکھو مگر احتیاط سے۔۔ تو کیا لکھا جائے؟ میرا ساتھ دینے والے ہمیشہ سے بزدل یا اچھے لفظوں میں احتیاط پسند ہی کیوں ٹھہرے؟

میں بینک کے دنوں کو یاد کرتی ہوں تو بینک منیجر کے نام پر ایک شخص کو سامنے کھڑا پاتی ہوں جو میز پر ٹانگیں رکھے بیٹھا ہے جوتے اس کے ہماری سیٹوں کی طرف منہ پھاڑے نظر آتے ہیں اور باقی آفیسر اس کی خوشامد میں مصروف ہیں۔۔ اور جب میں ایک جونیئر ٹریننگ آفیسر ہوں مگر پھر بھی چلا اٹھتی ہوں، سر پلیز اپنے پاؤں نیچے کر لیں مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ اس سائیڈ پر بیٹھے لوگوں کے منہ پر آرہے ہیں، تو میرے اردگرد بیٹھے سب لوگ بعد میں اتنا شرمندہ کرتے ہیں کہ جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہو، مجھے احتیاط سے بات کرنے کے مشورے آج بھی یاد ہیں وہ سب میرے خیر خواہ تھے۔

پھر جب میں نے income expenditure کی تفصیل بتاتے بتاتے کچھ واوچر سے نظر اٹھا کر ان سے پوچھا کہ بنک کے خرچے میں کھوپرے کا تیل کیسے آ سکتا ہے؟ تو ہر ٹیبل سے دبی دبی آوازیں نکلنے لگ گئیں، مجھے خاموش رہنے کے مشورے دیے جانے لگے تو میری نظر بنک منیجر کے گھنے بالوں کی طرف گئی مجھے سمجھ آ گئی مگر میرا سوال برقرار رہا۔ جس کے بدلے میں حسب معمول باقی ساتھیوں کی طرف سے احتیاط کے مشورے دیے گئے وہ سب میرے ہمدرد تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ میری ٹرانسفر اس برانچ سے ہو جائے، مگر بنکنگ کے 4 سال کے مختصر عرصے میں میری چار پانچ دفعہ ٹرانسفر ہوئی، کیونکہ میرے سے ساتھیوں کے مشوروں پر عمل کر کے بھی احتیاط ہو نہیں سکی، یا شائد مجھ سے ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے خاموش رہنے کی ضرورت ہے اس لیے سوچتی ہوں کیا لکھوں۔؟ پہلے احتیاط کرنا تو سیکھ لوں

میں نے ایک کالم لکھا تھا کسی ایسے سیمینار پر جو خدا کے وجود کے خلاف تھا، یہاں مجھ پر دہریوں نے تنقید کی بھرمار کر دی سانس لینا دوبھر ہو گیا مگر جب میں نے اہل اسلام اور مومنوں کو یہ کہتے سنا کہ ایسی بحثوں میں نہیں پڑتے، اپنے اوپر چھینٹے پڑتے ہیں، آپ خاتون ہیں آپ کو زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے تو کیا میں ان لوگوں سے ڈر جاؤں اور ان کے خلاف نہ بولوں جو اتنے بےباک ہیں کہ خدا سے نہیں ڈر رہے اور میں ان سے ڈر جاؤں۔۔۔ انہوں نے بہت زور دے کر کہا۔۔ ہاں یہی مصلحت اور یہ عقلمندی ہوتی ہے۔

مجھے اپنے بےوقوف ہونے پر ناز کرنا چاہیے یا ایسا عقلمند نہ ہونے پر ماتم کرنا چاہیے؟

مجھے احتیاط سے لکھنا چاہیے یا ڈر کر لکھنے سے بہتر قلم کو ہی توڑ دینا چاہیے؟ فلاں گروپ یا فلاں شخص کے بارے میں نہ لکھا جائے کیونکہ ان پر لکھنے سے آپ پر چھینٹے اڑنے کا امکان ہے تو اس کا مطلب ہے ان لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے اور ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیے گئے ہیں اور آنے والے وقتوں میں ان کے بارے میں وہی کچھ پڑھا جائے گا جو خوف اور مصلحت امیزی کے قلم سے لکھا گیا ہوگا؟ سقراط جب زہر کا پیالہ پی رہا ہوگا تو اس نے یہ سوچا ہوگا شائد میری موت سے سچ کو زندگی مل

جائے گی سچ جیتے گا اور لوگوں کے دلوں پر راج کرے گا، مگر یوں لگتا ہے سچ اس کے ساتھ ہی زہر پی گیا، زمانہ مصلحت اور مفاد کی سولی پر چڑھ گیا۔ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا ایڈیشنل بی اے کی جرنلزم میں جن کالم نگاروں کو پڑھ رہے ہیں وہ سب کے سب کسی نہ کسی پارٹی سے منسلک ہو کر اس پارٹی سے منسلک ہو کر اس پارٹی کیلئے لکھتے ہیں کوئی کالم نگار کسی ایک پارٹی کا ہو گا تو نیوٹرل رائے کیسے لکھے گا، اگر کالم نگار مالی فائدے یا کسی خوف میں لکھتے رہے تو باقی کسی بھی ادارے سے قومی سلامتی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ ذات کو بھول کر ملک کے فائدے کیلئے سوچنا صرف سیاستدانوں کا ہی نہیں صحافیوں کا بھی کام ہے، میرا یہ ماننا ہے کسی ملک کے صحافی صرف اپنی ذات سے بالاتر ہو کر ملک کے لئے اپنی آنکھیں، کان اور قلم مختص کر دیں تو کسی ملک میں کوئی مجرم کسی بھی لیول کا ہو من مانی نہیں کر سکتا۔ میڈیا کی ایمانداری سے ملک کے ہر ڈیپارٹمنٹ کی پکڑ ہو سکتی ہے اور اس کا قبلہ ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر میڈیا ہی ڈرا سہا، بکا، مفاد پرست ہو گا تو کس کو کس منہ سے برائی سے روکے گا؟ کس کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی طاقت رکھے گا؟ سو جب ملک دن بدن کسی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے تو وہاں بھی خاموش بیٹھ کر لکھنے سے کیا فائدہ؟ خاموشی، کبھی تحریر کس کا کیا بگاڑ سکتی ہے یا سنوار سکتی ہے؟ خاموشی ہی رہو، صفحوں کا منہ کیوں کالا کرنا؟

ان حالات میں جب زرداری ہمارے سر پر مسلط ہے، کراچی میں کوئی اندھی سازش رچ رہی ہے جب پورا ملک سوات بننے جا رہا ہے جب پوری بین الاقوامی برادری میں ہماری ساکھ ٹکے کی نہیں ایسے وقت میں پاکستانی کمیونٹی جہاں بھی ہے ملک میں یا ملک سے باہر اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کر کے اسے ٹھیک کرنے کی اشد ضرورت ہے اور ان سب کیلئے کون سا ایسا طلسمی قلم ہو سکا ہے جس سے سچ چھپ جائے اور ہم اسے لکھ بھی دیں۔۔ کیسے احتیاط ہو سکتی ہے؟ اتنی تلخیوں میں میٹھے میں اپنا سچ کیسے قلم کی نوک پر آ سکتا ہے؟

جب ایسے ماحول میں کبھی کبھی دل اس فیصلے تک پہنچ جاتا ہے کہ تاریک دنیا ہی اختیار کر لی جائے تو کچھ جملے، کچھ دعائیں، کچھ مان واپس اس جنجال میں کھینچ لاتے ہیں، جیسے آج کل میں

انہی الجھنوں کا شکار اور محمد صابر کی سعودی عرب سے ایک میل۔ روبینہ جی لکھتی جایئے، قلم کے اس جہاد میں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، اور میں مسجد نبوی میں بیٹھ کر آپ کیلئے دعا کرتا ہوں۔ پھر ایک باپ کا پاکستان سے ای میل۔ روبینہ بیٹا۔ لکھنا ترک نہ کرنا اور اسلام پر بھی لکھو، تمہاری تحریر میں خدا نے اثر رکھا ہے جو دل میں اترتی ہے۔ اور میں سوچتی ہوں، اس محبت کو جو مجھے کہتی ہے احتیاط سے لکھو۔ اور اس دعا کو جو میرے لیے مانگی جاتی ہے کہ میں بے دھڑک لکھوں میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟ احتیاط یا بے خوفی؟ میرے ملک کی صحافت کو کس بات کی ضرورت ہے احتیاط یا دلیری؟ ایک دفعہ بھانبڑ کی طرح جل جائیں یا گیلی لکڑی کی طرح سلگتے سلگتے ہی سلگ جائیں؟ جھوٹے اور مکار لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے اس خوف سے کہ سچ بولنے والے پر آنچ نہیں آنی چاہیے، سچ کو چاہے سولی پر لٹا دو؟

☆☆☆

میرا اسلام ہی میرا جرم ٹھہرا؟

پاکستانی مسلمان 57 سال کے باپ نے حجاب کے نام پر 16 سالہ بیٹی کو قتل کر دیا۔ خبر میں سب سے پہلے پاکستانی، مسلمان، پھر حجاب ۔۔۔ کچھ اور مہذب معاشروں کی خبروں کا جائزہ لیں ۔۔۔ اپریل 2007 کی خبر: 33 لوگ virginia university میں مارے گئے gun man کی shooting سے ۔۔ صرف گن مین ۔۔ نہ ملک، نہ قوم نہ مذہب ۔۔۔ اس ہیڈلائن میں شناخت ہے تو صرف ایک gun man کی، (33 dead in horrific campus shooting in vir). ایک اور قتل، اغواء اور یرغمال بنانے کی خبر ملاحظہ فرمایئے۔

Charles Carl Roberts, a 32-year-old milk-truck driver and father of three children, walks into a single-room Amish schoolhouse in the village of Paradise near Nickel Mines and kills a number of children.The young victims - all girls between the ages of 6 and 13- are lined up against a blackboard and shot execution-style,

police report.Earlier,Roberts had ordered the 15 boys in the class, as well as several women with younger children, to go free.

2 اکتوبر 2006ء کی اس ہولناک 6 سے 13 سال کی عمر کی بچیوں کو بے دریغ مارنے والے کا صرف نام چارلس رابرٹ ۔۔۔ نہ قوم، نہ مذہب نہ اس کا بیک ہوم ۔۔۔۔

13 ستمبر 2006ء مانٹریل کینیڈا کی ایک اور سرعام قتل کی خبر:

A young man opens fire outside Dawson College, a CEGEP serving about 10,000 students in downtown Montreal, and then continues the rampage inside the school. Witnesses describe seeing a tall skinny youth with a mohawk haircut walk into the cageteria shortly before 1 p.m. ET carrying a large gun. The shooter, Kimveer Gill, 25. lived in a borough of laval north of Montreal. He Killed himself in a confrontation with police inside the school. One woman is killed, 18-year-old Anastasia DeSousa, and 19 people are wounded, at least six critically. They range in age from 17 to 48, according to police.

صرف young man، مزید پہچان کیلئے نہ روسی، نہ امریکی، نہ انڈین، نہ چائنز، نہ کورین، نہ عیسائی نہ ہندو نہ یہودی ۔۔۔ بے رحمانہ انداز سے مارنے والا فقط young man۔ ان خبروں میں سوچئے اگر کوئی مسلمان یا پاکستانی ہوتا تو خبر کیسے بنتی 16 اکتوبر 2007ء کی

خبر کچھ یوں ہوئی ایک مذہبی جنونی نے، مسلمان دہشت گرد پاکستانی نے virginia میں اندھا دھند فائرنگ کر کے 33 لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کے خیال میں یہ لوگ عیاشی کر مرتکب ہو رہے تھے اور یونیورسٹی کو فحاشی کا اڈا بنا رکھا تھا۔ اور 32 سال کے ٹرک والے پاکستانی مسلمان نے 6 سے 13 سال کی لڑکیوں کو یرغمال بنا لیا انہیں سکول بورڈ کے ساتھ لگا دیا، کیوں کہ اس کے حساب سے لڑکیوں نے حجاب نہیں پہن رکھا تھا، یا وہ بلند آواز سے ہنس رہی تھیں۔۔۔ یا لڑکوں کو متوجہ کر رہی تھیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اور جو مانٹریل کالج کی خبر ہے وہ اگر کوئی پاکستانی یا مسلمان ہوتا تو خبر میں اس کی پہچان بھی صرف young man نہ ہوتی بلکہ پاکستانی مسلمان دہشت گرد نے مانٹریل کالج میں فائر کھول دیا، اور وہ ایک خودکش حملہ آور تھا کیونکہ اس نے بعد میں اپنی جان بھی لے لی۔ قریبی ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وہ ہر وقت خدا کی راہ میں جان دینے کی اور لینے کی بات کرتا تھا۔۔۔

ان خبروں کے بعد سارے مسلمان منہ چھپاتے پھرتے۔۔ شرم سے ان کے سر جھک جاتے، لوگ بڑھ چڑھ کر اسلام کو برا بھلا کہتے، اسلام کے اندر لوگوں کو fundamentalism اور terrorism بڑھ چڑھ کر نظر آتا۔۔۔ لوگ پوچھتے ہیں کیا اسلام صرف مرنے اور مارنے کا مذہب ہے؟ اور ہم سب مسلمان اپنی اپنی صفائیاں دیتے، منہ سے جھاگ اڑاتے، ہر وقت ہر لمحے کسی نہ کسی کٹہرے میں کھڑے ہوتے، کوئی ہماری بات سمجھتا، کوئی ہمارا مذاق بناتا، کوئی ہمیں رحم بھری اور کوئی دہشت زدہ نظروں سے دیکھتا۔ ایسا ہی تو ہوا ہے اس ایک خبر سے سولہ سال کی بچی کو باپ نے پردہ نہ کرنے، حجاب نہ پہننے پر مار دیا، پاکستانی مسلمان باپ نے مذہب کے نام پر بچی کاٹ دی، کینڈا میں بھی مذہبی انتہا پسندی کا فروغ قابل تشویش، قابل مذمت، قابل غور وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

اسی دوران ایک اور کینڈا کی خبر تھی۔۔ باپ اور بچوں نے مل کر ماں کو قتل کر دی۔۔ اس خبر میں بھی نہ باپ کی قومیت پتہ چلی نہ ماں کی نہ ماں غیرت اور پردے کے نام پر مری اور نہ باپ

اور بچے مذہبی جنونی یا دہشت گرد کہلائے۔۔فقط دماغی مرض۔۔ذہنی الجھن۔۔۔غصہ۔۔۔یہ سب باتیں کسی مسلمان میں بھی ہو سکتی ہیں، اور غیر مسلمان میں بھی۔قتل کی وجہ کہیں پر کچھ اور کہیں پر ایک جیسی بھی ہو سکتی ہے۔۔عوامل مختلف ہو سکتے ہیں، انسانی جذبے ایک سے ہی ہوتے ہیں، کسی بھی مذہب کو لیں یا قوم کو، کوئی ثقافت یا کوئی مذہب آج کے دور میں مرنے کی وجہ نہیں ہے، وجہ ہیں انسانی جذبے، انسانی خواہشیں، انسانی کشمکش، انسانی غلطی اور انسانی گناہ۔۔۔اس کو کس سنگدلی سے، کس بے رحمی سے مذاہب کے نام پر ثقافت کے نام پر خبروں کی زینت نہیں بنایا جا سکتا، ایک مسلمان قاتل باپ کے درد کو، اس کی ذہنی حالت کو، اس کی روح کو سمجھنے کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسی غیر مسلمان قاتل کے محرکات کو سمجھنے کی ہے، ایک مسلمان خاص کر پاکستانی باپ جو پیار سے اپنی بیٹیوں کو پالتے، ان کے ناز اٹھاتے، ان کو عزت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے، جو زمانے کی کوئی تتی ہوا اپنی بچی تک پہنچنے نہیں دیتے ان کے جسم کی ان کی روح کی پاکیزگی کا خیال وہ اپنی جان سے زیادہ رکھتے ہیں، میں نے جتنے پاکستانی باپ دیکھے ہیں وہ کسی بھی معاشرے یا کسی بھی ثقافت سے زیادہ پیار کرنے والے دیکھے ہیں، پاکستان میں ہزاروں اور یہاں سو نہیں تو پچاس فیملیز کو تو میں بھی جانتی ہوں مجھے ہر گھر میں ایک پیار کرنے والا باپ نظر آیا ہے، ماؤں سے زیادہ بچوں کی ضروریات کا خیال رکھنے والا باپ۔۔۔۔پھر کیا وجہ ہوگی، کیا دکھ ہوگا۔۔جس نے اس باپ کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔۔۔۔۔اس کے محرکات کیا تھے؟ اس کی ذہنی پرابلم کیا تھی۔۔۔اس کو صرف مذہبی جنون کا نام دینا نہ صرف غلط بلکہ قبل از وقت ہے۔۔۔

میں نے جب گیارہ نوجوان پاکستانی مسلمان لڑکے دہشت گردی کے نام پر پکڑے گئے تھے تب بھی یہی کہا تھا۔۔اگر کچھ ایسا ہو رہا ہے تو ہم والدین کو بچوں کو بہت وقت دینے کی ضرورت ہے، ہمارے لوگوں کا، ہم مہاجروں کا اس وقت المیہ صرف یہ ہے کہ بچوں کے نام پر، ان کے مستقبل کے نام پر ہجرت تو کر آئے ہیں مگر بے دھیانی میں یہ نہیں دیکھ رہے کہ وہی بچے ہمارے سارا سارا دن گھروں سے باہر رہنے کی وجہ سے ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں، بچوں کے نام پر

ہجرت کرنے والوں کو میں دیکھتی ہوں ان کے پرس میں بچوں کو دینے کیلئے پیسہ تو بہت ہے مگر وقت نہیں، میں آج پھر کہتی ہوں۔۔۔ سب کو کہتی ہوں اگر وقت ہے تو وہ بچوں کو دو، ورنہ دنیا میں دولت کے نام پر تو جہاں مرضی ہجرت کرلو کامیاب ہو جاؤ گے، مگر بچوں کے نام پر ہجرت کر کے دولت کو گھر کی باندی بنانے کی دوڑ میں وہی بچے کبھو اپنے ہاتھوں سے مار رہے ہو۔۔۔ ہم اس عمر میں یہاں آ کر کشمکش میں پڑ جاتے ہیں کیا صحیح اور کیا غلط تو ان ننھی جانوں، جو پندرہ سال، سولہ سال، اٹھارہ سال کی عمر میں ثقافت کے مذہب کے اتنے تضاد میں پڑ جاتے ہیں۔۔ تو سوچئے اس وقت انہیں کون منزل کی طرف پیار سے دھکیل سکتا ہے۔۔ کون ان کے معصوم دلوں میں اتر کر ان کے زخم، ان کے conflicts پڑھ سکتا ہے؟ کون ان کے دل کی بات کو سمجھ سکتا ہے؟ اپنے اوپر فخر کرنا کون انہیں سکھا سکتا ہے؟

یہاں کا اور مغرب کا میڈیا (کسی ہندو صحافی کی خاص عنایت اس خبر میں ضرور شامل ہوتی ہے جس میں کسی پاکستانی کا کسی مسلمان کا نام ہو)، جو بھی کرتا ہے۔۔ دکھ اس وقت بڑھ جاتا ہے جب کوئی نام نہاد لبرل مسلمان سکالر اپنی چونچیں کھولتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ملا اور مولوی مذہب کے نام پر ایک اچھا خاصہ بزنس رن کرتے ہیں تو دوسری طرف ایسے برساتی مینڈک بھی ایسی کسی خبر پر پھدکتے بلوں سے نکل آتے ہیں۔۔ مولوی کو حلوے کا لالچ اور اس لبرل سکالر کو شہرت اور بلاوجہ کی بیان بازی کا نادر موقع مل جاتا ہے۔۔۔ جتنے مذہب کیلئے قاتل ان پڑھ مولوی ہیں ان سے بڑھ کر یہ نام نہاد لبرل سکالرز ہیں، جو فوراً اسلام کی بنیاد پرستی پر لمبے لمبے کالم لکھ کر یہاں کے میڈیا میں ہندوؤں کے برابر مقام بنانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کو ایک بیٹی کی حیثیت سے، ایک بیوی کے مقام پر رہ کر ایک ماں اور ایک باپ مسلمان پاکستانی بہن ہونے کے ناطے میں یہ بتانا چاہتی ہوں، جتنا پیار کرنے والا، حفاظت کرنے والا بھائی ایک مسلمان پاکستانی ہے کوئی اور نہیں، جتنی عزت اور رتبہ دینے والا ایک پاکستانی خاوند ہے کوئی اور نہیں، جتنے ناز اٹھانے والا ایک پاکستانی مسلمان باپ ہے کوئی اور نہیں، جتنا ماں کو پوجنے والا پاکستانی مسلمان

بیٹا ہے کوئی اور نہیں ۔۔۔لہٰذا یہ بہت بہتر ہوگا کہ وہ اپنے گھٹے ہوئے گھروں کے چند ایک تجربات کو پوری پاکستانی قوم کا المیہ بنا کر پیش نہ کریں، اپنی ذاتی کوتاہیوں کی وجہ سے اسلام کو بدنام نہ کیا جائے تو اچھا ہوگا، اسلام ہمارے لیے قابل فخر مذہب ہے اسے ہمارا فخر رہنے دیا جائے اسے ہر جرم کی وجہ یا ہر جرم کا پس منظر بنا کر نہ پیش کیا جائے تو اچھا ہوگا۔۔۔۔۔ اسلام زندہ باد، نام نہاد جدید سکالر مردہ باد، اگر ہم مولوی سے خوش نہیں ہیں تو اس لبرل سکالر سے تو باقاعدہ نفرت کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا اسلام ہمیں اعتدال پسندی سکھاتا ہے اور یہی ہم نے اپنے بچوں کو آگے ورثہ میں دینی ہے۔

اس اقصیٰ پرویز کیلئے دعا مغفرت اور اس کا باپ اور گھر والے جس دہرے چوہرے کرب سے گزر رہے ہیں ان کے آسانیاں اللہ پیدا کرے، ہم اقصیٰ کے قتل پر اس کی بے وقت موت پر جتنے بھی رنجیدہ ہوجائیں ہمارا غم اس باپ کے مقابلے میں ذرے کے برابر بھی نہیں جس نے اسے پیدا کیا پالا پوسا، بڑا کیا۔۔۔اور پھر نجانے کیوں اپنے ہی ہاتھوں مار دیا۔۔۔۔ ہمارا غم اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔۔۔بےشک اس کا دکھ بہت بڑا ہے ہماری عقل بہت ناقص ہے، ہم شاید کبھی سمجھ نہیں پائیں گے۔۔۔۔کہ ایسا کیوں ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

☆☆☆

بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے!

عراق، افغانستان، پاکستان اور اب ایران، جن کے نہ صرف نام ایک ہی آواز پر ختم ہو رہے ہیں بلکہ ان کی تقدیر بھی کچھ یوں جوڑ دی گئی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ کون زیادہ تباہ ہو رہا ہے یا ہوگا؟ امریکہ نے عراق سے تباہ کن ہتھیار اور مواد برآمد کرنا تھا۔ اس لیے اسے کھنڈر بنا دیا۔ وہاں کے لوگ صدام سے نجات چاہتے تھے تو جب تک وہ امریکہ کے ہاتھوں کھیلتا رہا، کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا نہ عوام اور نہ فوج۔ جونہی امریکہ نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کیا تو پھر اسے کوئی طاقت نہ بچا سکی کیونکہ اپنے لوگوں کا اور ان کے اعتبار کو وہ بہت پہلے ہی کھو چکا تھا اپنے لوگ اسکے ظلم وستم سے تنگ تھے۔ امریکہ کو ایسے بد اعتمادی کے فضا میں ڈوبے ملک کو اندھیرے میں غرق کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی، شیعہ سنی فرقے۔۔۔ ایک کو ہٹاتا ہو تو دوسرے کا بازو تھام لو۔

افغانستان جہاں طالبان سے تنگ لوگ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے تو گیارہ کے بعد جب اسامہ بن لادن اور ان طالبان کو ایک ہی گروہ تصور کر لیا گیا تو امریکہ کو افغانستان کے مقامی لوگوں کی حمایت لینا اور وہاں سے طالبان کو نیست و نابود کرنے کا خواب دکھانا اور اسے پورا کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا، کرزئی جیسے لوگوں کو لانا ایسے ماحول میں بالکل بھی مشکل کام نہیں تھا، طالبان کو ختم

کرنے کے چکر میں پورے افغانستان کو قبرستان بنانا کوئی مشکل کام نہیں تھا، نہ جسمانی طور پر اور نہ اخلاقی یا جذباتی طور پر اسامہ بن لادن، طالبان اور لشکر طیبہ وغیرہ یہ سب پھر پاکستان کے قبائلی علاقوں میں آ گئے، یہ سوچ کر کہ اب امریکہ پاکستان کو تباہ و برباد کرے گا، تو یہ کیا کوئی مشکل کام تھا، جس پاکستان کو امریکہ نے ضیاء الحق کے زمانے میں مجاہدوں کو سربراہ بنا رکھا تھا تو اسی پاکستان کی کھوکھ سے جنے مجاہدن کو جب امریکہ نے دہشت گرد قرار دیا تو پاکستان کی کیا مجال کہ اف بھی کر جائے اور کس بنیاد پر کرے، اور امریکہ عراق کے لوگ ہوں یا افغانستان کے اور یا پاکستان کے انہیں مارتے ہوئے کیوں جھجکے۔ کیوں رکے؟ اور کیوں لحاظ کر جائے؟ آج سب جانتے ہیں کہ ایران میں جو فسادات ہیں وہ کیوں ہیں؟ اس کے الیکشن کیوں فراڈ اور انٹرنیشنل میڈیا کیوں واویلا مچا رہا ہے؟ اس کی وجہ سب جانتے ہیں سال بھر پہلے امریکہ کی احمدی نژاد کو دھمکی، کہ اسے ایٹمی طاقت بننے سے ہر صورت روکیں گے، احمدی نژاد کا اسرائیل کے وجود کے خلاف بات کرنا، اور ہالوکاسٹ پر انگلی اٹھانا، یہ سب اس کے ایسے گناہ ہیں جو کسی طور امریکہ کی قانون کی کتاب میں معافی کے قابل نہیں ہیں۔۔ اسے سزا تو ملنا ہی تھی، موساد۔۔ سی آئی اے۔۔ اگر یہ سب ایران میں سرگرم ہیں تو انہیں راستے کیسے ملتے ہیں۔

آج میرا سوال یہ نہیں کہ امریکہ مشرقی ممالک کو یا تھرڈ ورلڈ ملکوں کو تباہ کر سکتا ہے اور اپنے حساب سے ان کی چابیاں گھما سکتا ہے میرا سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب کیونکر ہوتا ہے؟ اس کو وہ جواز کیسے مل جاتے ہیں جنہیں وہ بنیاد بنا کر ملکوں میں تباہی کی آندھی یکا یک یوں چلا دیتا ہے کہ انسان کتے بلیوں کی طرح سڑکوں پر مرنے لگتے ہیں، اور دوسرے انسان کسی پتھر کی مورت کی طرح اموات کا تماشہ دیکھتے ہیں، کیا آپ نے کبھی سوچا کہ وہ کون سی گیدڑ سنگھی ہے جو امریکہ کے ہاتھ میں ہے، وہ کیسے پس پردہ رسی ہلاتا ہے اور اسے ان مشرقی ممالک سے ناچنے والے پتلے سستے داموں مل جاتے ہیں، جو اس سے بھی زیادہ ناچتے ہیں جتنا ان کی رسی ہلائی جاتی ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ بھٹو کو یو این او میں کاغذ پھاڑ کر اٹھنے اور ایٹمی طاقت بننے کا نعرہ لگانے

کی سزا یو دی گئی کہ تختہ دار اس کا مقدر ٹھہرا ہم صدام کا امریکہ کو آنکھیں دکھانے کا انجام بھی جانتے ہیں ہم طالبان کی امریکہ کو دھمکیاں، حملے اور جواب میں امریکہ کا ان کا حشر کرنے کا عزم بھی دیکھتے ہیں، مگر کیا ہم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ امریکہ کی بغل میں بیٹھے دو ممالک کیوبا اور وینز ویلا ایسی کسی صورتحال کا شکار کیوں نہیں بنے، کیوبا کا Fidel Castro جو 1959 سے 1976 تک کیوبا کا وزیر اعظم رہا اور پھر 2006 فروری تک صدر رہا اس نے اپنے لیے فوج کا کمانڈر انچیف کا عہدہ بھی چنے رکھا، 50 سال تک وہ بلا غیرے شرکت کیوبا پر ایک ڈکیٹر کی طرح حکومت کرتا رہا اور 2006 میں جب اس کی سرجری ہوئی تو اس نے اپنی صحت کو دیکھ کر خود ہی اپنے 70 سے زائد عمر کے بھائی کے حوالے حکومت کی، 21 جولائی کو اپنی سالگرہ کے موقع پر اس نے کہا:

ترجمہ: میں اس سال کا ہو کر بھی بہت خوش ہوں، میں نے اس بات کی کبھی امید نہیں رکھی تھی کیونکہ میرا دنیا کا سب سے طاقتور ہمسایہ مجھے ہر روز مارنے کی کوشش کرتا ہے:

CIA نے اسے مارنے کی 638 کوششیں کیں، کبھی سگار سے، کبھی سوئمنگ سوٹ سے کبھی اسکی محبوبہ سے، اس کا اپنا یہ کہنا، if surviving attempts were an olympic event ,i would win the gold medal." اور اس موضوع پر ایک دستاویزی فلم بھی بنی، 638 ways to kill castro۔ مگر وہ نہ صرف بچا رہا بلکہ اس کی حکومت کو بھی کوئی آنچ نہیں آئی، G77 جو 133 ممالک کے اشتراک سے ایک جماعت ہے جس کی سربراہی یہی شخص کرتا ہے جو ہر وقت یونیفارم میں رہتا ہے اور امریکہ کا دشمن نمبر ایک قرار دیا جا چکا ہے، اور جو روس کے امریکہ کے عین دشمنی کے زمانے میں روس کا اتحادی رہ چکا ہے، پھر ہم وینز ویلا کے ہوگو شاویز کو دیکھتے ہیں، جو امریکہ کے پہلو میں ہے اور جو امریکہ کے دشمنوں کے ساتھ کھلم کھلا ہاتھ ملاتا ہے، یہاں تک کے ڈیفنس سیکرٹری رابرٹس گیٹس نے جنوری میں ایک بیان میں کہا: ایران کی لاطینی امریکہ میں دوستی اس بات سے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ سوویت یونین اس علاقے میں دوبارہ سے روابط بڑھا رہا ہے امریکہ کے سابق سفیر ڈینس جیٹ کا بیان ہے کہ:

(احمدی نژاد اور ہوگو شاویز وہ انسان ہیں جو جمہوری طریقے سے منتخب تو ہوئے ہیں مگر جمہوری طریقے سے جاتے نہیں اور یہ تبدیلی نہیں دیکھ سکتے) یہ دونوں ایک جیسے تو ہیں مگر شاید ان کا مقدر ایک سا نہیں، ہوگو شاویز کو تو امریکہ نے ایک دفعہ اس کی فوج کی مدد سے فارغ کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنی عوام کے طاقت سے دو دن بعد ہی عہدے پر آ گیا تھا، ہوگو شاویز ہو یا کیسٹرو، یہ امریکہ کی لاکھ مخالفت کے بعد بھی، اپنے ملک میں جمہوریت لاتے ہیں یا نہیں، اس بات کے باوجود، بیٹھے ہیں اور اپنے اپنے حساب سے حکومتیں کر رہے ہیں، ایسا تو نہیں ہے؟ اور ایسا کیوں نہیں ہوا، اس لیے نہیں ہوا کہ ان ممالک میں فرقے نہیں ہیں، سنی، شیعہ، بریلوی، اور دیوبندی نہیں ہیں ان ممالک میں مذہب کو بیچا نہیں گیا، مذہب کو درمیاں میں لا کر محبوس نہیں کیا گیا، لوگوں پر جب گھٹن طاری ہو جاتی ہے تو وہ اس سے نکلنے کیلئے جو بھی ہاتھ ان کی طرف بڑھتا ہے اسے پکڑنے میں عار محسوس نہیں کرے، تو جب عراق میں صدام نے لوگوں پر ظلم کیے، افغانستان میں مذہب کے نام پر لوگوں کی لاشیں گرائی گئیں، ان پر ظلم وستم کیے گئے، اسی طرح پاکستان کے قبائلی علاقوں میں یہی حال رہا، لوگ روٹی کیلئے بک رہے ہیں اور انہیں نماز کی تلقین کی جاتی رہی، لوگ انصاف مانگ رہے ہیں اور انہیں چہروں پر داڑھیاں نہ رکھنے اور سروں پر حجاب نہ پہننے کی سزائیں دی جاتی رہیں۔۔۔لوگوں کی بنیادی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر، ان کی عقلوں کو بیل بند کرنے کیوبا، یا وینزویلا میں امریکہ کامیاب کیوں نہیں ہوتا ہے۔۔۔کیونکہ وہاں مذہب کی وجہ نہیں ملتی JASON BRUKE اپنی کتاب ON THE ROAD TO KANDAHAR میں لکھتا ہے:

ترجمہ: افغانستان میں تشدد کی وجہ مذہب نہیں تھی لیکن وہ اس کیلئے ایک بہانہ فراہم کرتی، جو باتیں غیر قانونی ہو سکتی ہیں انہیں مذہب کی آڑ میں قانونی بنا لیا جاتا ہے۔

میں سوچتی رہی۔۔۔ہم ہمیشہ امریکہ کو گالیاں دیتے آئے ہیں۔۔۔یہ ہو گیا وہ گیا۔۔۔مگر یہ نہیں سوچ سکے کہ ایسا کیوں ہو گیا، جو حکمران اپنے لوگوں کو انسان سمجھتے ہیں دنیا کی کوئی طاقت ہو

چاہے سپر پاور ہی کیوں نہ ہو، نہ تو اس ملک میں بربادی پھیلا سکتی ہے، نہ لوگ خرید سکتی ہے، نہ لوگ مار سکتی ہے، سب کہتے ہیں امریکہ حملے کرتا ہے اور وہ ہمارے لوگوں کو انسان نہیں سمجھتا، مگر آپ یہ دیکھو وہ اپنے لوگوں کو انسان سمجھتا ہے انہیں بچانے کیلئے انہوں نے آپ کے کمزور گھروں میں، جن میں مذہب، فرقہ پرستی اور غداری کے بڑے بڑے سوراخ ہیں، راستہ بنایا ہے، آپ ان کی اس بات سے سبق سیکھیں کہ وہ امریکی شہریوں کو بہتر زندگی، محفوظ زندگی دینے کیلئے کیا کیا کر رہے ہیں، اور وہ آپ کے لوگوں کو اسلیے بھیڑ بکریاں کی طرح مارتے ہیں کیونکہ یہ بات آپ نے انہیں بتلائی اور سجھائی ہے۔ لوگوں کو رہنے کی، بات کرنے کی، پہننے اوڑھنے کی، تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہو تو حب وطنی بھی تبھی پیدا ہوتی ہے عقل و شعور بھی جبھی آتا ہے اور دماغ کے بند دروازے بھی تبھی کھلتے ہیں، آپ لوگوں کے سروں پر دولے شاہ کی ٹوپی پہنا کر انہیں چوہے تو بنا سکتے ہیں باشعور باضمیر اور خوددار انسان نہیں، اور ہمارے پاکستان کے بارے میں کہا جاتا ہے، جہاں طاقتور کمزور اور کمزور ترین پر ظلم کرتا ہے اور پھر جب کوئی باہر سے آکر ظالم کو مارے گا تو ظاہر ہے کمزور اور پھر کمزور ترین کے خوش ہونے کی باری ہوتی ہے، اور یہی لوگ موقع دیتے اور جلسے جلوسوں کا ایندھن ہوتے ہیں۔

آج اگر ایران میں بھی ایک طبقہ احمدی نژاد کے خلاف ہے، اور جو اس بات میں بھی تمیز نہیں کر رہا کہ اس نے ایران کو ایک غیرت مند، اور با اختیار قوم کے روپ میں دنیا سے متعارف کروا رکھا ہے، جو اپنی سادگی اور اپنے بہادرانہ سٹائل کی وجہ سے کتنے ایمان افروز لوگوں کا ہیرو ہے، ایران میں بسنے والے وہ لوگ جو تہران جیسے جدید شہر کے باسی ہیں، انہیں مذہب کے نام پر دباؤ پسند نہیں اور اگر یہ دباؤ لوگوں کے دماغوں پر نہ ہو تو وہ یقینی طور پر اپنے لیے، اپنے ملک کیلئے اچھے برے کی پہچان زیادہ بہتر کر سکتے ہیں، مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کی بنیادی ضرورت کو تو پیچھے رکھ دیا ہے اور اسے مذہب کے نام پر ڈرانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، میں پہلے اپنے بہت سے کالموں میں یہ ذکر کرتی رہتی ہوں کہ اعتدال کا بہترین راستہ جو اسلام کا بھی حکم ہے کو اپنانا

چاہیے، گو کہ اس کا صلہ مجھے یہ ملتا ہے کہ لبرل مجھے قدامت پسند اور قدامت پسند مجھے لبرل سمجھ کر دونوں ہی مجھ سے شاکی رہتے ہیں اور میں ہمیشہ یہ کہتی ہوں کہ ایک طرف ہم ملا ازم میں گھرے ہوئے ہیں اور دوسری طرف آزادی کے نام پر ہمیں غیر کہیں بہت دور دھکے مارتے لے جا رہے ہیں، لوگوں کو سوچنے دیں، کہنے سننے، پہننے اوڑھنے کی آزادی دیں۔۔ پھر کوئی پاور کچھ بگاڑ نہیں سکتی ۔۔اور ہمارے ملکوں میں مذہب اور فرقوں کی جو آسان جنگ دشمن شروع کروا دیتا ہے اس سے نجات مل سکتی ہے اور دنیا ہمیں بھی انسان سمجھنا شروع کر سکتی ہے، خوددار اور جیتے جاگتے انسان جو اپنے لیے خود سوچ سکتے ہیں، خود روٹی کما کر کھا سکتے ہیں اور اپنی بات خود کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی

امریکہ کی خوشامد اور غلامی میں تو ہم ثابت شدہ ہے اور اس میں کوئی دوسری رائے نہیں مگر ہمارا سجدہ ایک جگہ اور جا کر جھکتا ہے اور ہماری زبان ایک اور جگہ جا کر گنگ ہوتی ہے اور وہ ہے انڈیا۔ کسی معاملے میں ہم ان کے آگے بھی سر نہیں اٹھاتے اپنی بات سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے مسئلے رہے ہیں، انڈیا اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹتا اس کا موقف غلط ہو یا صحیح اس پر ڈٹا رہتا ہے۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام کرتا رہتا ہے اور ہمارے حکمران ان کے آگے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ یہی نفسیات ہمارے ہر شعبے میں آ چکی ہے ہمارے اداکار، گلوکار بھاگ بھاگ جا کر ان کے چرن چھوتے ہیں وہاں سے جسے عزت مل جاتی ہے وہ پاکستانیوں کو حقیر جاننے لگتا ہے۔ ہمارا ٹیلنٹ، ہمارا ملک رفتہ رفتہ انڈیا کی شاباشی کا محتاج ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کی وہ پیٹھ تھپک دے وہی بڑا انسان ہوتا ہے۔ کھلاڑیوں اور اداکاروں کو تو چھوڑے ہمارے سوشل ورکر بھی وہاں جا کر ایوارڈ پاتے ہیں اور ان ہاتھوں سے پاتے ہیں، جو ہاتھ وہاں کے مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوتے ہیں اور جن کے دل پاکستان کیخلاف بغض سے لبریز ہوتے ہیں۔

انصار برنی کی دہلی ایئر پورٹ سے ڈیپورٹیشن اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم انڈیا کو خوش کرنے میں بہت ہوشیار ہیں اور وہ ہماری مٹی پلید کرنے میں۔ انہوں نے ایک پل کو بھی نہیں

سوچا کہ اس شخص نے اپنے ملک میں اتنی مخالفت مول لے کر کشمیر سنگھ جیسے جاسوس کو جو پھانسی کا مستحق تھا رہائی دلوائی جس نے اپنے ملک پہنچتے ہی کہا ہاں میں جاسوس تھا کر لو جو کرنا ہے اس کے اس بیان نے اور اسی دوران ایک پاکستانی قیدی کی بھارتی جیل سے پاکستان لاش کی صورت تحفے کا پہنچنا، انصار برنی کیلئے اپنے ہی ملک میں بہت سارے سوالوں اور بہت سارے طعنوں کا موجب بن چکا ہے۔ اتنی قربانی کے بعد اس کا حق بنتا تھا کہ وہ انڈیا میں پذیرائی پاتا مگر اس کے برعکس ہوا کیا اس کو ملی ڈیپورٹیشن۔ دیس نکالا۔ کشمیر سنگھ کے بدلے ایک لاش، انصار برنی کی کوششوں کے بدلے ائیرپورٹ سے دھکا۔

ہماری بدنصیبی کی یہی کہانی نہیں بلکہ بیہار ڈیم پر انڈیا کی ضد بازی۔ اس کی ہماری محبتوں سے بے نیازی کا ایک اور ثبوت ہے کتنے سال سے اس پر بات ہو رہی ہے 2004ء میں انڈیا جس بات پر ڈٹا تھا اس کا موقف آج بھی وہی ہے۔ 1960 Indus Treaty میں واضح طور پر لکھا تھا کہ کوئی کسی کی طرف بہنے والا پانی نہیں روکے گا۔ ایوب خان نے بڑے آرام سے تین دریا اسی چکر میں انڈیا کے قدموں میں ڈال دیئے، مگر آج جب انڈیا اسی مقام پر کھڑا ہے تو وہ ہمارے دریائے چناب کے پانی کو آزادی دینے پر تیار نہیں، وہ اس پر ڈیم بنانا چاہتا ہے اپنے ملک کے لئے بجلی بنانا چاہتا ہے چاہے ہمارا پانی ہم تک پہنچے یا نہیں۔ ہمارے انجینئر صاف صاف بتاتے ہیں کہ اس ڈیم کا ڈیزائن ایسا نہیں کہ پانی بند نہ ہو چنانچہ جس دن بند بنا ہمارے چناب کا پانی ہم تک اس طرح آزادانہ نہیں پہنچے گا مگر انڈیا بضد ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا اور وہ اس بات پر یقین ہیں کہ وہ پاکستان کو رضامند کرلیں گے۔ اب دیکھو ہمارے اگلے حکمران کب اس پر سر جھکاتے ہیں کیونکہ ہمارے رہنماؤں کی کمزوری انڈیا کو پتا ہے یونہی تو پرناب مکھر جی نے ایشوریا رائے کی فلموں کی سی ڈیز کا تحفہ ہمارے ملک کے وزیراعظم کو نہیں دیا کیونکہ ان Herebivorse کو پتہ ہے ان پاکستانی مسلمان Carnivorse رہنماؤں کی نبض کہاں دھڑکتی ہے اور ان کا دماغی IQ کیا ہے جن کی قربانیوں اور مشکلات کا یہ عالم یہ ہو کہ وہ جیل کی چار دیواری میں بیٹھ کر اپنے لیپ ٹاپ پر

ایشوریا کو دیکھتے ہوں تو سوچو ان بے چارے لیڈروں نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔جیل کی کیسی صعوبتیں برداشت کی ہیں،کتنی کھٹن زندگی گزاری ہے،کیسے کیسے ملک کے خواب دیکھے ہیں۔علامہ اقبال نے پاکستان بننے کا خواب دیکھا قائداعظم نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور اب ہمارے لیڈر انڈیا کی خوبصورت ایکٹرسوں کے خواب دیکھتے ہیں تو سوچو اس خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے انہیں کیا کیا کرنا پڑے گا۔کارگل اپنے سارے دریا،اپنے ملک کے ٹکڑے،کیا کیا کچھ نہیں نذرانہ کرنا پڑے گا۔پر اب کھرجی ابھی تو سی ڈیز دیئے گئے ہیں مگر گیلانی جی کو یہ امید دلا گئے ہیں کہ کسی دن ان کے جیل میں دیکھے گئے خواب کو بھی زندہ تعبیر میں بدل دیں گے اور سوچو جب زندہ ایش یوسف گیلانی کے خوابوں کی تعبیر دینے آ گئی؟

حالات کچھ اور ہوتے اگر ہمارے وزیر اعظم جیل کی چار دیواری میں،لیپ ٹاپ کی عیاشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو اسے اپنی معلومات کا ذریعہ بنا لیتے۔اگر وہ اپنے لیپ ٹاپ پر یہ ریسرچ کر لیتے کہ ملک میں غربت کتنی ہے اور کیوں ہے؟ ہمارا نظام تعلیم پوری صدی پیچھے ہے تو کیوں ہے؟ ایش کے گلیمر اور حسن کو دیکھنے کی بجائے اگر ان عورتوں کو غور سے دیکھ لیتے جو اپنے بچوں کو بھی مار دیتی ہیں اور غربت کے ہاتھوں خود اپنی جان بھی دے دیتی ہیں۔ایش کی نشیلی آنکھوں میں ڈوبنے کی بجائے اگر ان بچوں کی آنکھوں کا درد محسوس کر لیتے جو میرے ملک میں کوڑے سے روٹی اٹھا کر کھاتے ہیں جو کسی پیشہ ور طوائف کی طرح اپنا جسم بیچ رہے ہیں کہ ان کو دو وقت کی روٹی کھانی ہے ملکہ حسن کی اداؤں میں ڈوبنے کی بجائے اگر وہ سڑکوں پر ٹھڈے کھاتی ،ذلیل ہوتی،غریب عورتوں کے دکھوں میں ڈوبتے تو میرا ملک آج بھی کسی منزل پر پہنچ جاتا۔

میرے ملک کے وزیر اعظم کو یہ خبر ہونی چاہیے کہ ایش کی خوبصورت آنکھوں کی روشنی ان کی کسی رات کو تو اجالا بخش سکتی ہے مگر میرے ملک میں جو بجلی کے قحط سے اندھیرا پھیل رہا ہے اسے دور نہیں کر سکتی۔خوبصورتی ان کا پیٹ تو بھر سکتی ہے مگر میرے ملک میں پھیلے ہوئے گندم کے قحط کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔اپنے پاک وطن کے اس وزیر اعظم کو یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ اپنی

آنکھوں سے آگے اور اپنے پیٹ سے ہٹ کر سوچا جائے اور یا پھر اپنی آنکھیں اتنی کشادہ کر لیں کہ ان میں میرے ملک کی تمام درد سے لبریز آنکھیں سما جائیں اور اپنا پیٹ اتنا بڑا کر لیا جائے کہ تمام غریبوں کی بھوک اس میں سما جائے۔ نظر آئے تو سب خستہ حالی نظر آئے، بھوک لگے تو سب فاقہ زدوں کی سی بھوک محسوس ہو۔ پھر میں دیکھتی ہوں اس بھوک اور اس درد کے آگے کون سا حسن دیکھنا اچھا لگے گا؟

☆☆☆

آپکو آزادی مبارک، مگر ہم......؟

اس دفعہ سنا ہے جشن آزادی ملک میں بھی بہت جوش وخروش سے منایا گیا ہے اور بیرون ملک بھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا اتنا جوش کیوں، زیادہ تر کا جواب تھا...... رونق میلہ...... اس سے زیادہ ہماری سوچ وسیع نہیں ہو سکی، اور نہ اس سے زیادہ جذبہ ہمارے اندر پیدا ہو سکا ہے۔ مگر میں تو اس خیال میں ہوں کہ ہم، جو اتنی مبارک بادیں ایک دوسرے کو دیتے ہیں، جشن آزادی مبارک ہو، آپ کو بھی ہو اور آپ کو بھی تو کیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں؟ ہماری زندہ باد قوم ایک دفعہ یہ سوال خلوص دل سے اپنے آپ سے پوچھے۔۔ کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟

آزادی کے معنی ہیں اپنی رسم ورواج، اپنا دین، اپنا مذہب، اپنے اصول اور اپنے قوانین کے تحت زندگی گزارنے کا حق سب کو حاصل ہو، اپنا ملک جو جہاں سب کی عزت نفس ایک جیسی ہو، اور سب ایک جیسے لوگ اکٹھے ہو کر اپنی مرضی کا، اپنی پسند کا، اپنے ملک کی، اپنی ضرورت کے حساب سے ایک صدر، ایک وزیراعظم منتخب کر لیں۔۔۔ مگر چھوٹا سا سوال ہے کیا گزشتہ سالوں میں کبھی بھی ایسا کوئی سال آیا ہے؟ چند گھسے پٹے جمہوری سال نکال کر کبھی اس ملک کے چاند سورج نے جمہوریت کا چہرہ دیکھا ہے؟ لوگوں کی، عوام کی بالادستی کبھی کسی کو نظر آئی ہے؟۔۔ کبھی کسی کو نظر آیا ہے کہ جاگیرداری نظام ختم ہو گیا ہے یا آمریت ڈھل گئی ہے،؟ یا لوگ بہت خوش حال ہو گئے

ہیں، یا لوگوں کو کم از کم ایک جیسی روٹی نہ صحیح ایک جیسی عزت مل رہی ہے؟

ہم جشن کس چیز کا مناتے ہیں، میں صوبائی وزراء کرام کے بیان پڑھ رہی تھی جس میں انہوں نے قوم کو متنبہ کیا ہوا تھا، مجھے یوں لگا جیسے یہ کوئی اعلان نہیں، امکان نہیں کوئی دھمکی دی ہو……اس دفعہ 14 اگست لوگ ملی جوش وخروش سے منائیں گے۔۔(خبردار)۔اس دھمکی کے بعد کون ہے جو ملی جوش کا اظہار نہیں کرے گا؟ مگر وزراء کرام یہ بھی بتا دیں تا کہ یہ ملی جوش ملے گا کہاں سے، جیسے بسنت کے موقع پر گڈی فروش اپنا بزنس چمکاتے ہیں،موسمی دکانیں جگہ جگہ کھل جاتی ہیں، اسی طرح ہمارے وزراء کو چاہیے ملی جذبے کی دکانیں کھول لیا کریں،قومی یک جہتی کے سٹال لگا لیا کریں، رنگ برنگی ڈور کی طرح عزت نفس کو بیچنے پر لگا دیا کریں، لوگوں کو اس کے گولے بنا بنا کر بیچا کریں، وتار کا ڈھول بجانے والے ساتھ کر دیا کریں تو آزادی کے اس جذبے کو لوگ صرف موٹر سائیکلوں کے سائلنسر نکال ہی ظاہر نہیں کریں گے اور بھی لوازمات سے مالا مال ہو جائیں گے۔کیوں کے جیسے بسنت کے بعد سب ساز وسامان ناکارہ ہو جاتا ہے جشن آزادی کے بعد اس سامان کو بھی ناکارہ ہی سمجھیے۔۔۔کیوں کے یہ اہم لوازمات اگر 14 اگست کے دن بھی کہیں پڑے مل جائیں تو بہت غنیمت ہیں۔بعد میں تو موسمی سامان ناکارہ ہوتا ہی ہوتا ہے۔مگر یہ کیسا جشن ہے جس میں اہم لوازمات ہی دستیاب نہیں ہوتے۔

غربت کو چھوڑیے آج ہم ایک دوسرے کو عزت دینے کو تیار نہیں،عزت نفس جیسی کوئی چڑیا ہمارے ہاں نہیں گھونسلہ بناتی۔ملک کی بات کرتے ہوئے لوگ اب اس مخمصے میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا یہ ملک جو بنا تو ٹھیک فیصلہ تھا؟ یا ایسے ہی بے گناہوں کو خون بہانا پڑا؟ کیوں کہ آج اتنے سال کے بعد بھی ہم اسی پوزیشن پر کھڑے ہیں،ہم اپنے کلچر کو نہیں بچا سکتے، نہ ہم اپنے مذہب کو بچا سکتے ہیں۔امریکہ کی اتنی خوشامد کر کے بھی ہم کوئی انٹرنیشنل لیول پر اپنا نہیں مقام بنا سکتے ہیں ہر دوسرے دن بڑے بھگوان کے چرنوں میں اپنے نوجوانوں (دہشت گرد قرار دے کر) کی بلی چڑھا چڑھا کر بھی ہم سب بڑے چھوٹے ممالک کی مشکوک لسٹوں میں سرفہرست

ہیں، ہم اتنا تر دو کر کے بھی بے عزتی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ کیا اس بات کے لئے ملی جوش کے ساتھ 14 اگست منانے کی ضرورت ہے؟

قومی یک جہتی کا نام ونشان نہیں، ملک تو چھوڑ دو، یہاں کینیڈا میں چند نوجوان دہشت گردی کے الزام میں پکڑے گئے تو فوراً ہر فرقے نے اپنا اپنا الگ ماتم پیش کیا، کسی نے وہاں پر قومی یا مذہبی جوش وجذبے کا اظہار نہیں کیا ہر کسی نے کہا میں نہیں ۔۔ وہ۔ شیعہ، سنی، اور نہ جانے کون کون سے فرقے ۔۔ ہم بھرے پڑے ہیں ان فرقوں سے، ہمارے اندر فرقہ پرستی فروغ پا گئی ہے کیا یہ سب فرقے مل کر جشن آزادی منانے کی جرات رکھتے ہیں؟ کیا یہ مہاجر، بلوچی، پنجابی، سندھی اپنا اپنا جشن آزادی منانے کے مستحق ہیں؟ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ اس کے لئے سب کو پاکستانی ہونا ہی کافی ہے۔ جب ہم میں سے کوئی پاکستانی ہے ہی نہیں کوئی کچھ ہے تو کوئی کچھ۔ تو کیا ہم جشن آزادی منانے کے اہل ہیں؟ ہم نے تو دیکھا لبنان میں شیعہ، سنی اور عیسائی حکومت نے مل کر اپنے ملک کی سلامتی کے لئے ایک فیصلہ کیا، انہوں نے کبھی بھی انقلابی جماعت کو دہشت گرد قرار دے کر امریکہ کی شاباشی حاصل نہیں کی، مشکل میں سب نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہے اپنے سے سو گنا طاقتور اور بڑے دشمن کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے، اپنی عزت اور اپنا وقار برقرار رکھا۔ کاش ہم اپنے قائد کا دیا ہوا سبق جو اب ہم بھول چکے ہیں، لبنان کی اس فتح میں (میں اسے فتح ہی کہوں گی) سے ہی دوبارہ دیکھ لیں، کاش ہم ڈھول بجانے، بتاشے بانٹنے او اعلان کرنے کے علاوہ کوئی قوم اور ملک کی یک جہتی اور اتحاد کے لئے عملی طور پر کچھ کر لیں۔

ہمیں اس وقت سب سطحوں پر اتحاد کی ضرورت ہے۔ کیا ہمارے لیڈروں نے آج کے دن اس عزم کا اظہار کیا ہے؟ اظہار تو کر ہی دیا ہوگا کیا صدق دل سے اپنے آپ سے، اس کو لوگوں کے دلوں میں بسانے کا عزم کیا ہے۔۔ ہم ایک دفعہ پاکستان میں بسنے والے لوگوں کی عزت نفس ان کو لوٹا دیں، ہم ایک دفعہ سب لوگوں کو متحد کر دیں، ہم ایک دفعہ ملک میں انصاف کی خوشبو پھیلا دیں، ہم اس طرح کے چند ایک کام کر لیں پھر ہمیں جشن آزادی کو ملی جذبے سے

منوانے کے لئے لوگوں کو دھمکی آمیز اعلان نہیں کرنے پڑیں گے۔لوگوں میں، خود ہی اتنا جوش بھر جائے گا کہ وہ اس دن کو اس طرح منائیں گے کہ حق ادا ہو جائے گا۔کیوں کہ یہ زندہ باد قوم ہے۔ اس کو وقتی غفلت سے بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔اور اس کے لئے عملی طور پر کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔نعرے بہت سن لئے۔اعلان بہت ہو، لئے اب بیداری کے لئے کچھ نیا، کچھ اچھوتا، کچھ انوکھا، کچھ عملی ہو تو بات ہے۔

ہٹلر 2007

قدیم روم سے ڈکٹیٹر کا تصور 2000 سال پہلے اس دنیا میں متعارف ہوا۔ جولیس سیزر نے اپنے آپ کو سینہ ٹھونک کر کہا۔(dictator of the life) سیزر کے قتل کے بعد یہ لفظ کہیں کھو گیا، مگر اس کا تصور نہ مٹا سولہویں صدی کے آخر میں فرانس اور امریکہ کے لوگوں نے شہنشاہیت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور نئی جمہوری حکومتیں بنائیں۔ میں سوچتی ہوں کون لوگ تھے جنہوں نے بغاوتیں کرنے کی جراتیں بھی کیں اور پھل بھی سمیٹے۔ اور آج فرانس امریکہ کے لوگ ان بے لوث بغاوتوں کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد غربت پھیلی تو جو ملک زیادہ ڈسے ہوئے تھے جیسے کہ جرمنی، وہاں پر فاشزم اور ڈکٹیٹر شپ کے لئے زمین زرخیز ہو گئی، اسی زمین نے ہٹلر پوری دنیا پر ٹھونسا۔ یورپ سے ایشیا، ایشیاء سے لاطینی امریکہ ہو ہر جگہ ہٹلر جیسے لیڈر یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کے سب مسئلے حل کر دیں گے انہیں بس طاقت دے دی جائے۔

آج نظر اٹھا کر دیکھیں کیا پاکستان اس زمانے کے جرمنی سے مختلف ہے۔ یہاں بھی غربت ہے، بے روزگاری ہے Inflation ہے اور ذلت ہے اسی لئے تو یہ زمین ڈکٹیٹر پر ڈکٹیٹر جنتی جا رہی ہے اور نہ صرف جنتی ہے بلکہ اس کو اتنا توانا اور مضبوط کرتی ہے کہ وہ ہرکولیس بن جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی شکست نے جرمنی کی سرزمین کو ہٹلر دیا اور ہمیں کس نے آمروں کی کھیپ کی کھیپ دی، کیا ہم سوچ لیں کہ 1947 کی جدوجہد کا پھل ہمیں آمر ہی مل گئے ہیں جو کہتے ہیں حالات بہت خراب ہیں اور صرف میں ہی ہوں جو انہیں ٹھیک کر سکتا ہوں۔

جب ہٹلر کی حکومت ایک back room deal سے گھس آئی ،30jan

1933 کا دن تھا، تاریخ کی بدترین شدید کرپٹ اور ظالم ترین حکومت کا قیام ہوا یا س ہٹلر کی آمد تھی جو اپنے ہوسٹل کے دنوں میں سپین میں پھیلی کرپشن کو دیکھ کر کڑھتا تھا، اس ہٹلر نے تاریخ کی سب سے کرپٹ حکومت کرنے کا اعزاز حاصل کیا مگر لگتا ہے شرف نے اس کا ریکارڈ توڑ دیا ہے قومی مفاہمتی آرڈیننس کے ایسے عجوبے جسے سن کر عقل حیران اور دماغ سن ہے۔ مزے کی بات ہے ہٹلر کو بھی کرپشن سے نفرت تھی اور حضور والا بھی اپنی آٹھ سالہ خدائی میں کرپشن کرنے والوں پر لعن طعن کرتے رہے ہیں اور اس کو کرنے والوں کو انجام تک پہنچانے کے لئے لاکھوں کڑوروں خرچ کر چکے ہیں۔ اس ہٹلر نے reichstag (پارلیمنٹ) کو آگ میں جھونک کر اپنے لئے فضائیں ہموار کی تھیں اور ہمارے ہٹلر نے ٹی وی چینلوں، صحافی حضرات و روکلا، کو نظر آتش کر کے اپنے اقتدار کو دوام بخشا ہے۔ ہٹلر نے الیکشن سے پہلے لگ بھگ 1000 لوگ جیلوں میں ڈالے اور ہمارے سرہٹلر کی تو گنتی ہی کوئی نہیں، شائد تاریخ کبھی صحیح تعداد باہر نکال دے۔ مار دھاڑ، خون خرابے سے نازی پارٹی کو (ہٹلر کی پارٹی) کو 17 ملین ووٹ پڑے تھے 44 فی صد مخالفین کو کہ وہ جیلوں میں تھے مفرور تھے پھر بھی 30 فی صدی ووٹ ملے مگر کس کو پروا، ہٹلر نے سب کو ہٹا کر اپنی حکومت بنائی جس نے بھی جیسے نیشنلسٹ پارٹی نے اس کے ساتھ الحاق کیا، وہ بچ گئی باقی سب پارٹیاں ختم کر دیں۔ ایک ہی پارٹی تھی حکومتی پارٹی، ق لیگ پارٹی۔ سوری! نازی پارٹی ..... تو آج ہماری نازی پارٹی براجمان ہے جو نہیں نازی وہ عمران خان کی طرح زرد چہرے اور پریشان سوالیہ آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتے اور سوچتے ہیں۔

ہٹلر کی مخالفت کرنے والے تو پھر بھی سوشل ڈیمو کریٹک یا کنز رویٹو تھے، ہماری نازی پارٹی کی مخالفت کرنے والا کون ہے، کون کوڑے کھائے گا اور کون جیلوں میں جائے گا..... کون حقیقی اپوزیشن ہے، 1933 کی نازی پارٹی بھی اتنی خطرناک نہیں تھی جتنی آج کی ہے دیکھو، اس کی تو اپوزیشن میں ہی کوئی نہیں سب اس کے allies ہے اور سب اب جنرل الیکشن میں منتخب ہو کر حلف کچھ یوں اٹھائیں گے،

i swear by God this holy oath: i will give unconditional obedience to the fuhrer (leader) of the pakistan reich (empire) and people, Adolf Hitler Musharar, the supreme commander of the armed forecs and will be ready as a brave soldier, to lay down my life at any time for this oath"

ترجمہ: میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ حلف اٹھاتا ہوں میں اپنی غیر مشروط فرمانبرداری کا پاکستان کے صدر مشرف، وردی میں ہوں یا وردی کے بغیر انہیں یقین دلاتا ہوں اور اس حلف کو پورا کرنے کے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔کون عوام، کیسے قانون اور کس کا ملک۔۔ ہم تو شہنشاہ کے غلام ہیں۔ ہمارے گلے میں پڑی طوقیں دکھتی کیوں نہیں؟ یہ صحافی کیوں بلاضرورت، بےوقوفوں والے سوال کرتے رہتے ہیں؟

ہٹلر نے اپنی مخالف پارٹی سوشل ڈیموکریٹک کو An enemy of the people قرار دے دیا تھا، آج کی نازی پارٹی نے اخلاق، اصول، ضمیر، غیرت کو an enemy of the people قرار دیا ہے۔ 12 مئی کا خون، الیکشن کمیشن کے دفتر کے باہر خون کے بہت سے رنگ، وزیرستان میں خون کی ہولی، حماد رضا کے چہرے پر پھیلا خون، کیا یہ وہی خون نہیں ہے Pablo picasso نے پہلی ہٹلر کی شہری آبادی پر بمباری کے بعد اپنی مشہور پینٹنگ Guernica میں دکھایا ہے۔اور کیا ہٹلر نے پارلیمنٹ اور تب کے صدر Hindenburg کے ہوتے ہوئے ایسا قانون پاس نہیں کروایا تھا کہ ہر فیصلہ اس کا ہوگا۔۔

جیسا آج ہمارے ہٹلر نے ہر قانون کی بازو مروڑ اپنی جیب میں ڈال لی ہے۔ ہر ہاں اس کی اور ہر نہ اپوزیشن کی۔۔ (اپوزیشن میں شاید صرف وکیل ہیں اور تنہا عمران خان) کیا مشرف کے پاس نازی stormtroopers کی کمی ہے؟ نہیں بلکہ زیادتی ہے شیر افگن، آغا، وصی ظفر، شیخ رشید، اعجاز الحق، پرویزالہی اور چوہدری شجاعت۔وغیرہ وغیرہ (اگر کسی کا نام رہ گیا تو معاف کر دینا، ناراض نہ ہونا، میں بھول بھی سکتی ہوں مگر آپ کو تاریخ کبھی نہیں بھولے گی) یہ وہ

troopers ہے جن کی طاقت ان کی زبان میں ہے اور ایسا برسٹ مارتے ہیں کہ جانے اگلے کی بلا۔۔ بولتے جاتے ہیں بولتے جاتے ہیں، کہیں رکتے نہیں ہٹلر کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور پھر ایوان صدر سے شاباشی لے کر آتے ہیں اور پھولے نہیں سماتے۔۔ اتنے مضبوط اور اتنے فولادی تو شائد جرمنی کے ہٹلر کے سپوت بھی نہیں تھے۔ وہ بھی شائد کبھی ظلم کرتے ہوئے شرماتے ہونگے۔ وہ ہٹلر کیلئے 17 ملین ووٹ اکھٹے کر سکے۔

مشرف کے Stormtroops کا بس چلے تو سولہ کروڑ ووٹ مشرف کی آنکھ کی ایک جنبش پر نثار کر دیں اور وہ لوگ تو ویسے بھی جرمنی کی سرحدوں کی حفاظت اور اپنی طاقت کو دوسری ملکوں پر بھی آزماتے تھے، وہ تو شائد جرمنی کو دنیا کی طاقتور ترین قوم بنانے کے لئے ظلم پر تلے ہوئے تھے مگر ہمارے نازی صرف مشرف کی جیت وہ بھی اپنے پاکستانیوں سے صرف ایک ہی مشن پر جتے ہیں، دوسرے ملک تو انہیں ٹھینگا دکھاتے ہیں، جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں، مگر یہ بڑے ہی سمجھ و دانش والے ہیں۔ فرماتے ہیں!

گھر کی رکھوالی کی ہم میں استطاعت ہی نہیں
ہم نے اخراجات گرچہ کر لئے ہیں کم سے کم
اپنے ہمسایوں کے کتے بھونکتے ہیں رات میں
اپنے گھر میں بھونک لیتے ہیں سبھی مل جل کے ہم

یہ 2007ء کی نازی طاقت ہے۔ جنھیں اپنی جہالیت پر بڑا ناز ہے اور شائد ان کی سب سے بڑی طاقت بھی یہی جہالیت ہے۔ Rome- berlin axis صرف جرمنی کے ہٹلر نے ہی نہیں کے ہم نے بھی بڑے آمریت اور جمہوریت کے نعرہ بازوں کا ایک پلیٹ میں کھانا کھاتے دیکھا ہے، کس بات میں ہمارا ہٹلر پیچھے ہے۔ پیچھے تو جرمنی ہے جس کو ہٹلر بہت پرانی تاریخوں میں ملا، ہمیں تو ہٹلر آج ملا ہے۔۔ اتنے جدید دور میں اور آج ہی کی اس تاریخ میں ہمیں جمہوریت کی رانی بھی میسر ہے جس نے اٹلی کی طرح ہٹلر سے ہاتھ ملائے ہیں۔

ہمیں آج کے ترقی یافتہ دور میں ہٹلر دستیاب ہے، جرمنی تو بس بہت پیچھے رہ گیا اب۔۔

اب ہم کہاں اور وہ کہاں ۔۔ بس ختم شد سے پہلے ایک بات عرض کرتا ہے ہٹلر نے جرمنی میں 13 سال حکومت کی، لوہے کا ہاتھ گھماتا رہا اپنے ملک میں حکومت کی تو سب پولیٹیکل پارٹیاں کھا گیا صرف ایک پارٹی بچی جو اس کے ساتھ تھی، اس کے مخالفوں کا کوئی وجود نہیں چھوڑا، کوئی نشان نہیں چھوڑا، اس کو 17 ملین ووٹ ملے جب وہ اپنے ملک سے باہر نکلا جب اس شیر کے منہ کو خون لگ گیا تو وہ سپین، آسٹریا، چیکوسلوا کیا، سب ہضم کرتا گیا، پولینڈ پر آ کر بڑی طاقتیں اس کے آگے اڑ گئیں، فرانس اور برطانیہ نے اسے للکار دیا۔ ظلم حد سے بڑھ گیا تھا، مصلحت کے تحت چپ ہو جانے والے بڑے ملک یکجا ہوئے اور دوسری جنگ عظیم کی بنیاد پڑی 50 ملین تک لوگ مر گئے۔

ہٹلر کو لگتا ہوگا اس نے اپنے ملک کے لئے کارنامے سرانجام دیئے ہیں مگر آج وہ ایک نفرت کی علامت بن کر رہ گیا ہے حال تو یہ ہے کہ اس عظیم فاتح کی ایک بھی memorial نہیں ہے کہاں دفن ہے؟ اس کی راکھ کہاں ہے اس کی کھوپڑی کے ساتھ روس میں ہے یا مشرقی یورپ کی ہواؤں میں تحلیل ہے؟ اس کی قبر کہاں ہے اور کون اس پر جاتا ہے روس نے مصلحتوں کے تحت اس راز کو دبا دیا ہے۔ یہ مصلحت تو زندہ لوگوں کے لئے ہے مگر اس ہٹلر کا قدرت نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس کی قبر پر دعا بھی نہ ہو سکے۔ کوئی بھولا بھٹکا بھی نہ پہنچ پائے۔۔ کیا یہی انجام ہم اکثر آمروں کا نہیں دیکھتے۔۔ پھر کراچی کے ساحلوں پر 18 اکتوبر کو بھاری اکثریت سے جیتنے والے صرف ایک ہی حکومتی پارٹی کا نقشہ دینے والے، کامیاب، لازوال اور سمجھدار ہٹلر پاکستان کے لئے اتنی آتش بازی کس خوشی میں؟ مٹھائیوں کی تقسیم کس لالچ میں؟ لوگ بک جاتے ہیں، مر جاتے ہیں، مگر نظریے دوام پاتے ہیں کسی ایک شخص کی حکومت سے قومیں ترقی نہیں کرتیں قانون اور مساوی حقوق زندگیوں کو رہنے کے قابل بناتے ہیں، زمین کے حقائق اور عدالتیں نظریہ ضرورت کو اپنا سکتی ہیں مگر میرا رب ان سب چیزوں سے بے نیاز ہے اس کے انصاف کو کیسے خریدیں گے، کوئی ہٹلر ایسا پیدا ہو سکتا ہے جو دنیا کی سب چیزیں بھی جیب میں ڈال لے اور خدا کے فیصلوں کو بھی موم کی ناک کی طرح اپنے حق میں موڑ لے۔

☆☆☆

جگہ جگہ موت بکھری ہوئی ہے

ایک قتل ہوتا ہے جسمانی۔۔۔ جیسا کہ ہمارے ملک پاکستان میں آجکل بہت عام ہے، جگہ جگہ موت بکھری ہوئی ہے۔کوئی اندھی گولی سے مرتا ہے تو کوئی ٹرالے کی ٹکر سے۔۔کوئی موٹر سائیکل سے گرتا ہے تو کوئی خودکش حملے میں۔۔کوئی ہیپاٹائٹس سے لڑھک جاتا ہے تو کوئی زلزلے میں دب جاتا ہے۔کبھی بس کھائی میں تو کبھی ٹرین پٹڑی سے اتر کر موت لاتی ہے۔ ہر طرف موت کی کہانی ہے،اجل کا پہرہ ہے۔موت اور موت کی وحشت بادل کی طرح سروں پر منڈلاتے ہیں۔اور ایک موت ہے جو ہمیں محسوس نہیں ہو رہی نہ نظر آ رہی ہے مگر جو جسمانی موت سے کہیں زیادہ ہولناک ہے۔۔ یہ موت ایسی ہے جو جاپان پر ہیروشیما بر سا۔۔تو جو مر گئے سو مر گئے مگر جن کے اندر ایٹمی ذرے چلے گئے اور جو ذہنی اور جسمانی معذور بن گئے۔ان کا جو حال ہے وہ اس میں پنہاں ہے۔اندر باہر سے کھوکھلا۔جسمانی اموات سے پہلے کی وحشت اور بعد کے کرب نے کتھارسس کا ایک نیا روپ لیا ہے۔آٹے،روٹی اور بجلی کے چکروں میں کھجل ہوتی عوام کی لذت نے دیکھو جائے پناہ کہاں ڈھونڈی ہے۔۔ایک قتل میں۔

وہ قتل ہے ہماری تہذیب،معیار،شرافت عزت اور شرم و حیا کا۔اس کا قاتل کون

ہے۔۔وہ مفرور ہے اور وہ حاضر بھی ہے۔وہ ہم میں سے نہیں ہے اور ہم میں ہی ہر دم موجود ہے ۔وہ عوام ہے یا راجہ۔۔؟ تماشائی ہے یا لکھاری؟ فنکار ہے یا ہدایتکار؟ عوام کی خواہش ہے یا فنکار کی گراوٹ؟ اسکا فیصلہ ہونا باقی ہے۔۔اس کا فیصلہ ہمارے ہاتھوں ہونا ہی باقی ہے۔ہم تقریباً زندگی کے ہر اس شعبے میں پستی میں گر چکے ہیں جن میں ہمیں کمال تھا۔۔کھیل۔۔سیاست ۔۔فلم۔۔فوج۔۔غیرت۔۔تجارت، ڈرامہ ،مزاح اور میوزک۔۔۔ان شعبوں میں جو موت واقع ہو چکی ہے وہ طبعی نہیں ہے۔۔اس کا قتل ہوا ہے اور قاتل دندناتے پھرتے ہیں۔۔اور ہم ہمیشہ کی طرح قاتل کے نام اور پتے سے ناواقف ہیں۔

پاکستان میں سٹیج ڈرامے کی تنزلی ایک بڑا دل دہلا دینے والی حقیقت ہے۔

ایم۔اے انگلش میں ڈرامہ پڑھا تو سٹیج ڈرامے سے محبت پیدا ہوئی۔شیکسپیئر ،برنارڈ شاہ کے لکھے ڈراموں نے ذہن پر اس فن کا بہت اثر چھوڑا۔سٹیج ڈرامہ ایک خوبصورت آرٹ ہے۔اس کے بعد یوں ہوا کہ اچانک پاکستانی سٹیج ڈرامے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔اجو کا تھیٹر وغیرہ دیکھنے شروع کیے مگر جو پنجابی کامیڈی ڈرامے میں طنز اور مزاح تھا۔اس کا جواب کہیں نہیں ملا۔سٹیج پر بہت سنجیدگی سے کہی جائے تو اتنا تاثر نہیں چھوڑتی جتنی دو رخی ۔کاٹتی ہوئی اور بل کھاتی ہوئی بات اپنا اثر رکھتی ہے اسی لئے شیکسپیئر کے بہت ڈرامے ٹریجک کامیڈی بھی ہیں ابتدا میں پاکستان کے سٹیج ڈراموں کو میں نے کسی بھی ملک کے تھیٹر سے پیچھے نہ پایا۔مقابلہ کیا تو کئی جگہوں پر اپنے محدود وسائل میں پاکستانی سٹیج ڈرامہ بہت آگے نظر آیا۔امان اللہ ،مستانہ، سہیل احمد، خالد عباس ڈار اور البیلا اور بہت سے ایسے منجھے ہوئے اداکاروں کے دم سے سٹیج اپنی بلندیوں کی انتہاوں کو چھو رہا تھا۔امان اللہ کی حاضر جوابی، مزاح اور ذہانت کے سامنے بڑے بڑے پانی بھرتے نظر آتے۔

امان اللہ اور سہیل احمد کی جوڑی شائد سٹیج ڈراموں کی سب سے زبردست جوڑی تھی۔

ان کے ڈراموں میں اعلی پائے کا مذاق تو موجود ہی ہوتا مگر ایک پیغام ،ایک سنجیدہ نکتہ نظر، ملکی اور سیاسی حالات پر ہلکے پھلکے طنز۔سماجی اور معاشرتی مسئلوں پر اس انداز سے گفتگو موجود ہوتی کہ

پورے معاشرے کی عکاسی ہو جاتی ۔کمزوریاں اچھل کر سامنے آجاتیں اوراچھائیاں بھی کہیں اوجھل نہ ہوتیں ان ڈراموں میں ۔ ڈبل سواری، اک تیرا صنم خانہ اور کیچ اپ ایسے ڈرامے ہیں جن کی تعریف نہ کرنا مینگی ہوگی ۔ ۔ سہیل احمد کے اور بھی کئی لاتعداد ڈرامے ہیں جن میں اس ذہین فنکار نے نہ صرف مزاح کی حدود کو چھوا ہے بلکہ عام لوگوں کو بہت بامعنی پیغامات دیئے ہیں اگر اسے پاکستان کا Tyler Perry کہا جائے تو مبالغہ آمیزی نہ ہوگی ۔آجکل وہ دنیا ٹی وی چینل پر حسب حال میں اپنے جوہر دکھارہے ہیں ۔ ہمارے مزاح لکھنے والے اور کرنے والے مجھے ان جیسا پورے ایشیاء میں کوئی نظر نہیں آتا ۔ لاکھ گھٹن کے باوجود یہ وہ ٹیلنٹ تھا اور ہے جو بجھ نہیں سکا بلکہ اور بھڑکا ۔ ۔ ۔ انور مقصود، معین اختر ، بشریٰ انصاری اور عمر شریف کے پائے کا ایک بھی کامیڈین پورے برصغیر میں نہیں ہے یہ لوگ اپنے اپنے مخصوص دائروں میں حرکت کرتے رہے اور ان پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں ۔

دکھ تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جب سٹیج ڈرامے کے قتل کی خبر ہم تک پہنچتی ہے اور جس تھیٹر میں ہم نے کبھی ڈبل سواری جیسا معیاری اور بامقصد ڈرامہ قہقہوں کے درمیاں دیکھا تھا ۔ ۔ اسی سٹیج پر ہم نے ڈرامے کے نام پر کوٹھوں کے مجرے اور بازاری جگت بازی تو دور کی بات ہے ،مزاح کے نام پر بے حیائی دیکھی اور گالی گلوچ سنی اور باہر لگا بورڈ بتا رہا تھا کہ یہ سٹیج ڈرامہ مزاح سے بھرپور ہے اور مسلسل قہقہوں کا طوفان ہوگا ۔ ۔ مگر ہمیں ہال میں پھیلے ہوئے خون کی خوشبو محسوس ہوتی رہی اور قاتل قتل کر کے تماشائیوں کے منہ پر کپڑے اتار کر پھینک رہے تھے ۔ ۔ اور ہر طرف بے ہنگم اچھل کود تھی ۔ اس شور کے درمیاں ایک لاش پڑی تھی ۔ ہمارے فخر ، ہمارے مزاح اور ہماری ذہانت کی اور سٹیج کا بے تاج بادشاہ امان اللہ ۔ ۔ رقص کرنے والی لڑکیوں کے دوپٹے اٹھا اٹھا کر صوفے پر رکھ رہا تھا ۔ ۔ اور برصغیر کا بہت بڑا اداکار ۔ ۔ اور خوبصورت انسان ۔ ۔ سہیل احمد ۔ ۔ سٹیج پر لڑکیوں کے رقص اور فحش گفتگو کے خلاف جنگ کرتا کرتا ۔ ۔ تھک کر ایک کونے میں کھڑا ۔ ۔ وہی رقص دیکھ رہا تھا ۔ ۔ جسے دیکھنے لوگ سٹیج پر آئے تھے ۔ ۔ اور جن کی ذہنی سطح اس بات پر آ کر

رک گئی تھی کہ لاؤ لڑکی نکالو۔ ۔اور ڈانس شروع کرواؤ۔ ۔ ۔ سٹیج پر ڈرامہ کہیں نہیں تھا۔ ۔لڑکیوں کی تجارت کا ایک نیا بازار گرم تھا۔ ۔تماشائیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کرناچتی کو وقتی اشارے کرتیں، اپنا ریٹ بتاتیں رقاصائیں تھیں۔ ۔ ۔ پیچھے چلنے والا میوزک صرف شور تھا اور اس شور میں جو گانے کے بول تھے وہ مغرب کی کال گرلز کے سکرین پر چلنے والے اشتہار سے زیادہ ہیجان برپا کرنے والے تھے۔ ۔اور باہر لگا بورڈ اس بات پر بضد تھا کہ یہ معیاری فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے والا ڈرامہ ہے اور میں یہی سوچتی رہی۔ ۔قاتل کون ہے؟ ہماری ثقافت، شرافت، ذہانت، مزاح اور غیرت کا قاتل کون ہے؟ تماشائی یا فنکار؟ ہدایتکار یا پولیس؟ حکام یا فریادی؟ ہوا میں پھیلی گھٹن یا ہمارے اندر کا تعفن؟ مولویوں کی پھیلائی فرسٹریشن یا لبرل ازم کے نام پر پھیلا گند؟ ہمارے انمول موتی جیسے فنکار بے بسی سے سٹیج کی دھند میں غائب ہو چکے اور ہو رہے ہیں پیچھے کیا رہ گیا ہے ہر شعبے کی طرح۔ ۔ ۔رنڈی بازی۔ ۔ ۔بکنا۔ ۔خریدنا۔ ۔ ۔بازاری فقرے۔ ۔ ۔ جو سیاست میں ہو رہا ہے وہی سٹیج پر۔ ۔ کہیں تو کچھ فرق ہو۔ ۔ ۔یا ہم نے ہر شعبے میں ہی ناچ کر کمانے کو ذریعہ بنالیا ہے۔ ۔بک کر روٹی کمانے کو وطیرہ بنالیا ہے غیرت بیچ کر بے غیرتی اوڑھ لی ہے۔

قیمتی کپڑوں کے پیچھے سے ننگا پن دکھانا۔ ۔ہیلی کاپٹروں پر بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں اور ننگے رقص کر کر عزت کماتے ہیں۔ ۔ ۔اور آخر میں سب ایک رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ ۔بولنے والا یا مٹ جاتا ہے یا اسی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ ۔ ۔پورا ملک ایک ہی رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ ۔مگر اس ملک کے ہر شعبے کا قاتل بھی اسی طرح نامعلوم ہے جیسے ہمارے لیڈروں اور عام انسانوں کے قاتل نامعلوم ہیں اور آزاد ہیں۔ ۔اور یہ ملک قاتلوں کے سروں پر تاج سجانے والا ملک بن چکا ہے۔ ۔ ۔آج اس ملک میں ہر بکنے والی چیز قابل عزت بن چکی ہے۔ ۔ ۔اور یہاں بکاؤ مال سروں پر سونے کے تاج سجائے بیٹھے ہیں، اور جب حالات یہ ہو جائیں، برائی عزت کا راستہ بن جائے، تو ؟؟؟؟

☆☆☆

پاکستانی عوام کا اپنے سیاست دانوں کو خراجِ تحسین

ایک شاعر دوست کو غصہ بہت آتا ہے۔ اور غصہ اسے تب تب آتا ہے جب جب وہ منافقت، دھوکہ بازی اور خوشامد کو کامیاب ہوتے دیکھتا ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں: تم اپنے حصے کا کام کرو۔ اعلیٰ پائے کی شاعری تخلیق کرتے جاؤ۔ اور لوگوں کو ان کے کردار کے ساتھ چھوڑ دو۔ جو اوپر بیٹھا ہے اس نے کٹھ پتلیاں اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں، ان تک ہماری رسائی نہیں، کس کی تان کب کھینچی ہے اور کب ڈھیلی رکھنی ہے اس میں ہم اپنا ہاتھ نہیں ڈال سکتے، یہ اسکا کام ہے وہ ہی جانے۔ مگر وہ مانتا نہیں۔ اور میں اس کو سمجھانے کے بعد سوچتی ہوں کیا یہ بات مجھے سمجھ میں آ گئی ہے؟ کیا منافقت بھرے چہرے، دھوکہ بھرے دل، خودغرض، مطلبی اور خوشامدی لوگ مجھے ہضم ہو گئے ہیں۔

میں اپنے تئیں سمجھتی ہوں کہ شائد میں نے دنیا میں رہنا سیکھ لیا ہے۔ میں وقت کے ساتھ ساتھ سمجھدار ہو گئی ہوں۔ مجھے لوگوں کی پہچان ہے اور میں نے منافقت، جھوٹ اور خوشامد کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ اسی لئے میں اس شاعر کو سمجھا رہی ہوں اور پھر میری ایک بہت پرانی دوست آتی ہے، وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔ تمھارے اندر یہ کیسی تبدیلی ہے؟ تم خاموش ہو

اور سنجیدہ ہو، تم خاموش کیوں ہو؟ ہم اس وقت سے دوست ہیں جب ہم سولہ سولہ سال کی تھیں وہ مجھ سے پوچھتی ہے تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوتی تھی تمھیں کیا ہے؟ تم اب پہلے کی طرح ہنستی کیوں نہیں ہو؟ تم بچوں کی طرح معصوم اور صاف دل کی ہوتی تھیں، بڑی سے بڑی غلطی اور بات بھول کر ہنس دیتی تھی ۔۔اب لگتا ہے تم بھولتی نہیں ،تم کون ہو؟ ۔ میں کون ہوں؟؟؟ اور وہیں سے میرے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ میں جو سمجھتی ہوں کہ دنیا کے دھوکے اور دو دو چہرے جن کے ساتھ میں نے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔اور جب احترام اور خلوص کا مذاق اڑایا جاتا ہے، جب عزت کو بے عزتی میں بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب شفاف دلوں کو گندے ارادوں سے تولا جاتا ہے، جب صاف نیتی اور شفاف محبتوں کو کم عقلی اور بد نیتی کا غسل دیا جاتا ہے۔ جب اعتماد کے چہرے پر بےاعتمادی اور نفرت کی کالک ملنے کی کوشش کی جاتی ہے۔تو وہ سب دیکھتے دیکھتے سہتے سہتے میں کہیں پیچھے رہ گئی اور آگے جو بڑھتی جا رہی ہے وہ میں کہاں؟ وہ تو وہ ہے جس نے زندگی کے اصل، اور ظالم رنگ سے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔اور زندگی کی یہی بےرنگی زندگی کا اصل رنگ ہے۔

میں اس دوست کو سمجھاتی ہوں منافقت اور دھوکے سے ہاتھ ملا لو مگر یہ نہیں بتاتی کہ اس کے بعد وجود کے اندر کیسی خاموشی اترتی ہے۔ نہ کسی پر اعتبار، نہ کسی کا یقین، اور وہ آنکھیں جو کسی کا اعتبار کرتی ہیں اور وہ دل جو یقین سے بھرے ہوتے ہیں ان کی تازگی کا، اور حسن کا کوئی جواب نہیں اور جوان سے خالی ہو جائے وہ خزاں کے رنگا رنگ سوکھے پتوں کی طرح اڑتا پھرتا ہے ۔جو رنگا رنگ رنگوں سے رنگ تو گیا ہے مگر سوکھ گیا ہے پھر ہم مسکرائیں کیسے اور آنکھوں کی روشنی کہاں سے لائیں۔۔اور دلوں میں بچوں کی معصومیت کہاں سے بھریں؟

منافقت، جھوٹ اور دھوکہ ہماری زندگیوں میں اس طرح شامل ہو گیا ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ کوئی غلط عادات ہیں، بلکہ جن میں نہیں وہ پاگل لگتے ہیں۔ناکامیاب ہیں اور اپنا سر پیٹتے رہتے ہیں ہماری قوم کا قصور پتہ ہے کیا ہے؟ وہ اپنی غلاظت داڑھی اور دوپٹے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بات جب ایک بڑے میاں نے مجھ سے کہی تو میں دنگ رہ گئی۔۔اس بات

میں ہماری پوری پاکستانی قوم کی نفسیات چھپی ہوئی ہے۔

منافقت کہنے کو چھوٹا لفظ ہے بہت جلدی منہ سے پھسل جاتا ہے قلم سے لکھا جاتا ہے مگر سہنے میں بڑا سخت ہے۔ ایک پورے انسان کی معصومیت، اس کا حسن اور اس کی ہنسی چھین لیتا ہے۔ جس انسان کو کسی دوسرے انسان کی منافقت کا سامنا ہوتا ہے وہ انسان بے موت مارا جاتا ہے۔ اسی لئے ہماری قوم پر ایک مردہ دلی، طنز اور بے حسی کی کیفیت ہے۔ ہم سیاست دانوں کو الزام دیتے ہیں۔ ان کا کام ہی مفاد پرستی، منافقت اور لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے۔ مگر کیا ہم نے غور کیا کہ پاکستان کی عام عوام تو چھوڑ، بڑے بڑے دانشور کیا کر رہے ہیں۔۔ سیاست دان کا تو کام ہی سیاست کرنا ہے۔ انہیں کوستے کوستے کتنے مفاد پرست لاکھوں کروڑوں کا فائدہ اٹھا رہے ہیں، عزتیں بٹور رہے ہیں اور بنگلے بنوا رہے ہیں۔۔ سیاست دان کو سب کھڑے ہو کر گالی نکالتے ہیں اور اس کی خود غرضی پر لعنت ملامت کرتے ہیں۔۔ مگر کیا کبھی کسی نے کسی لکھنے والے سے سوال کیا۔ تیرا کیا معیار ہے؟ آپ نے کتنے لوگوں کو بے وقوف بنایا۔۔ عوام اور غریب کی آواز میں اچھا چھے نوحے سنا کر کتنا پیسہ بٹورا۔۔

دانشور کا کام قوم کو سچ دکھانا، دانش سے مالا مال کرنا ہوتا ہے اور ہمارے دانشور، شاعر اور صحافی قوم کو اپنا جھوٹ، منافقت اور مفاد پرستی دانش کے موتیوں کی صورت دے رہے ہیں۔ جن کا کام قوم کے آگے سچ لانے کا ہے، وہ ماشاللہ اتنے بہادر ہیں کہ اپنی ذات کا سچ تک آگے لانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔۔ اپنی سکن کو بچانے کی خاطر وہ کسی کی طرف بھی انگلی اٹھا سکتے ہیں۔۔ سب سے زیادہ نقصان ایک قوم کو اس کے دانشور پہنچا سکتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس بولنے کی، لوگوں کو سمجھنے کی اور لکھنے کی طاقت ہوتی ہے۔ وہ اسی طاقت سے ناکوں چنے چبواتے ہیں، اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ تعریف کرنا ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل اور تنقید کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ تو دو چہروں والے دانشور جب اپنی اسی دانش کے ہیرے موتی بکھیرتے ہیں تو عوام بھی ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور جیسا ایک معاشرے کا ادیب اور لکھاری ہوگا۔ قوم بھی ویسی ہوگی

اور دنیا کہ شائد کسی ملک میں سیاست دانوں کو ان سے بڑھ کر فریبی عوام نہیں ٹکریں ہونگے جتنے ماشاءاللہ ہمارے لکھاریوں کی بدولت ہمارے سیاست دانوں کو ٹکرتے ہیں۔ اگر وہ کمال کے ہیں تو پاکستان کا ہر شہری ان کی ٹکر کا ہے۔ دیہاڑی بنانا، الو بنانا، استعمال کر کے ٹشو کی طرح پھینکنا۔۔۔ یہ ہمارے معاشرے کی عام اصلاحات ہیں۔

روزمرہ استعمال ہونے والے چھوٹے چھوٹے فقرے۔ تو پاکستانی سیاست دانوں کو خوش ہونا چاہیئے، کہ ان کے ملک میں ہر طبقے کے لوگ بڑھ چڑھ کر ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور خوشحال زندگیاں گذار رہے ہیں۔۔ اور جو اس میں مس فٹ ہیں، وہ یا تو خاموش اور گم سم ہو گئے ہیں اور یا ہر وقت غصے میں رہتے ہیں اور ناکامیاب ہیں۔ غیر سرکاری طور پر تو یہ سلیبس ہر جگہ پھیل چکا ہے، اب حکومت کو چاہیئے اپنے دانشوروں کی مدد سے منافقت، مفاد پرستی، دوسروں کو استعمال کرنا، خوشامد، دھوکہ دہی اور جھوٹ کو نصاب کا حصہ بنا دیں۔ تاکہ معیارِ تعلیم ہر جگہ یکساں ہو جائے۔ اور معاشرے میں ناہمواری اور احساسِ کمتری نہ پھیلے۔ پاگل پن اور خاموشی، لوگوں کا مقدر نہ بنیں۔ اور ہم جو سیاست دانوں کو کوستے رہتے ہیں انہیں باقاعدہ طور پر استاد بنا کر دو چیزوں کی تعلیم مکمل کریں۔ اور اس میں اعلیٰ ڈگریاں لیں۔۔ ہم فضول ہی ساری عمر سچ، احسان مندی اور مروت کے سبق یاد کرتے رہے۔

مائیکل جیکسن کو اس کے پرستاروں نے ناچ گا کر خراجِ تحسین پیش کیا، کیونکہ وہ ایک گلوکار تھا اس کی روح کو اسی طرح خوشی مل سکتی تھی۔۔ اور ہمارے سیاست دانوں اور دانشوروں کو خراجِ تحسین اسی صورت دیا جا سکتا ہے جو ہماری قوم دے رہی ہے۔۔۔ جیسا انسان ویسا ہی خراجِ تحسین۔۔۔ جھوٹ، دھوکے اور منافقت میں لتھڑا معاشرہ اصل میں خراجِ تحسین ہے ہمارے راہنماؤں کو اور ہادیوں کو۔ خوش رہیئے!۔۔ اور مسکرائیے!

☆☆☆

عید یوں بھی منائی جاتی ہے

آسٹریلیا سے ڈاکٹر نگہت صاحبہ جو عالمی اخبار کی نائب مدیر اعلیٰ بھی ہیں اور بہت پیاری دوست بھی ہیں بار بار مجھے عید پر لکھنے کا کہہ رہی ہیں۔ وہ جاننا چاہتی ہیں کہ ہم لوگ کینیڈا میں عید کیسے مناتے ہیں۔ ہم جیسے متوسط طبقے اور اوسط دماغ رکھنے والے عید منانے کا کیا انوکھا طریقہ رکھتے ہونگے۔ انوکھا پن تو امراء کے دروازے کی لونڈی اور غریبوں کی قسمت ہے۔ ہم جیسے لوگ تو اوسط ذہنی صلاحیتوں اور اوسط قسمتوں کے ساتھ بے رنگ اور اکتاہٹ کی حد تک ہموار سی زندگیاں اور عیدیں گذارتے ہیں اور عام سی طبعی موت مر جاتے ہیں۔ پاکستان میں ہوں، کینیڈا میں ہوں یا آسٹریلیا میں انوکھا پن تو ملاحظہ ہو ان غرباء کی عید میں جو اسے منانے سے قبل ہی ایسی موت مر گئیں جو شائد ان کا مقدر نہیں تھی۔ وہ رمضان میں پانی اور شائد نمک کے ساتھ روزہ رکھ کر اس جگہ قطار میں لگے مر گئیں جہاں سے انہیں ایک آٹے کی تھیلی، ایک چینی کا لفافہ اور ایک گھی کا ڈبہ ملنا تھا۔ شائد چاول اور سویاں بھی مل جاتیں۔

وہ مخیّر حضرت جو اپنے لئے آخرت کی جنت اور غریبوں کے لئے ایک مہینے تک یا کم از کم پندرہ دن کی ہی سہی روٹی کا سامان بانٹ رہا تھا، اور ان غریب عورتوں کی جھولی کی بدقسمتی تو دیکھو کہ وہ وہاں سے بھی اپنے بچوں کی ایک وقت کی روٹی اور اپنے افطار کا سامان اس میں نہ بھر سکیں۔ مفت کا راشن لینے گئیں اور جھولی میں موت بھر لائیں۔ ہسپتال کے کمرے میں سفید چادروں میں لپٹی، ادھ کھلی آنکھوں والی ان عورتوں کی لاشیں، جو عارضی بھوک منانے والی قطار

میں کھڑی ہوکر ابدی نیند بٹورلائیں۔ اخبار کے صفحے پر اس سے زیادہ موت چھائی میں نے کبھی بھی نہیں دیکھی۔ کھوڑی گارڈن کی ان شہید خواتین کو کیا تمغہ ملے گا سنا ہے ان کے لواحقین کو جو عید پر اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر انہیں یاد کریں گے اور جن کے کلیجے ان کے جسموں سے نکلتے محسوس ہوتے رہیں گے، حکومت نے انہیں ایک ایک لاکھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

چلو جہاں ایک آٹے کا تھیلا مفت لینے گھر کی عورت نکلے اور رات تک گھر والوں کو ایک لاکھ کی خبر مل جائے تو سودا کوئی برا نہیں کیوں کہ بے قیمت موت مرنے سے اس عوام کو کوئی نہیں بچا رہا تو یہ تو پھر باقیمت، بامعاوضہ موت ہے۔ نہ جانے کتنی ماؤں نے اپنا سینہ اس غم سے پیٹ لیا ہوگا کہ وہ اس قطار میں کیوں نہ ماری گئیں۔۔ ان کے بچوں کو ایک لاکھ تو مل جاتا۔۔ یہ ہے انوکھی عید۔۔ یہ ہیں ذکر کے قابل تذکرے۔۔ ناصر کاظمی نے انہی کے لئے تو کہا تھا:

کن لوگوں کے ہیں یہ ڈھانچے
کن ماؤں نے ان کو جنا تھا

پیٹرسن کا کہنا ہے کہ صبر مایوسی کی وہ قسم ہے جسے خوبی کا نام دے دیا گیا ہے۔ تو یہ خوبی ہمارے معاشرے کے ہر فرد میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مایوسی کی انتہا کو پہنچے ہوئے لوگ صابر و شاکر ہیں اپنی تقدیر پر اپنی زندگیوں پر اور اپنی موتوں پر صبر اور بس صبر۔

دوسری طرف کا انوکھا پن دیکھئے۔۔ اس پر بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے، وہاں بھی ہم صابر ہیں۔ وہاں بھی ہمارے منہ سے آواز نہیں نکلے گی۔ ایک طرف جب کراچی کے علاقے میں عورتیں مفت راشن کے چکر میں مر رہی تھیں تو دوسری طرف اینکر پرسنز اور صحافیوں کے اعزاز میں دیے گئے عالی شان افطاری سے خطاب فرماتے ہوئے، ایوان صدر کے اندر موت سے کوسوں دور ہو کر بیٹھے ہوئے، ڈائننگ ٹیبل پر ان لاشوں کے ایندھن سے تیار کردہ کھانوں کی خشبوؤں کو سونگھتے ہوئے۔ ہمارے صدر صاحب فرما رہے تھے کہ :مشرف کو محفوظ راستہ دینے والے ملکی اور بین الاقوامی لوگوں کی میٹنگ میں وہ بھی شامل تھے اور انکی رائے بھی یہی تھی کہ بقول ان کے (مجھے امید ہے

پرویز مشرف گولف کھیلیں گے)۔۔۔۔ ہوں ۔۔۔ یہ ہے ہماری قوم کی عیدوں، شبراتوں کی کہانی ۔روٹی کے لئے لگی لمبی قطاریں ۔اوران پر لکھی موتیں اور دوسری طرف میز پر لگے لمبے کھانے اور ان پر بیٹھے تاتل ۔ یہ ہے کل کہانی۔ پاکستان کی عید کی۔

زرداری صاحب کے اس بیان سے مجھے وہ مردار جانور کی لاش یاد آ گئی جس پر مکھیاں بیٹھی ستا رہی تھیں کہ ایک شخص نے آ کر انہیں اڑا دیا ۔ وہاں پہلے سے موجود ایک اور شخص نے مکھیاں اڑانے والے سے کہا یہ تم نے کیا کیا؟ وہ بولا یہ مکھیاں اس مردہ جانور کو تنگ کر رہی تھیں ،سو میں نے اڑا دیں ۔۔ پہلا شخص بولا ۔نہیں بےوقوف یہ مکھیاں تو اس مردار سے سیر ہو چکی تھیں،ان کا پیٹ بھر چکا تھا ،یہ تو اب اسے کوئی تکلیف دینے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں اب تم نے انہیں اڑا دیا ہے،تو نئی مکھیاں آئیں گی اور نئے سرے سے اس مرے ہوئے جانور کا خون چوسنے لگ جائیں گی ۔تم نے اس جانور پر تکلیف کا ایک اور مرحلہ کھول دیا ہے۔ جب لوگ کہتے ہیں مشرف نہ جاتا تو اچھا ہی تھا ۔۔تو یوں لگتا ہے ٹھیک کہتے ہیں ۔ وہ تو جتنا چوس سکتا تھا چوس گیا ۔۔ نئے تازہ دم جانور ہم نے اپنی غفلت سے اپنی مٹی پر چھوڑ دیے۔ جو کہتے ہیں تم نے اپنی باری لے لی اب ہماری باری ہے۔کون احتساب کرے گا؟ اور کس کا احتساب ہوگا۔بات کرنے کو ایک اچھا موضوع ہے مگر اس کے اندر رکھا کیا ہے؟

اسی لئے تو نواز شریف صاحب بھی فرماتے ہیں کہ ہم مشرف کے احتساب کی بات پارلیمنٹ میں اس لئے نہیں رکھ رہے کہ ناں ہو جائے ۔ حکومت اسے مانے نہ۔۔ یہاں صرف ہنسنے کو دل کرتا ہے یوں لگتا ہے نواز شریف صاحب کسی بیٹی کے باپ ہیں اور رشتہ لڑکے والوں سے مانگتے ہوئے خوفزدہ ہیں کہ انکار کی صورت میں بے عزتی ہو جائے گی ۔ جناب اپنا مدعا سامنے تو لائیں ،دفاعی انداز میں کھیلنے والے کبھی جیت نہیں سکتے ۔جتنی مرضی دیر وکٹ پر بور اور لمبی اننگز کھیلتے رہیں، نہ چھکا لگا سکتے ہیں، نہ چوکا، نہ ٹیم کو فتح دلوا سکتے ہیں اور نہ ڈوبتی کشتی پار لگا سکتے ہیں۔

سکندر اعظم نے کہا تھا میں شیروں کی اس فوج سے خوفزدہ نہیں ہوتا جس کا لیڈر بھیڑ ہو،

مگر میں اس بھیڑوں کی فوج سے خوفزدہ ہوتا ہوں جس کا لیڈر شیر ہو۔۔تو ہمیں اس ملک میں جہاں عید سے چند روز پہلے مفت روٹی لینے کے لئے وہاں کی مائیں، بچیاں مر جائیں، وہاں ہمیں شیر لیڈر چاہیئیں، جو قوم کا درد رکھتے ہوں۔۔ایک موت کا سودا ایک لاکھ میں کر کے عید کی خوشیاں نہ مناتے ہوں۔

مدر ٹریسا کی یہ بات مجھے ہمیشہ ہانٹ کرتی ہے۔۔وہ نیک دل پری کہہ گئی ہے۔۔۔اگر ہمارے پاس امن نہیں رہا تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ بات بھول چکے ہیں کہ ہمارا تعلق ایک دوسرے سے ہے۔اگر صرف یہ ایک خیال ان لیڈروں کے دل کے اندر تک اتر جائے تو یہ نہ تو ناانصافی کر سکیں گے، نہ نفرت، نہ کرپشن، نہ غنڈہ گردی اور نہ قوم سے بے ایمانی۔سلطان کی سلطنت میں کوئی کتا بھی بھوکا نہ رہے۔۔اور بے ایمان کی سلطنت میں کوئی انسان بھی پیٹ بھر کر نہ سوئے۔یہ سماج کا ایک سیدھا سادا سا قانون ہے۔اور ہمارا سماج تو دو قسم کے طبقوں میں بٹ گیا ہے۔۔ظالم اور مظلوم۔ہم نے بے تحاشا بے ایمان اپنے اوپر مسلط کر لئے ہیں اور کوئی ایسا شیر نہیں جو بھیڑوں کی اس فوج کی کمان سنبھال سکے۔سب ایک ہی طرح کے چہروں والے لوگ۔ظالموں کی ایک جیسی شکلیں اور مظلوموں کے بھی ایک جیسے روپ۔دو انتہاؤں کے انوکھے پن کی انوکھی عید۔روٹی کے لئے لگی ہوئی قطار میں بھگدڑ اور روٹی کے ڈھیر پر بیٹھے گدھوں میں مفاہمت۔لکھنے کے قابل تو یہ مناظر ہیں۔

ہم جیسے اوسط زندگی اور موت گذارنے والے۔۔ہم کیا لکھیں کہ عید کیسے منائی جاتی ہے۔۔ہمارے آنکھوں میں عید تو ایک ہی طرح اترتی ہے۔کہیں چوڑیاں، اور کہیں مہندی، چاند راتیں اور عید میلے، سویاں اور شیر خورمے، چم چم کرتے لباس اور عیدی کے نوٹ۔۔کیا لکھا جائے اس پر؟

☆☆☆

ایک تھی شبانہ

وہ ہفتے کی صبح ستمبر 20 کو گھر سے نکلی ہوگی صبح خوبصورت تھی' ہوا میں تازگی تھی مگر اس کی روٹین بہت مشکل تھی' تین تین بچیوں کو کھانا دے کر سکولوں کو رخصت کیا ہوگا۔ انہیں نصیحت کی ہوگی کہ بیٹی دوپٹہ سر سے نہ سرکنے دینا' آنکھ اونچی نہ کرنا' سیدھی گھر واپس آنا۔ میں رات کو لیٹ آؤں گی تم لوگ اپنا دھیان رکھنا اور کھانا آ کر ضرور کھا لینا -- میں نے سبزی بنا کر رکھ دی ہے' کسی بیٹی نے ہاں میں جواب دیا ہوگا' کسی نے ان سنی کر دی ہوگی' کسی نے سوچا ہوگا دیکھا جائے گا۔ بیمار شوہر کو ناشتہ دے کر اس کے لئے لنچ بھی بنا کر رکھ دیا ہوگا۔ اس کی دوائیاں اس کے پلنگ کے کنارے پانی کے گلاس کے ساتھ رکھ دی ہوں گی۔ گھر سے نکلنے والی ہوگی ماں کا فون آیا ہوگا -- اور روز کی طرح اس نے کہا ہوگا میری بچی یہ جاب چھوڑ دے' سکیورٹی کی جاب لڑکیوں کے کرنے کی نہیں تو روز کی طرح اس نے کہا ہوگا ماں میں اب تیری لڑکی نہیں تین تین لڑکیوں کی ماں ہوں - ماں یہ نوکری میری ضرورت ہے' میرا گھر اس کے بغیر چل نہیں سکتا --- تو فکر نہ کر -- زمانہ بدل گیا ہے اور ہمارے حالات بھی بدل جائیں گے تو پھر نوکری چھوڑ دوں گی۔ میرا بھی دل کرتا ہے گھر سکھ سے بیٹھوں میرا بھی دل کرتا ہے سڑکوں پر ذلیل نہ ہوتی پھروں میرا بھی دل کرتا ہے

پلنگ پر بیٹھ کر روٹی کھاؤں پر ماں ابھی حالات بہت برے ہیں۔ ماں نے خاموشی سے فون رکھ دیا ہوگا۔

بوڑھی ماں نے' کمسن لڑکیوں نے' اور بیمار شوہر نے' کسی نے اس صبح جب ہوا لگ رہا تھا تازہ ہے اور روشنی کچھ بہتر تھی۔ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ آج کے بعد اس گھر میں آنے والی نہیں اس کا بنایا ہوا کھانا یونہی پڑا رہ جائے گا کسی آخری نشانی کی طرح' اس کی ماں کے کان اپنی بیٹی کی آخری آواز سن رہے ہیں۔ اس کی بچیاں سکولوں میں بیٹھی سوچ رہی ہوں گی آج ماں جب گھر آئے گی تو یہ بات بتاؤں گی اور یہ بات چھپاؤں گی اور ماں جو روز رات کو پھول لاتی ہے اسے کہوں گی اب گلدان بھی نیا آنے والا ہے۔ بہت سی باتیں ان بچیوں کے دلوں میں ہی رہ گئیں اور شبانہ پھر واپس نہ آئی اسے نہیں پتہ تھا اور نہ اس کی بچیوں کو اس سے غرض ہے کہ یہ جنگ امریکہ کی ہے یا ہماری۔ شبانہ نہیں جانتی تھی کہ طالبان اس کے دوست ہیں یا دشمن۔ اس نے امریکہ میں ہونے والا 9/11 دیکھا تھا' نہ وہ جانتی تھی اور نہ اس کی بچیوں کو خبر تھی کہ اس ایک 9/11 کے عوض ان کے گھر میں ایک 9/11 برپا کر دی جائے گی۔ نہ انہوں نے ٹی وی پر بولتے ہوئے بڑے بڑے مفکروں کو سنا تھا' نہ سیاستدانوں کو نہ انہیں پتہ تھا یا اصول کی جنگ ہے اور نہ انہیں پتہ تھا کہ ہمارے حکمران آدمیوں کا سودا کرتے ہیں۔

شبانہ اور اس کی بچیاں نہیں جانتی تھیں کہ قبائلی علاقوں میں کیا غدر مچا ہوا ہے۔ شبانہ کو کیا معلوم تھا کہ امریکہ کے 9/11 کے مجرموں کی سزا بھگتنا اس کا مقدر ہے۔ اس نے تو کبھی سیاستدانوں کو مذمت کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تو کبھی سیاستدانوں کے جھوٹ بھی محسوس نہیں کیے ہوں گے' اس نے تو کبھی تکراریں اور مباحثے بھی زیر غور نہیں سمجھے ہوں گے۔ وہ تو ایک عام سی' اپنی ہی مشکلوں میں پھنسی ہوئی شبانہ تھی۔ جو میریٹ جیسے بڑے ہوٹل میں چھوٹی سی جاب کرتی ہوئی' اپنے دکھوں کو کم کرتی ہوئی' اپنی بیٹیوں کی حفاظت کرتی ہوئی' اپنے بیمار شوہر کو سنبھالتی ہوئی اس سوچ کے ساتھ چپکے چپکے جئے جا رہی تھی کہ ایک دن وہ اپنے لئے بھی زندہ رہے گی---

اور وہ مر گئی --- اس بم دھماکے میں جو کسی طور کسی طرح اس کے کسی بھی عمل کا عکاس نہیں تھا جو اس کے کسی جرم کی سزا نہیں تھا' جو اس کے کسی عمل کا ردعمل نہیں تھا یہ غریب ملک کے امیر اور عیاش حکمرانوں کا اپنی سیدھی سادی' مصیبتوں کی ماری' پیٹ سے تنگ' زندگی کی دلدل میں پھنسی عوام کو تحفہ تھا۔

امریکہ کے دو فوجی مارے گئے' چیکوسلواکیہ کا سفیر مر گیا اور جو بھی غیر ملکی تھے وہ سب معزز تھے' ان کی گنتی ہے۔ مگر وہ معصوم اور نڈر سکیورٹی گارڈ جو موت کے ٹرک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لوگوں کو تو اس سے پیچھے ہٹاتے رہے اور خود اس آگ کو ناقص انتظامات سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ آگ ہمارے سارے ملک میں پھیل چکی ہے' حکمران ٹولے اپنی اپنی باریاں لیتے رہیں گے' عیاشی کرتے رہیں گے اور یہ معصوم سکیورٹی گارڈ اپنے ہاتھوں میں پتلے پتلے پانی کے پائپ لئے اپنے تئیں اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرتے کرتے زندہ انسانوں سے لاشے بنتے جائیں گے اور ان کو دینے والے کندھے کم پڑ جائیں گے مگر ہمارے حکمرانوں کے جھوٹ اور فریب کم نہیں پڑیں گے اور ان معصوم جانوں کی موت جو موقع سے بھاگے نہیں' بلکہ حالات پر بہادری اور فرض شناسی سے قابو پانے کی کوشش کرتے رہے ایمانداری سے اپنی جاب کیسے کی جاتی ہے؟ ڈٹ کر، جواں مردی سے کیسے مقابلہ کیا جاتا ہے؟ موت کو بڑھ کر کیسے بہادری سے گلے لگایا جاتا ہے؟' آگ سے کیسے لوگوں کو نکالا جاتا ہے؟ اپنے لئے موت اور لوگوں کے لئے زندگی کا پیغام کیسے بنا جاتا ہے؟

کاش ہمارے حکمران ان سکیورٹی گارڈز سے ہی کچھ سیکھ لیں۔ میرے نزدیک شبانہ اور یہ سکیورٹی گارڈ اتنے ہی قابل تحسین ہیں اور ان کی موت اتنا ہی بڑا سانحہ ہے جو کسی بھی لیڈر کی موت ہو سکتی ہے۔ ان معصوم جانوں نے جیسے فرض کی راہ میں جان دی ہے کوئی لیڈر کیا دیتا ہوگا؟ جیسی معصومیت سے انہوں نے لوگوں کو آگ سے بچانے کی کوشش کی ہے کوئی لیڈر کیا کرتا ہوگا۔ میرے بس میں ہو تو شبانہ کے نام کی ایک سڑک بنا دوں' ایک ان سکیورٹی گارڈز کے نام کی بنا

دوں جن کی بہادری دیکھ کر اور فرض شناسی دیکھ کر میں ایسے ہی حیران ہوں جیسے ڈاکو باپ کے گھر سچا سپاہی پیدا ہو جائے۔

شاید اس وقت سڑکوں کے نام تبدیل کرنے کی بجائے مسئلے کا حل ڈھونڈنے کا وقت ہے۔ پنجاب میں سلمان تاثیر جیسے کو اپنا شو ختم کرنے کا حکم دینے کا وقت ہے۔ دہشت گردی کی جنگ کس کی ہے اور کس کی نہیں؟ اس بحث کو چھوڑ کر اس پر بات کرنے کی ضرورت ہے کہ اس جنگ کو اب کنٹرول کیسے کیا جائے؟ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنا چھوڑ کر ایک دوسرے کے بازو بن کر چلنے کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ شبانہ اور اس جیسے کتنے لوگ ان کی روحیں ہمارا پیچھا کرتی رہیں گی۔ ان کے رلتے کھپتے والے بچوں کو ہم نہیں پال سکتے' ہم ان کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ شبانہ کی بچیوں کو ایک دن ان کے ماں کے جیسے پھول تک نہیں لا کر دے سکتے۔ شبانہ کی بچیاں پوچھتی ہیں ہائے اللہ اس قدر بے بسی سے پوچھتی ہیں کہ سینہ کوٹنے کو دل کرتا ہے- ہائے ماتم کرنے کو دل کرتا ہے- وہ بھولی بھولی بچیاں پوچھتی ہیں---ہم کس کو کہیں؟ ہم کس سے پوچھیں---؟

لاقانونیت اور جنگل کا قانون کیا ہوتا ہوگا جو یہ سب ہو رہا ہے کون ذمہ دار ہے یہ تک نہیں پتہ کس کو کوسا دیں اس کی بھی خبر نہیں--- بددعاؤں میں کس کا نام لیں' یہ بھی معلوم نہیں۔ کس کے گریبان پر ہاتھ ڈالیں کیا پتہ؟ ایسے بے خبری کا' اندھیرے کا اور موت کا موسم تو کبھی نہیں ٹھہرا تھا میرے وطن میں میرے بزرگوں نے تو ایک خوبصورت باغ کی بنیاد رکھی تھی' اپنے ہاتھوں سے خوشبو اور ہوا دینے والے درخت لگائے تھے۔ یہ اتنا گہرا' اتنا اندھیرا جنگل کس نے بنا ڈالا کون ذمہ دار ہے؟ کس سے پوچھیں؟ کس کا ماتم کریں؟

جہالت کے اس اندھیرے میں اگر کوئی کھرا اور سچا صحافی لوگوں کو آگاہی کی روشنی دینے کی کوشش کرتا ہے تو اسے باغی یا ملک دشمن قرار دے دیا جاتا ہے' حکومت کی کھسیانی بلی سچے اور باشعور صحافیوں کو نوچنے لگتی ہے- آج میرے اسلام آباد میں تاریخ کا بدترین دھماکہ ہوا ہے

پاکستان کا 20 ستمبر ہوا ہے اور ہمارے مشیر وزیر داخلہ صاحب فرماتے ہیں کہ صحافی اور ہلہ شیری دیں ان مجاہدین کو جیسے کہ ان صحافیوں کے ہاتھوں میں سب کچھ ہے جیسے ان کے شو دیکھ کر دشمن پاکستان کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔

اپنی ذمہ داری قبول کریں۔ اپنے ہاتھ بازو ہلائیں' اپنے فرض کو شبانہ اور اس کے دوسرے سکیورٹی گارڈ بھائیوں کی طرح نبھائیں اپنے ہاتھ سے گرے ہوئے کپ کو یہ کہہ کر نہ ٹال جائیں کہ ساتھ چلتا شخص اسے کندھا مار کر گرا گیا ہے۔ کپ آپ کے ہاتھوں کی لرزش سے گرا ہے اس کی ذمہ داری آپ قبول کریں' اگلی دفعہ ایسا نہ ہو اس کی یقین دہانی کریں ساتھ چلتے شخص نے تو کپ آپ کے ہاتھ سے گرتے دیکھا اور ایسے ہی بغیر لگائی بجھائی کے پوچھنے والے کو' سننے والے کو بتا دیا آپ اس شخص کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے کی کوشش کرنے کی بجائے' اپنے ہاتھ مضبوط کریں- اس پر کپ گرنے کی ذمہ داری ڈالنے کی بجائے اپنی غلطی سر جھکا کر تسلیم کریں' لوگوں سے معافی مانگیں اور پھر اگلی مرتبہ کپ نہ چھلکے اس کی تدبیر کریں- دیکھنے والا شاید وہی رپورٹ کرے گا جو وہ دیکھے گا- لوگوں کو اچھا سنانا ہے تو اچھا کریں بھی کیونکہ ہر مال بکاؤ بھی نہیں ہوتا پیسہ اور عہدہ جتنے بھی طاقتور کیوں نہ ہوں کچھ سرپھروں کی اپنے وطن سے محبت ان سب چیزوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ شبانہ اور اس جیسے دوسرے معصوم لوگوں کی موت سے معافی کہ یہاں کا حق نہیں تھا یا اس ملک سے ان کا حصہ بھی نہیں تھا اور ان شہیدوں کے' غریبوں کے' بچے اس چیز کے مستحق بھی نہیں تھے۔ روٹی نہ دو' چھت نہ دو اور کپڑا بھی نہ دو مگر میرے ملک کے امیر حکمرانو میرے ملک کے غریبوں کو زندگی تو دے دو۔

☆☆☆

عمران خان کو ملک بدر کیا جائے

جی ہاں! یہ بات میں پورے ہوش وحواس میں کہہ رہی ہوں۔ پاکستان کے ایک انگریزی اخبار کے سینیر کالمسٹ کا عمران خان کے کرتوتوں پر کالم پڑھ کر چیف جسٹس افتخار چوہدری کو عمران خان کی ملک بدری کا سوموٹو ایکشن لینا چاہیئے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ عمران خان جنرل حمید گل اور اسی طرح کے سابقہ ایس آئی جیسے لوگوں کا تیار شدہ مال ہے۔ اور وہ ایجنسیوں کا بندہ ہے گو ہم اس کالم نویس سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ایجنسیوں کا بندہ ہے اور آج تک تو اسے وزیر اعظم بن جانا چاہئے تھا اور کسی لمحے تو اسے سیاپا ڈالنے سے باز آنا چاہئے۔ مگر یہ کیا وہ تو ہر اس بات پر واویلا بلند کر دیتا ہے جس پر ہم عام پاکستانی جن کا دل ملک کے لئے کوسوں دور بیٹھ کر بھی دھڑکتا ہے۔ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ایک جرم اور۔ عمران خان کی چونکہ انگریزی اور رنگ بھی محترمہ بے نظیر سے ملتا ہوا ہے۔ اس لئے اس کالم نویس کے حساب سے اس جرم عظیم کی معافی تو کہیں نہیں۔۔

محترم کالم نویس فرماتے ہیں کہ عمران خان صاحب صدر اور الطاف بھائی پر ہر وقت پرانے الزامات کی بوچھاڑ کرتے رہتے ہیں اور کوئی نئی بات نہیں کرتے۔ تو یہ بھی جسٹس صاحب دیکھئے کتنا بڑا جرم ہے۔ عمران خان ان اصحاب کے نئے جرائم اور نئی وارداتوں کی بات نہیں کرتا اور

پرانا ڈھول پیٹتا رہتا ہے۔ایسا بندہ جسے تاریخ کی تو خبر ہے مگر حال سے بیگانہ پھرتا ہے، اسے پاکستان جیسے اپ ڈیٹڈ ملک سے نکال باہر مارنا چاہیئے۔عمران خان اپنی اوقات سے باہر نکل جاتا ہے۔ جب ہمارے معززین کرام اسے سمجھاتے ہیں کہ تم صرف جھولی پھیلا پھیلا کر غریبوں کے لئے فنڈز اکھٹے کرو، تو ہم ہرگز ہرگز اپنے خزانوں سے تمھاری جھولی میں چندہ ڈالنے سے گریز نہیں کریں گے، تو کیوں یہ اچھل اچھل کر سیاست اور نظام کو بدلنے کی بات کرتا ہے۔

جس گٹر میں سے اب بو اٹھنے لگ گئی ہے اسے کیا ضرورت ہے اسکی صفائی کے لئے لوگوں کو اکھٹا کرے اور نیندوں سے جگانے کی کوشش کرے۔ اسے اپنی اوقات میں رہنا سکھایا جائے ورنہ اس ملک سے ہی باہر کر دیا جائے صرف چندہ مانگنے تک محدود رہے۔ جناب یہ شخص جھوٹ تک تو بولنا نہیں جانتا، منافقت اس میں سیاست دان کی حد تک تو دور کی بات ایک عام سے بیورکریٹ جتنی بھی نہیں، سیاسی کیا پاکستان کی صحافتی زندگی میں رہنے کے قابل نہیں یہ شخص ۔۔جھوٹ کے بغیر سیاست؟ کیا اسے یہ سمجھ نہیں کہ بنیادی علم کے بغیر کسی بھی شعبے میں کوئی نہیں گھس سکتا۔کیا ڈاکٹر ایم بی بی ایس کی ڈگری کے بغیر پریکٹس کر سکتے ہیں تو یہ جھوٹ کے فن کے بغیر اس میدان میں؟ یہ کم عقل اس ملک میں رہنے کے قابل نہیں۔

عمران خان لوٹوں سے جا جا کر ملتا ہے، پارلیمنٹ کا کوئی کونا ایسا ہے جہاں کوئی لوٹا نہیں ہے؟ تو وہ اکیلا ہاتھ کھڑے کر کر کے لوگ اکھٹے کرتا ہے۔لوگ کہتے ہیں کوئی مشہور شخصیت اس کے ساتھ نہیں وہ پھر مشہور شخصیت کی طرف بھاگتا ہے۔اور ہر مشہور شخصیت لوٹا ہے۔۔تو سارے ملک میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔۔اس سے پرامن پاکستان کا اور خاص کر کراچی کا حسن اور امن برباد ہوتا ہے۔اگر ہر طرف لوٹے ہیں تو ملک چھوڑ جائے۔اسے خود سمجھ نہیں آتی کہ اس کا یہاں کوئی کام نہیں۔؟

اس کی ذات پر پلے بوائے کی چھاپ بہت مشہور ہے۔تو کیا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سیاست میں ایسے کسی بھی شخص کا کوئی کردار ہے۔نہیں ہے۔۔تو یہ بات سو فی صدی طے ہے

۔اسی لئے تو اسے ہر ٹاک شو میں اپنی معاشی، سیاسی اور سماجی کرپشن کے سوالوں کے جواب میں ہر سیاست دان اسی موڑ پر چپ کروانے کی کوشش کرتا ہے اسے سمجھنا چاہیئے کہ اتنے صاف ستھرے لوگوں کی موجودگی میں اس کا وجود کیسے برداشت ہو۔اگر سب پارلیمینٹیرین اتنے باکردار نہ ہوتے تو پارلیمنٹ ہاؤس خالی نہ پڑا ہوتا۔

انسان اتنا بھی منہ پھٹ نہ ہو کہ ہر بات یوں کہہ دے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔۔سرائے محل، ہیرے کی عینک اور قاتلوں کے نام۔۔اسلام تو پردہ ڈالنا سکھاتا ہے اپنے عیبوں پر بھی اور دوسرے کے بھی۔تو یہ کیسا گنوار ہے جو سب سے پہلے یہ مانتا ہے کہ ہاں میں اچھا مسلمان نہیں تھا، میں نے بہت برے کام کئے اور پھر توبہ کر لی۔۔اتنا سچ۔۔؟اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اتنا زیادہ سچ کون سنتا ہے۔ٹھیک ہے اپنے اپنے کپڑے چوک میں رکھ کر دھوئیں مگر یہ کیا آپ تو دوسروں کے کپڑے اتار اتار کر چوک میں یوں دھونے لگتے ہیں جیسے دھوبی گھاٹ آپ کی میراث ہو اور آپ کے اباؤ اجداد دھوبی رہے ہوں۔۔اتنی صفائی کی ضرورت کیا ہے، منہ بند کر کے بیٹھ جائے، اتنے سالوں سے چیخ چیخ کر یہ بات پتہ نہیں چلی کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا۔تو جج صاحب ایسے کند ذہن آدمی کو پاکستان کی ذہین سیاست اور سیاست دانوں میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔پوری یکسانیت کو خراب کرنے کا باعث یہ شخص کسی معافی کے قابل نہیں۔

پھر سونے پر سہاگہ، لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں،کہ بابر غوری کی شکل کے دس بچے افریقہ سے دکھا دوں، کیونکہ بچارے بابر صاحب نے انہیں ٹاک شو میں صرف اتنا ہی تو کہا تھا کہ یہ دیکھو بچی کی شکل تم سے کتنی ملتی ہے۔تو اس انسان میں ذرا بھی صبر نہیں، انسان خاموش رہتا ہے،ایک سینیئر سیاست دان آپ کو جب کہہ رہا ہے کہ بچی کی شکل تم سے ملتی ہے تو مان جاؤ۔یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ افریقہ میں تمھارے جیسے دس بچے میں نکال دوں۔یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔آپ کا کام سیاست کرنا تو ہے نہیں، آپ تو بس جھولی پھیلائیں اور غریبوں کی خدمت کریں۔ان بچارے سیاست دانوں نے تو کتنا کام کرنا ہوتا ہے۔آپ کی طرح فارغ

تھوڑی ہیں ۔ جن غریبوں کی آپ مدد کرنے کا سوچتے ہیں اور انہیں جگانے کی بات کرتے ہیں، آپ ان سے دشمنی کرتے ہیں، بے آرام کرتے ہیں ۔ ارے حضور انہیں سونے دیجئے ۔ ۔ کیوں جگاتے ہیں ۔ سیاست دان اتنی محنت سے انہیں لوری دیتے ہیں ۔ آپ کی ایک فضول سی بات اور چنگھاڑ بلا وجہ ان کی نیند میں خلل کا باعث بنتی ہے ۔ کچھ تو عقل کیجئے آپ فارغ بیٹھے ہیں باقیوں کو تو کام کرنے دیں، دولت اکٹھی کرنی، انہیں سوئس بنکوں میں پہنچانا، ورنہ سوئس بنکوں کا کام کیسے چلے ، آپ تو سوچتے ہیں صرف اپنی اور اپنے ملک کی ، ان بیچاروں کو انٹرنیشنل فکریں کھائی جا رہی ہیں، باہر کے بنکوں کا کام ان کی لوٹی کھسوٹی دولت کے بغیر کیسے چلے گا ۔ سوجج صاحب اس خود غرض انسان کو فوراً اس ملک سے باہر کیا جائے ۔

اب دیکھو ذرا شاہد آفریدی پر بال ٹیمپرنگ کا الزام لگا، اس نے فوراً معافی مانگ لی ۔ عظمت ہے نا؟ ۔ ۔ اور یہ محترم، جب آئین بوتھم اور ایلن لیمب نے انگلستان میں ان پر یہی الزام لگایا تو یہ آگ بگولہ ہو گئے ۔ انہیں عدالت میں کھینچ کر لے گئے اور اوپر سے اتفاق یہ کہ کیس جیت بھی گئے ۔ اتنی عزت نفس ۔ ۔ ؟ ارے بھائی اگر یہی سب کرنا ہے تو پاکستان کی جان چھوڑو، یہاں اس کا کیا کام؟ ۔ ۔ دیکھتے نہیں کیسے شاہد آفریدی نے معافی مانگی ہے ۔ تمھیں کسی نے معافی مانگنا، جھکنا، ذلیل ہونا نہیں سکھایا ۔ تو جج صاحب ایسے بدتمیز، اکڑفوں اور دھن کے پکے انسان کو عاجز اور مسکین لوگوں میں رہنے کا کوئی حق نہیں ۔

اچھا پھر ایک اور بات آئی پی ایل نے بلا کر ہماری ٹیم کو ذلیل کیا، ہم گئے تو ذلیل ہوئے نا ۔ ۔ اور اس شخص میں جس کا نام عمران خان ہے ذرا برابر بھی ہمت یا بہادری نہیں ہے، اب پھر اکڑ کر بیٹھ گیا ہے، اور کہتا ہے کہ اب انڈیا کے خلاف کبھی نہیں کھیلنا چاہئے ۔ اس کے پاس فضول سا عزتِ نفس کا غبارہ ہے جسے پھلائے پھرتا ہے، بہادری سے بے عزتی برداشت کرنا آتا ہی نہیں ۔ ۔ بے عزتی کروا کہ آصف زرداری کی طرح خوبصورت مسکراہٹ چہرے پر سجانا آتا ہی نہیں ۔ بالکل ہی بودا ہے نہ ہنسنا آتا ہے نہ بات کرنی آتی ہے ۔ تو جج صاحب ایسے بدصورت شخص کو

خوبصورت مسکراہٹوں والے ملک میں رہنے کا کوئی حق ہے؟

عالمی سطح پر محبت کی بات کرنا تو اسے آتا ہی نہیں، ہر وقت ہاتھی پڑنے کو تیار۔۔محب وطنی کی ہر وقت فکر، ملک کا نام اونچا ہو۔۔اس کی فکر۔۔۔ہے کوئی سرپھرا۔۔ارے انڈیا نے ذلیل کیا تو کیا ہوا۔ بھائی ہے ہمارا، خوش ہو لے ہم اپنی دوستی میں قائم ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت ہے ان کے خلاف دل میں بغض رکھ کر ورلڈ کپ کو جیتنے کی۔ یہ شخص ہر بار، ہر بے عزتی کو دل سے لگا کر اس سے کچھ انقلابی کام کرنے یا کروانے کی کوشش کرتا ہے، اب دیکھیں ذرا۔ فرماتے ہیں کہ ای پی ایل کی بے عزتی کو بھولیں نہ اور ورلڈ کپ کو جیتیں۔ اور جیت کر دنیا کو دکھائیں کہ ہم نمبر ون کرکٹر ہیں۔۔توبہ! سکون، مستی تو ہے ہی نہیں نہ۔ ارے دفعہ مارو انہوں نے بے عزت کیا ہے تو یہ کون سی نئی بات ہے۔ ہر لیول پر ہمارے ساتھ یہی ہو رہا ہے، جب صدر صاحب کشکول پکڑ کر ہنستے مسکراتے کبھی نہیں گھبرائے، بجلی پانی، گیس سب غائب کر کے ہمارے وزیروں کی بحثوں میں کوئی فرق نہیں پڑا، سرعام لوگوں کو گولیوں سے بھون کے ہمارے ماتھوں پر شکن نہیں آتی تو۔۔ایک کھلاڑی کو اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھا نہیں وہ کس شان وشوکت اور ہمت سے آسٹریلیا سے ہار رہے ہیں، ہے کوئی ان جیسا مستقل مزاج، اور پھر بال ٹیمپرنگ پر شاہد کی معافی۔۔

کسی کو ضرورت نہیں آپ کے اقوال اور آدرش کے پیچھے زندگی گنوانے کی توجہ صاحب اس شخص کا، جس کا نام عمران خان ہے۔ جس نے ہماری قوم کو ورلڈ کپ، کینسر ہسپتال، نمل کالج اور سیاست میں جوابدہ ہونے کی، یہ چند گری پڑی، ناقابل بیان چیزیں دی ہیں۔ اور اسکے برعکس جو چیزیں قابل بیان ہیں، ایک لڑکی کی اس سے ملتی جلتی تصویر، دوسروں کی کرپشن کا کھلے بندوں ذکر کرنا، ملک کے غریبوں کو جہالت سے نکال کر دنیا میں آگے لے کر جانا، عزت نفس اور خودی کی دہائی، لوگوں میں ذرائع کی مساوی تقسیم پر بات، بین الاقوامی سطح پر پاکستان کو منوانے کی بات، اسلام کا جو تصور بگڑ چکا ہے، غیروں کے سامنے اسے ٹھیک طرح لانے کی جدوجہد۔ ہمارے نیچے، نیک اور باکردار سیاست دانوں پر بلاوجہ کیچڑ اچھالنا اور جناب عالی سب سے بڑھ کر ملک میں

امن اور انصاف کی بات کرنا، ان سب باتوں سے ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ شخص طالبان سے ملا ہوا ہے اور ملک کی سکیورٹی کو اس سے خطرہ لاحق ہے۔۔ ایسے موذی انسان کو اس شریف، پر امن، معتدل اور بہادر ملک سے باہر پھینک دینا چاہیے، اتنی دور کہ جہاں سے اس کے سانسوں کی آواز بھی کسی شریف کان کو متاثر نہ کر سکے۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی انقلابی باتوں کی بو کسی حساس اور معزز ناک کو تنگ نہ کرے۔

صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب آپ سب متوجہ ہوں، اس ناسور سے چھٹکارہ پائیں، ورنہ یہ بدکردار شخص آپ جیسے باکردار اور عظیم لوگوں کے لئے بلاوجہ ایک دردِ سر بنا رہے گا۔۔ کیونکہ اس شخص کا کوئی حال نہیں اور یہ ہر ایک کا حال خراب کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے دوپٹے میں ایک نمایاں سا دھبہ، ایک مختلف رنگ کا چھینٹا۔۔ الامان الحفیظ۔

روبینہ فیصل بے شک پاکستان سے باہر ہے لیکن اُس کی روح یہیں کہیں پاکستان میں بھٹکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے وہ اپنی تحریروں میں سماج میں جا بجا بکھری ناانصافیوں، ناہمواریوں اور عدم انصاف کا نا صرف احاطہ کرتی ہے بلکہ اُن پر کڑھتی اور بہتری کی امید رکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ پاکستان سے باہر ضرور ہے لیکن اُس کی تحریریں پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کے اندر پاکستانیت، ہم پاکستان میں موجود لوگوں سے کہیں زیادہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ روبینہ فیصل کی تحریروں سے ایک تاثر یہ بھی اُبھرتا ہے کہ اُسے بال کی کھال اُتارنا بھی خوب آتا ہے لیکن اس عمل کے دوران اُس کا رویہ منفی نہیں، مثبت ہوتا ہے وہ تنقید کم اور اجاگر زیادہ کرتی ہے۔

میاں غفار

ایگزیکٹو ایڈیٹر

دنیا نیوز ٹی وی چینل لاہور

روبینہ فیصل کے کالموں میں زندگی کے وہ تلخ حقائق ہیں جن سے ہم عموماً نظریں چراتے ہیں۔ یہ کالم نہیں کہانیاں ہیں ان جیتے جاگتے کرداروں کی جو ہمارے گردو پیش میں موجود ہیں۔ ان کالموں میں آہیں و سسکیاں ہیں، دکھ اور کرب ہیں۔ ججوں، جرنیلوں، سیاستدانوں، وڈیروں، صنعتکاروں، مولویوں اور صحافیوں سمیت اشرافیہ کا وہ دوہرا کردار ہے جس نے اس ملک کو مسائل سے دوچار کیا۔ روبینہ فیصل سچ کہنے کا ہنر جانتی ہیں۔ انہوں نے انتہائی جرات کے ساتھ وہ سب کچھ بھی تحریر کر دیا جسے نوکِ قلم پر لانے کا عموماً ہمارے کالم نگاروں کو حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ ان کا اندازِ تحریر خوبصورت اور رواں دواں ہے۔ وہ روایتی کالم نگاروں کی طرح محض جذباتی جملوں کے ذریعے قاری پر اثر انداز ہونے یا خواہش کو خبر بنانے کی بجائے حقائق کی روشنی میں صورتحال کا تجزیہ کرتی ہیں۔ وہ تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھتی ہیں اور پھر فیصلہ قاری پر ہی چھوڑ دیتی ہیں۔ یہی ان کے کالموں کی وہ خوبی ہے جو انہیں ہم عصر کالم نگاروں سے منفرد بناتی ہے۔

رضی الدین رضی

شاعر و کالم نگار (ملتان)

ISBN 978-969-9500-00-8

غمگسار پبلی کیشنز

دیدہ زیب، خوبصورت اور معیاری کتاب چھپوانے کیلئے رابطہ کریں

+92-333-5835335